



مولانا عبید اللہ سندھی

حیات و کارنامے

مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی

تلخیص

زیر نگرانی

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

صدر شعبہ سنی دینیات

پیش کردہ

سید محمد احمد

ڈپارٹمنٹ آف سنی تھیالوجی

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۰۰۳ء

ابتدائیہ

علمی دنیا ممتاز شخصیتوں اور ایسے وسیع النظر اور متبحر عالموں سے کبھی خالی نہیں رہی جو انسانی بلندی کے اعلیٰ معیار پر پورے نہ اترتے ہوں اور جنہوں نے دنیا میں نفاذ خیر و عدل، ترویج اقتدار آدمیت اور حقوق انسانی کی سر بلندی اور سرفرازی کی خاطر آزمائش کے ہر مرحلہ پر اپنے فریضہ کی ادائیگی میں نمایاں خدمات انجام نہ دی ہوں۔ عالمانہ حیثیت کے علاوہ ان میں ایسے مجاہدین بھی تھے جنہوں نے جنگ آزادی میں مجاہدانہ اور سرفروشانہ حصہ بھی لیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی بھی ہماری قومی، ملکی اور علمی و عملی تاریخ کی انہی عظیم و بلند پایہ شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے شاگرد اور تربیت یافتہ جنہوں نے وطن کے عشق اور ملت اسلامیہ کی سر بلندی کے لیے وطن عزیز میں اقامت کی زندگی کے عیش و راحت کے مقابلہ میں غربت اور جلا وطنی کی چوبیس سالہ زندگی کو قبول کیا تھا۔ اور اس زندگی میں ہر طرح کے آلام و مصائب کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا۔ جدوجہد سے بھرپور جس زندگی کو انہوں نے اپنے لیے پسند کیا تھا اس میں مصائب اور تکالیف کا آنا ایک قدرتی بات تھی۔ لیکن جس طرح کی تکالیف انہوں نے اٹھائیں وہ شاید کم ہی افراد کے حصے میں آئی ہوں۔

سیاست کی بہت سی خطرناک منزلوں اور پر پیچ راستوں کو انھوں نے عزم اور حوصلہ کے ساتھ طے کیا تھا۔ انفرادی طور پر جدوجہد سے بھرپور زندگی گزاری۔ ذاتی مصلحت کا تصور بھی ان کے ذہن میں کبھی نہیں آیا تھا۔ وہ آخری دم تک میدان جہاد میں کھڑے رہے۔ وہ ایک انقلابی اور دوسروں کو انقلاب آشنا کر دینے والی شخصیت تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی جنگ آزادی کے سورما اور انقلابی رہنما کے پہلو بہ پہلو بلند پایہ عالم دین، مفسر قرآن اور اپنے وقت میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے معاشی و سیاسی نظریات کے سب سے بڑے شارح اور

محقق تھے۔ انہوں نے ولی اللہی تحریک کے لیے فکری و نظریاتی کام کیا۔ اور معروضی حالات میں اس تحریک کو عام کرنے میں جاں نسیب محنت بھی کی۔

وہ مسلمانوں کی انفرادی زندگی کی اصلاح، فکر کی تربیت، اخلاق کی تہذیب، سیرت کی تشکیل اور اجتماعی قومی زندگی کی تنظیم سے لیکر متحدہ انسانیت کے قیام تک کے لیے ایک جامع فکر کی حامل شخصیت تھے۔ ان کی مسلسل کوشش رہی کہ ان مضمل صلاحیتوں کو جن میں حوادث زمانہ نے آرزو کی بے نیشتی پیدا کر دی تھی۔ ایک نئے معاشرہ کی تعمیر میں لگا سکیں۔

مولانا کی حیثیت ایک فرد کی نہیں ایک جماعت کی تھی اور انہوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دئے جو بعض اوقات انسانوں کا ایک گروہ بھی انجام دینے سے قاصر رہتا ہے۔ ان کے انقلابی افکار میں ملک کی تعمیر و ترقی، قومی حکومت کے قیام، معاشی، اقتصادی، مذہبی اور فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لیے اپنے وقت کی بڑی رہنمائی پوشیدہ ہے۔

ہندوستان کو آزاد کرانے اور اس کی آزادی کے نتیجہ میں ممالک اسلامیہ کی آزادی کی سبیل پیدا کرنے کے علاوہ ان کے دل میں اپنے اسلاف و بزرگوں اور بالخصوص اپنے استاد اور مربی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے اتباع اور اطاعت کا جذبہ کام کر رہا تھا۔

مولانا سندھی کی حیات اور جدوجہد کا اگر تجزیہ کیا جائے تو وہ تین ادوار پر مشتمل نظر آئے گی: پہلا دور دارالعلوم دیوبند میں طالب علم کی علمی سے شروع ہوا کہ ہندوستان میں قیام تک منتہی ہو جاتا ہے۔ دوسرا دور شیخ الہند کے ایماء پر افغانستان کے لیے روانگی سے شروع ہوتا ہے اور قیام حجاز پر ختم ہو جاتا ہے۔ تیسرا دور آخری دور ہے جو ایک عرصہ دراز کی جلاوطنی کے بعد ورود ہندوستان سے شروع ہوتا ہے اور مولانا کی زندگی کے ساتھ وہ بھی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔

مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر راقم السطور نے اپنا مقالہ تیرہ ابواب پر منقسم کیا ہے جس کا مختصر تعارف مندرجہ ذیل ہے:

باب اول تشکیلی ایام

اس باب میں مولانا سندھی (خاندانی نام بوٹا سنگھ) کے ابتدائی حالات اس وقت کے ماحول کے پس منظر میں بیان کئے گئے ہیں وہ ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئے لیکن یہ رکی مذہب ان کو مطمئن نہیں کر سکا۔ غور و فکر کا مادہ ان میں ابتداء ہی سے تھا۔ جس علاقہ میں ان کا بچپن گزرا وہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا لوگ مذہبی تھے تصوف کا چلن عام تھا۔

عبید اللہ کے قبول اسلام میں ان کی بے چین روح کے علاوہ اس دور کے پنجاب کی مخصوص روحانی صورتحال نے بھی نمایاں کردار ادا کیا تھا جو ہندوؤں میں چلنے والی اصلاح مذہب اور اصلاح معاشرت و رسوم کی تحریکوں کی وجہ سے وجود پذیر ہوئی تھی۔ اپنے کچھ ہندو دوستوں کی مدد سے ان کی رسائی اسلامی کتابوں تک ہوئی۔ جن کے مطالعہ نے ان کے دل میں اسلام کی شمع روشن کی۔ قبول اسلام کے لیے انہوں نے گھر چھوڑ دیا اور مختلف مدرسوں اور خانقاہوں میں رہ کر عربی و مذہبی تعلیم حاصل کی اور محمد صدیق بھرچوٹھی والے کے ہاتھ پر مسلمان بھی ہوئے اور بیعت بھی کی۔

باب دوم

دلیو بند

کسی بھی معاشرہ میں تعلیمی، سماجی اور اقتصادی ترقی راست سیاسی استحکام پر منحصر ہوتی ہے۔ اور جب کوئی قوم اپنا سیاسی اقتدار کھو بیٹھتی ہے تو سیاسی زوال کے بعد اس پر تہذیبی زوال آتا ہے۔ اس وقت تعلیم کی ضرورت شدید سے شدید تر محسوس کی جاتی ہے۔ کیونکہ اسی کے ذریعہ قومی روایات اور خصوصیات کا احترام باقی رکھا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمان جب زوال سے دوچار ہوئے تو وہ شیرازے جو سخت محنت اور توجہ سے استوار کئے گئے تھے رفتہ رفتہ درہم برہم ہو گئے اور مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی بنیاد تیزی سے بدلنے لگی۔

مسلمانوں کو پستی اور زوال کی حالت سے نکال کر انہیں ترقی کی راہ پر ڈالنے کے لیے مسلمانوں کی اپنی کوششوں سے انیسویں صدی میں جو ادارے وجود میں آئے دارالعلوم دیوبند ان میں سے ایک ہے۔ یہ ایک ایسا ادارہ تھا جس نے دینی علوم کی تعلیم، ترویج و اشاعت کے پہلو بہ پہلو برطانوی ہندوستان میں مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی تحریکوں کے فروغ میں حصہ لیا۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کے علم و فضل کی شناخت بنا۔

روز اول ہی سے مدرسہ دیوبند نے دو مقاصد پیش نظر رکھے۔ اول اسلامی تعلیمات کی اشاعت دوم انگریزوں کے خلاف جذبہ جہاد کو جاری رکھنا۔

اپنے قیام کے بعد سے ہی مدرسہ دیوبند نے یوماً فیوماً ترقی کی۔ کیوں کہ مسلمانوں کا متوسط طبقہ جس میں مذہبی جوش زیادہ تھا انگریزی تعلیم سے متنفر تھا یہ طبقہ دیوبند اور دوسرے عربی مدارس کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ اس مدرسہ کی ایک اہم خوبی یہ تھی کہ اس نے خود کو سرکاری نفوذ سے آزاد رکھنے کی بھرپور سعی کی اور اسی بنا پر حریت فکر و عمل کی روایات اساتذہ سے شاگردوں کو منتقل ہوتی رہیں۔ مدرسہ کے طلباء پر سب سے زیادہ اثر شیخ الہند مولانا محمود حسن کا تھا جو مدرسہ کی صدارت پر ۴۰ سال فائز رہے۔ تدریس اور اہتمام پر ان کی شخصیت حاوی رہی۔ مدرسہ کی تین نسلیں انہی کی شاگرد تھیں۔ مولانا محمود حسن اپنے جن تلامذہ میں صلاحیتیں پاتے تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی تربیت بھی کرتے جاتے۔

نومسلم عبید اللہ صفر ۱۳۰۶ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور مختلف اساتذہ سے کتب درسیہ کی تعلیم کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد حضرت شیخ الہند کے حلقہ درس میں داخل ہوئے۔ حضرت شیخ الہند نے طریقہ مطالعہ، حصول علم اور ملک کی سیاست میں ان کی رہنمائی اس انداز سے کی کہ شاگرد کو اپنی ذات کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ ہوئی۔

باب سوم

سندھ کی طرف مراجعت

مولانا سندھی کو سندھ سے جذباتی وابستگی تھی۔ اس لیے وہ تحصیل علم کے بعد دیوبند سے سیدھے اپنے مرشد محمد صدیق سے ملنے بھرچونڈی چلے گئے مگر وہ ان کے پہونچنے سے دس دن قبل ہی انتقال کر گئے تھے۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کے دو خلفاء نے عبید اللہ کی کفالت کی ذمہ داری لی۔ اور ان کے لیے تمام وسائل مہیا کئے۔ مولانا نے امرت کو اپنا مرکز بنا کر اپنی علمی و عملی زندگی کا آغاز کیا۔ سندھی مسلمانوں میں ذہنی

بیداری پیدا کرنے کے لیے انہوں نے پریس کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ایک رسالہ ہدایت الاخوان کے نام سے جاری کیا۔ جس نے سندھی مسلم عوام پر ایک گہرا اور دیر پا اثر چھوڑا۔

سندھ میں ولی اللہی تحریک و سلسلہ کے فروغ کے لیے ضرورت اس امر کی تھی کہ پہلے ایک مدرسہ قائم کر کے ہم فکر علماء پیدا کئے جائیں جس کے بعد ہی آئندہ سیاسی یا مذہبی کام کی نشوونما کا فروغ ممکن تھا۔ اس کے لیے انہوں نے امرٹ میں ایک مدرسہ کی بنا ڈالی۔

ان کے مرشد مولانا محمود امرٹ کا خیال تھا کہ اشغال طریقت کی تکمیل کے بعد وہ انہیں خرقہ خلافت سے سرفراز کریں گے۔ مگر مولانا سندھی کی انقلاب پسند طبیعت کو سلوک و طریقت سے کچھ زیادہ مناسبت نہ تھی۔ مولانا سندھی کے مطابق ان کا ذوق سراسر سیاسی و عملی تھا اور ان کے لیے دوسرے کاموں کی زیادہ اہمیت تھی۔ اس لیے مولانا محمود امرٹ سے طریقہ کار کے سلسلہ میں اختلاف ہوا اور وہ امرٹ چھوڑ کر پیر جھنڈا چلے گئے جہاں راشد یہ طریقہ کے پیر طریقت کے تعاون سے نئے خطوط پر ایک جدید درگاہ کی بنیاد ڈالی۔ وہ دس سال تک دارالارشاد سے وابستہ رہے اور بعدہ شیخ الہند کی طلب پر دیوبند چلے گئے۔

باب چہارم

جمیۃ الانصار و نظارۃ المعارف

شیخ الہند کی طلب پر مولانا عبید اللہ سندھ سے دیوبند منتقل ہو گئے اور حضرت شیخ کی ہدایت پر انہوں نے دارالعلوم کے بنائے قدیم کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور ان کی تربیت و تعلیم میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ اور بنائے قدیم کی تنظیم موتمر الانصار کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ان کی کوششوں سے موتمر کے تین بڑے اور کامیاب جلسے ہوئے جس نے دارالعلوم کے حلقہ اثر کو بہت وسعت دی۔

مولانا سندھی کا سیاسی شعور بتدریج ترقی پر تھا۔ اس باب میں انہوں نے شاہ ولی اللہ سے تخلیقی تحریک حاصل کی تھی۔ دیوبند کے ارباب اہتمام ان کی سیاسی سرگرمیوں اور مذہبی مسائل میں ان کی تعبیرات کو ناپسند کرتے تھے۔ دیوبند کے علماء سے ان کا اختلاف ہوا جس کے نتیجہ میں انہیں دارالعلوم چھوڑنا پڑا۔ مشائخ کے ایک طبقہ نے انہیں کافر بھی قرار دیا۔

شیخ الہند کی ہدایت پر دائرۃ المعارف میں کام کرنے کے لیے وہ ۱۹۱۳ء میں دہلی آ گئے۔ جس کے قیام میں حکیم اجمل خاں، نواب وقار الملک، ڈاکٹر انصاری، مولانا آزاد اور مولانا محمد علی وغیرہم کا اشتراک عمل و فکر انہیں حاصل رہا۔

نظارۃ المعارف کا خاص مقصد مسلمانوں کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو قرآنی تعلیمات سے اس طرح روشناس کرانا تھا کہ اسلام کے بارے میں ان کے جو شکوک و شبہات ہیں اس کا علمی طور پر ازالہ کیا جاسکے۔ درس قرآن کے اس حلقہ سے مولانا سندھی نے ملک کے بیدار مغز، متحرک اور فعال افراد پر مشتمل ایک جماعت اپنے گرد جمع کر لی۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ اسی زمانے میں شیخ الہند نے محسوس کیا کہ برطانوی سامراج کے خلاف بغاوت کا وقت آچکا ہے اور اندرون ملک زمین ہموار ہو چکی ہے اب اگر افغانی قبائل باہر سے حملہ کر دیں جن کو دیگر ممالک کی فوجی امداد حاصل ہو تو یہ ایک ایسی صورتحال ہوگی جس کا انگریز مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ اسی کے پیش نظر شیخ الہند نے مولانا سندھی کو افغان قبائل میں کام کرنے کے لیے افغانستان کی طرف ہجرت کا حکم دیا۔ ان کو حکومت کے کارپردازان کی نگاہ میں آئے بغیر سفر کرنا تھا۔ اس لیے غیر معروف راستوں سے افغانستان میں داخل ہوئے اور بہ خرابی بسیار کابل پہونچے۔

باب پنجم

افغانستان کا کارگہ عمل

مولانا عبید اللہ سندھی ۱۵/اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہونچے ان کو شیخ الہند کی طرف سے کوئی واضح پروگرام نہیں دیا گیا تھا۔ ان کے دو ساتھی شیخ محمد ابراہیم اور محمد علی قصوری وہاں پہلے ہی پہنچ کر ان کے لیے زمین ہموار کرنے کے علاوہ ہمدردوں کا ایک حلقہ بھی بنا چکے تھے۔

کابل پہونچ کر جب ان کا افغان حکومت کے اراکین سے اچھا تعارف ہو گیا۔ تو امیر حبیب اللہ کی خواہش کے مطابق مولانا سندھی نے انڈین نیشنل کانگریس سے اپنا تعلق استوار کیا۔ اور امیر حبیب اللہ کے جانشین امان اللہ کے عہد میں یہ تعلق اس مقام تک پہونچ گیا کہ انہوں نے کابل میں کانگریس کمیٹی بنائی

جسکا انڈین نیشنل کانگریس سے الحاق ہو گیا۔ ہندوستان کی سرزمین سے باہر قائم ہونے والی انڈین نیشنل کانگریس کی یہ پہلی شاخ تھی۔

مولانا سندھی کے ذہن نے کابل میں قیام کے دوران ہی اتحاد عالم اسلامی کی تحریک سے متعلق امور پر مختلف انداز سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں انہوں نے جنود اللہ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس کا مقصد تھا کہ مسلمان لیڈروں اور کارکنوں کو کرپین سالویشن آرمی کی طرح ایک نیم فوجی نظام میں منسلک کر کے ان کو عالم اسلامی کی بہبودی کے لیے اعزازی طور پر اور بلا تنخواہ کام کرنے والے رضا کاروں کی حیثیت سے کام پر لگایا جائے۔

اسی زمانے میں افغانستان میں حکومت موقتہ ہند کی بنیاد پڑی جس کے راجہ مہندر پرتاپ صدر، مولانا برکت اللہ بھوپالی وزیر اعظم اور مولانا سندھی وزیر خارجہ تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے مشورہ سے امان اللہ خان نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ مولانا نے حکومت موقتہ ہند کے ذمہ دار کی حیثیت سے ہندوستان کے تمام شہریوں سے ہند پر حملہ آور اس فوج کو ہر قسم کی امداد دینے کی اپیل کی۔ اس جنگ کے نتیجے میں افغانستان آزاد ہو گیا۔

مولانا کی سرگرمیوں کی بنا پر انگریز مولانا کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے حکومت افغانستان پر ان کی سرگرمیاں ختم کرنے کے لیے دباؤ ڈالا۔ اب اس کا کوئی امکان نہ رہا کہ وہ افغانستان میں رہ کر کوئی کام کر سکیں گے۔ مولانا نے از خود رضا کارانہ طور پر افغانستان چھوڑنے کی پیشکش کی اور اپنے مختصر ساتھیوں کے ہمراہ افغانستان کو خیر باد کہا۔

باب ششم

اشتراکی روس کی طرف

مولانا سندھی ملک کی آزادی کا ایک انقلابی منصوبہ لیکر افغانستان گئے تھے جس میں انہیں ناکامی ہوئی اور انگریزوں کے دباؤ کے تحت انہیں افغانستان سے نکلنا پڑا۔ ہندوستان کے دروازے ان پر بند تھے۔ ان کے سامنے روس جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ جو اس وقت دنیا کے تمام انقلاب پرستوں اور

مہم پسندوں کی خوابوں کی سرزمین بنا ہوا تھا۔

سنر کی بہت سی اذیتیں برداشت کرنے کے بعد چند ساتھیوں کی رفاقت میں وہ ماسکو پہونچے اور ایک سال سے زائد عرصہ وہاں رہے۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے رکن کی حیثیت سے ماسکو گئے اور اسی حیثیت میں وہ روسی رہنماؤں سے ملے۔ انقلاب کے نتیجہ میں یہاں ایک لادینی نظام قائم ہو چکا تھا اور سویٹ یونین انقلاب کے عبوری دور سے گزر رہا تھا۔ ماسکو میں قیام کے دوران مولانا سندھی نے اشتراکی فلسفہ کا فہم حاصل کیا اور اس کی عملی تعبیر کو وجود پذیر ہوتے ہوئے دیکھا۔

مولانا کے تخلیقی ذہن نے شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کے حوالہ سے اشتراکی فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کی۔ جس کا نتیجہ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کے اس انقلابی تعبیر کی صورت میں سامنے آیا۔ جسے پیش کر کے مولانا سندھی نے ہند کے علماء دین کو حیران کر دیا تھا۔

باب ہفتم

ترکی میں اجنبی

روسی حکومت سے ایک معاہدہ کے بعد وطن عزیز کی آزادی کے خفیہ منصوبہ کے تحت ۱۹۲۳ء میں مولانا سندھی اس وقت ترکی پہونچے جب عثمانی سلطنت کے بہت سے اجزاء یورپین اقوام میں تقسیم ہو چکے تھے اور حالات ایسے تھے کہ اسلام پسندوں میں مایوسی کے سوا اور کوئی احساس باقی نہ رہا تھا۔

ترکی ان دنوں ایک سماجی انقلاب کے عمل سے گزر رہا تھا وہ خلافت عثمانیہ ختم ہو چکی تھی جس کے تحفظ کی خاطر آٹھ سال قبل مولانا نے وطن سے ہجرت کی تھی۔

مصطفیٰ کمال کی رہنمائی میں ایک نیا ترکی جنم لے رہا تھا۔ ترکی میں ایک ایسے نئے انقلابی دور کا آغاز ہو چکا تھا جس نے ترک قوم کو زندگی کے نئے طرز اور نئی تہذیب سے آگاہ کیا۔ مولانا تقریباً ۳ سال اس تبدیلی کے عمل کا مشاہدہ کرتے رہے۔

ترکی میں مقیم رہ کر انہوں نے برصغیر کے سیاسی مسئلہ کا ایک حل تلاش کرنے کے لیے ”مہابھارت سروراجیہ“ اسکیم تیار کی اور اپنے اس پروگرام کو خفیہ طریقہ سے بذریعہ ڈاک اور ترکی آنے والے اپنے

دوستوں کے ذریعہ ہندوستان میں تقسیم کا اہتمام کیا۔

انہوں نے ۱۹۲۶ء میں مکہ میں ہونے والی موتمر اسلامی میں شرکت کا فیصلہ کیا جس میں ہندوستان کے بہت سے زعماء ملت شرکت کرنے والے تھے۔ آخر اٹلی اور حبشہ ہوتے ہوئے وہ مکہ پہنچ گئے۔

باب ہشتم

زائر حرم

مولانا سندھی موتمر کا اجلاس ختم ہونے کے بعد حجاز پہنچے۔ یوں ان کے سفر کا بڑا مقصد ختم ہو چکا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے رکن کی حیثیت میں انہیں حجاز میں رہنے کی اجازت مل گئی۔

حجاز میں قیام کا سارا زمانہ انہوں نے مطالعہ اور درس و تدریس میں گزارا اور وہاں ہر طرح کی سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کش رہے۔

حجاز میں اپنے ۱۲ سالہ قیام کے دوران وہ بیش تر اپنی گذشتہ زندگی اور اس کے تجربات کا جائزہ لیتے رہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے اپنے افکار مرتب کئے جن کی صداقت اور افادیت کو وہ عملی دنیا میں کامیاب ہوتا دیکھ چکے تھے اس لیے ان کے سچا ہونے پر ان کو پورا یقین تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی اس بصیرت کو اپنے ہموطنوں میں عام کریں۔

سیاسی جمہوریت کے اس زمانے میں وہ ہندوستان میں ہونے والی سیاسی تبدیلی سے بے خبر نہ تھے۔ وسیع پیمانہ پر سیاحت، عالمی انقلاب کے مشاہدے اور زندگی کے حوادث نے مولانا سندھی کو رومان پرستی سے نکال کر حقیقت پسند بنادیا تھا۔ جس رومان پرستی کے تحت انہوں نے ۱۹۱۵ء میں ہجرت کی تھی اس کی حقیقت عیاں ہو چکی تھی۔ اس لیے جب ہندوستان میں الیکشن کے بعد صوبائی حکومتیں بنیں اور خود مولانا سندھی پر ان کے بعض بھی خواہوں اور ادا تمندوں کی طرف سے وطن واپس آنے کا دباؤ بڑھا تو انہوں نے حکومت کی پیش کردہ تمام قیود و شرائط مان لیں۔

وہ وطن واپس آنا چاہتے تھے تاکہ اپنے اہل وطن کے سامنے اپنے چوبیس سالہ تجربات کا حاصل پیش کر سکیں۔ ان خیالات کو لے کر ۲۷ فروری ۱۹۳۹ء کو وہ سندھیا کمپنی کے جہاز المدینہ سے وطن واپس

ہوئے۔

باب نہم

وطن واپسی

مولانا سندھی ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۹ء تک وطن سے باہر رہے۔ ۲۴ سالہ جلا وطنی کے بعد وہ اس عزم محکم کے ساتھ ہندوستان واپس آئے تھے کہ مسلمانوں اور اہل وطن میں اپنی کوششوں سے ان کے نقطہ نظر میں انقلابی تبدیلیاں لے آئیں گے۔ وہ اس سلسلہ میں بیتاب تھے کہ غیر ممالک میں انہوں نے جو تبدیلیاں دیکھی ہیں ان کو اپنے بنائے وطن تک پہنچادیں۔

جب وہ یہاں واپس آئے تو ان کے بہت سے بااثر رفقا اس دنیا سے کوچ کر چکے تھے اور جو باقی تھے ان کی سیاست کا رخ دوسرا تھا۔ لوگوں نے مولانا کے خیالات سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور ان کی بھرپور مخالفت کی۔ مولانا کی فکر و نظر مستحکم تھی۔ انہوں نے اس مخالفت کا کوئی اثر نہیں لیا۔

ان کی جدوجہد صرف تحریر و تقریر تک نہ تھی۔ وہ شمالی ہندوستان کے ہر حصہ میں سفر کرتے رہے اور لوگوں کو اپنی فکر سے روشناس کراتے رہے۔

وہ مدرسۃ العلوم کراچی، دارالارشاد پیر جھنڈا اور جامعہ ملیہ میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ انہوں نے ان مقامات پر بیت الحکمت کی شاخیں قائم کیں۔ جن کی حیثیت ان کی تعلیمی تحریک کے معمل کی تھی۔ پچیس سال کے سفر، گردش و جلا وطنی کے بعد انقلاب و تغیرات کے مشاہدے اور بے شمار تجربات اور نشیب و فراز سے گذر کر جب وہ ہندوستان پہنچے تو ذہنی و فکری کام کے لیے انہوں نے جامعہ ملیہ کا انتخاب کیا اور بیت الحکمت کی بنیاد ڈالی۔

اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے انہوں نے کئی سیاسی جماعتیں بھی بنائیں۔ اور ہمہ وقت منصوبہ بندی میں مشغول رہے۔ مگر ان کے منصوبے پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔

باب دہم

آخری سفر

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ مولانا کو وقت کی کمی کا احساس بہت شدت سے محسوس ہونے لگا تھا۔ اپنی فکر کو عام کرنے کی انہیں اتنی شدید خواہش تھی کہ خرابی صحت کے باوجود اپنا آرام تہہ کر کے وہ مسلسل سفر میں رہتے اور طلباء اور عوام کو اپنے خیالات سے روشناس کرانے کے علاوہ مدارس اسلامیہ کے قیام اور اشاعت تعلیم کی تحریک پیدا کرتے رہتے۔ ۱۹۴۴ء کے وسط میں مولانا سندھ کا دورہ فرما رہے تھے کہ ان کی طبیعت گری اور بہت اصرار پر وہ آرام کیلئے اپنی صاحبزادی کے یہاں دین پور چلے گئے۔ اور وہیں ۲۰ اگست کو پیام آخر آ پہنچا۔ اس طرح عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ گیا اور اپنے مرشد حضرت مولانا غلام محمد دین پوری کے قدموں میں آسودہ خاک ہوئے۔

ان کی وفات ایک فرد یا ایک شخص کی نہیں ایک ایسے انسان کی موت تھی جس کے ساتھ ایک عہد ختم ہو گیا۔

باب یازدہم فکر عبید اللہی

مولانا سندھی کی ساری عمر ایک جستجو ایک ولولہ ایک عزم کے ساتھ انتھک محنت کرتے گزری۔ انہوں نے دنیا کے نشیب و فراز اور انقلابات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے ہر طرح کی تکالیف و مشکلات کو جھیلنے اور مصائب برداشت کرنے کے بعد انسانیت کو تباہیوں اور بربادیوں سے بچانے کا واحد ذریعہ اسلام کو جانا تھا۔ اور یہی پیغام وہ دوسروں کو پہونچانا چاہتے تھے۔ وہ خفی مسلک اور دیوبندی مکتبہ فکر کے ایک عالم تھے۔ سیاسی و مذہبی معاملات میں وہ اپنے عظیم استاد محمود حسن کے افکار و رہنمائی کو ہندوستان کے مخصوص حالات میں کافی اور صحیح تر سمجھتے تھے۔ جو حزب ولی اللہی کے ایک اہم رکن تھے۔

مولانا سندھی نے تعلیمات شاہ ولی اللہ کے آئینہ میں قرآن کو اس کی اصل شکل میں دیکھا۔ انہوں نے اس پر غور کیا کہ اسلام کو دنیا کے اس وقت کے اقتصادی، سماجی اور بین الاقوامی حالات میں کس طرح ایک عالمگیر طاقت بنایا جائے۔ جس کا وہ دین فطرت ہونے کی بنا پر بجا طور پر مستحق ہے۔

ان کے مطالعہ نے انہیں اس نتیجہ پر پہونچایا کہ خالص اور بے میل انسانیت ہی قرآن کا صحیح اور مکمل نصب العین ہے۔ جو تعلیم عام انسانیت کے تقدم اور ترقی میں مدد و معاون ہے وہ حق ہے اور جو تعلیم

انسانیت کے ارتقاء میں حارج ہو وہ تعلیم حق نہیں ہو سکتی۔ ان معنوں میں قرآن مجید مولانا کا عقیدہ بنا اور قرآن کے نظام کو عملی شکل دینے کے لیے جدوجہد کرنا زندگی کا مقصد۔ ان کا کہنا تھا کہ قرآن جہاد کا حکم دیتا ہے جسے ہم آج کی اصطلاح میں انقلاب کہتے ہیں۔ وہ لوگوں کو قرآنی انقلاب کی طرف بلاتے تھے تاکہ دنیا میں بین الاقوامی منصفانہ حکومت کی راہ ہموار ہو سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ اللہ نے انبیاء کرام کو اسی لیے مبعوث کیا کہ وہ دنیا سے ظلم اور ظالمانہ نظام کو مٹا کر منصفانہ نظام قائم کریں۔

ان کا کہنا تھا کہ قرآن حکیم صرف مسلمانوں کی ہی کتاب نہیں چونکہ اس کا فوکس اور مخاطب پوری انسانیت ہے اس لیے یہ کتاب پوری انسانیت کے لیے ہے۔ اور آنے والے تمام زمانوں کے لیے یہ پوری انسانیت کی بنیادی فکر کا ترجمان ہے اور یہ فکر اپنی فطرت میں آفاقی ہے۔

ان کے نزدیک قرآن کریم تمام قومی، گروہی اور انفرادی مذاہب کی نفی کرتا ہے۔ کیونکہ یہ وحدت انسانی کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔ اور انسان جو اس زمین پر ایک خاندان کی طرح ہے اسے منتشر اور پراگندہ کرتے ہیں۔ مولانا کے نزدیک بہترین مذہب وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب ہو اور قربت کے معنی یہ ہیں کہ جو قومی، مذہبی، نسلی، لسانی اور دیگر امتیازات سے بالا ہو کر انسانیت کو ایک خاندان سمجھتا ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندو اور مسلمان آپس میں وحدۃ الوجود (ہمہ اوست) یا ویدانت فلاسفی کی بنیاد پر ایک ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے سیاسی پروگرام کے تحت مسلمانوں کو اجتماعی طور پر کانگریس میں شرکت کا مشورہ دیا مگر وہ خود کانگریس پارٹی میں شامل نہیں ہوئے کیونکہ وہ گاندھی طریق کار سے متفق نہ تھے۔

باب دوازدہم

امالی تصنیفات

مولانا عبید اللہ سندھی بنیادی طور پر ایک معلم تھے۔ اردو نہ ان کی مادری زبان تھی اور نہ انھوں نے اسکو بطور زبان سیکھا تھا۔ اس لئے وہ اپنے افکار کو بیان کرنے میں اس زبان کے صحیح استعمال پر قادر نہ تھے۔ انھوں نے اپنے قلم سے بہت ہی کم لکھا اور جو بھی تحریریں ان کے نام سے شائع ہوئیں یا تو انھوں نے املا کرائیں یا مولانا کی باتیں یا تقاریر سن کر لوگوں نے قلم بند کیں۔

شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کو انھوں نے اپنے علم اور مطالعہ کا محور بنایا اور اسی کی روشنی میں انھوں نے

اسلام اور قرآن کا مطالعہ کیا۔ غیر ممالک میں اپنے ۲۴ سالہ قیام کے دوران ان ممالک میں ہونے والے عظیم الشان انقلابات اور ان انقلابات کے جو اثرات انسانی فکر و تخیل پر پڑ رہے تھے اور عام معاشرہ ان سے جس طرح متاثر ہو رہا تھا اس کا انہوں نے بغور مطالعہ کیا اور ایک نتیجہ پر پہنچ کر اس کو اپنی فکر کا محور بنایا جو ان کی تصانیف میں بآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کتابوں اور رسالوں کے بارے میں عام خیال ہے کہ ان کے مرتبین کے اپنے خیالات بھی ان میں اس طرح مل گئے ہیں کہ وہ خود مولانا ہی سے خیالات کہے جانے لگے ہیں۔

باب سیزدہم

تحریکی رفقاء و مسترشدین

بحیثیت معلم مولانا سندھی کے دروس کا سلسلہ امرتھ کے ایک مدرسہ سے لیکر جمیعۃ الانصار، نظارۃ المعارف، قیام حجاز اور بیت الحکمت تک ایک طویل عرصہ پر محیط ہے۔ اس عرصہ میں ان سے فیض یافتہ افراد کی بڑی تعداد ہے جن میں سے بیشتر نے ان سے اکتساب علم کے علاوہ ان کے افکار اور مالی بھی قلم بند کئے۔ ان کے فیض یافتگان کے دوسرے زمرے میں وہ تحریکی رفقاء ہیں جو افغانستان اور روس کے قیام کے دوران ہر ابتلاء و مصیب میں ان کے ہمقدم رہے۔ اور جب مولانا ۲۵ سالہ جلاوطنی کے بعد وطن واپس آئے تو مختلف مراکز پر ان کے نئے ساتھیوں کی بڑی تعداد نے بیت الحکمت کے قیام اور سندھ ساگر جمنہ نزد پارٹی، خدام الحکمت کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس باب میں مختلف زمروں میں آنے والے انہی افراد کا تذکرہ ہے۔



مولانا عبید اللہ سندھی

حیات و کارنامے

مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی

زیر نگرانی

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

صدر شعبہ سنی دینیات

پیش کردہ

سید محمد احمد

ڈپارٹمنٹ آف سنی تھیالوجی

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۰۰۳ء



T6237

تقدیم

کسی بھی ایسے تحقیقی مطالعہ کے لیے جس کا محور مذہبی اشخاص ہوں صحیح مواد کے حصول اور تجزیہ میں خاصی کاوش کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ ایسے اشخاص کی شخصیت کے گرد عموماً تقدس اور احترام کا ایک ہالہ بن جاتا ہے۔ اور ان شخصیات پر لکھنے والے کشف و کرامات کے بہت سے واقعات سے مضمون کو بوجھل بنا دیتے ہیں اور حقیقت اس میں کھو جاتی ہے۔

جدو جہد آزادی کے مجاہدین میں مولانا عبید اللہ سندھی کی شخصیت نے عرصہ تک ایک روحانی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ مولانا کو خود اس کا گلہ تھا اور قیام حجاز کے دوران مولانا غلام رسول مہر مدیر انقلاب کے نام اپنے ایک خط میں انہوں نے تحریر کیا تھا کہ ان کے تعلق سے جو خبریں اور ان کے حالات جو ہندوستان میں شائع ہو رہے ہیں اس میں عقیدت کا خاصا دخل ہے۔

ہر چند کہ مولانا سندھی نے اپنے کچھ حالات جستہ جستہ تحریر کیے ہیں مگر وہ تشنہ ہیں اور ان میں کوئی ربط بھی نہیں ہے اور کئی جگہ واقعات کے بیان میں تکرار بھی ہے۔ اور عبد القدوس قاسمی صاحب نے مولانا سندھی کی یہ خودنوشت تحریریں ذاتی ڈائری کے تحت مرتب کر دی ہیں۔

کابل میں مولانا کی سرگرمیوں کا حال ظفر حسن ایک کی آپ بیتی سے ملتا ہے۔ محمد سرور نے ذاتی ڈائری اور آپ بیتی حصہ اول کو جہان تہاں سے مدون کر کے ”کابل میں سات سال“ مرتب کی۔ ظفر حسن کی خودنوشت کی دوسری جلد روس اور ترکی کے حالات پر مشتمل ہے۔ ظفر حسن پنجابی ہیں جنہوں نے بعد میں ترکی شہریت اختیار کر لی تھی۔ پاکستان سے شائع ہونے والی ان کتابوں میں ہندوستان کے غیر مسلم لیڈروں

کے لیے ان کا رویہ عدم احترام کا اور یک رخہ کا ہے۔ یہی صورت حال روس کے بارے میں ہے۔
ظفر حسن کی ملاقات مولانا سندھی سے کابل پہونچنے کے بعد ہوتی ہے۔ اس لیے مولانا سندھی کے
کابل کے ابتدائی ایام کے قیام کے سلسلہ میں ان کے اور مسٹر محمد علی قصوری کے بیانات میں تضاد ہے۔ محمد علی
قصوری ہندوستانی مسلم لیڈروں کی طرف سے کابل میں مولانا سندھی کے ہراول کے طور پر بھیجے گئے تھے۔
مولانا سندھی کا بیان ہے کہ وہ تمام کاغذات جو ان کی سرگرمیوں سے متعلق تھے ان کا بڑا حصہ کابل
میں انگریزوں تک پہونچ گیا۔ اور باقی کاغذات ماسکو میں روسی خفیہ محکمہ کے ہاتھ میں پہونچ گئے۔ اس
طرح مولانا کی کابل کی سرگرمیوں کا جس میں ”حکومت موقتہ ہند“ اور ”جنود اللہ“ کا قیام شامل ہے کوئی
تحریری دستاویزات نہیں ملتی ہیں۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن کی تحریک پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف حکومت کی سینڈیشن کمیشن کی
رپورٹ پر حاشیہ آرائی ہے۔ کیونکہ آزادی ہند سے قبل تمام حضرات نے اس بات کا خیال رکھا کہ کوئی ایسی
چیز ان کے قلم سے نہ نکلے جس کا تذکرہ دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث بنے۔

ان کے قریبی دوست اور ہم عصر مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی خودنوشت میں مولانا کی ڈائری اور
سینڈیشن کمیشن رپورٹ پر ہی انحصار کیا ہے اور مولانا حسین احمد بہت سی ایسی چیزوں سے جن کے وہ عینی شاہد
تھے سرسری گذر گئے ہیں۔

مولانا حسرت موہانی کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جب حسرت موہانی روس گئے تو مولانا نے
ان کی ملاقات لینن سے کرائی تھی جب کہ ظفر حسن کے بیان کے مطابق مولانا جب روس پہونچے ہیں تو اس
زمانے میں لینن سخت بیمار تھا اور اپنے قریبی ساتھیوں کو بھی نہیں پہچانتا تھا۔

مولانا سندھی پر جو مضامین لکھے گئے یا جو خاص نمبروں کی شکل میں شائع ہوئے ان میں عقیدت کا
پہلو حاوی رہا ہے اس مقالہ کے لیے مواد جمع کرنے میں ابو سلمان شا جہاں پوری نے جو مولانا سندھی پر سند
کا درجہ رکھتے ہیں میری بہت مدد اور رہنمائی کی دوسرا نام عبید اللہ سندھی اکاڈمی کے ڈائریکٹر قمر الدین سہو کا
ہے۔ یہ تحقیقی کام میں نے استاذی اقبال حسن خان صاحب کی نگرانی میں شروع کیا تھا۔ اور ریسرچ کی تکمیل

کے لیے ایم فل کا تحقیقی مرحلہ ان ہی کے زیر ہدایت تکمیل کو پہونچا تھا ریسرچ کے لیے معینہ مدت میں یہ کام انہی کی زیر ہدایت سرانجام پا چکا تھا کہ ان کی ناوقت اور دردناک موت نے کام کو دورا ہے پر چھوڑ دیا۔

بحیثیت ریگولر اسٹوڈنٹ پانچ سالہ مدت گزر جانے کے باوجود استاذی پروفیسر عبدالعلیم سابق صدر شعبہ سنی دینیات و ڈین فیکلٹی دینیات نے کام کی تکمیل پر زور دیا اور ان کی رہنمائی، ہدایت اور مشورے اس مقالہ کی تکمیل میں ہر مرحلہ پر میرے شامل حال رہے۔

تمام مراحل سے گزر کر اب یہ مقالہ بحیثیت ایکس اسٹوڈنٹ یونیورسٹی قانون کے تحت صدر شعبہ سنی دینیات محترم جناب ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی صاحب کی زیر نگرانی ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔

کام کی تکمیل کے سلسلہ میں جن افراد کی محبت اور تقاضوں نے مہینز کا کام کیا ان میں سابق ڈپٹی کنٹرولر (امتحانات) جناب سعید الدین خان، جناب فرخ جلالی صاحب، جناب عبدالمتین صاحب اور دفتر رابطہ عامہ میں میرے سابق ساتھی اور آج کے دوست مسٹر وسیم بابو کا بیش از بیش حصہ ہے۔ برادر مر فرخ جلالی کی میرے لیے وہی حیثیت ہے جو کسی موضوع پر مطالعہ کرنے والے کے لیے کسی لغت اور حوالہ جاتی کتب کی ہوتی ہے کہ اس کی موجودگی میں دل کو یہ اطمینان رہتا ہے کہ اگر کوئی مشکل کہیں پیش آئی تو مشکل حل کرنے کے لیے یہ موجود ہیں۔

یہ کام جیسا بھی کچھ ہے انجام کو نہ پہونچتا اگر برادر مر مہر الہی کتابت کرانے کا ذمہ کلیتاً اپنے اوپر نہ لے لیتے تو اس کام کا انجام یقیناً بخیر نہ ہوتا۔ انکی زیر نگرانی یہ مرحلہ تکمیل کو پہونچ چکا تھا کہ صحیح معنوں میں بجلی گری اور کمپیوٹر کے ”ہارڈ ڈسک“ کی تحریروں کو اس طرح چاٹ گئی کہ وہاں ڈسک کے علاوہ کچھ نہ رہا۔ مسودہ دوبارہ کتابت کے مراحل سے گذرا۔ اب اگر اس میں کوئی فتنی کجی اور صحت الفاظ میں کچھ خامی رہ گئی ہے تو وہی اس کے ذمہ دار قرار پائیں گے۔ کہ اس بار گراں کا ذمہ انہی نے اپنے ذمہ لیا تھا۔

اندر اجات

الف - ج	تفہیم
۱۰-۱	باب اول: تشکیل ایام
۳۱-۱۱	باب دوم: دیوبند
۴۰-۳۲	باب سوم: سندھ کی طرف مراجعت
۶۳-۴۱	باب چہارم: جمیعۃ الانصار - نظارۃ المعارف
۹۸-۶۵	باب پنجم: افغانستان کا کارگہ عمل
۱۱۵-۹۹	باب ششم: اشتراکی روس کی طرف
۱۳۱-۱۱۶	باب ہفتم: ترکی میں اجنبی
۱۴۱-۱۳۲	باب ہشتم: زائر حرم
۱۶۹-۱۴۲	باب نهم: وطن واپسی
۱۷۶-۱۷۰	باب دہم: آخری ایام
۲۱۱-۱۷۷	باب یازدہم: فکر عبید اللہی
۲۲۹-۲۱۲	باب دوازدہم: امالی تصنیفات
۲۳۵-۲۳۰	باب سیزدہم: تحریری رفقاء و مستر شدین
۲۴۹-۲۳۶	ضمیمہ - ۱
۲۷۶-۲۶۸	کتابیات

باب اول

تشکیلی ایام

انیسویں صدی کے اوائل میں پنجاب پر سکھوں کی حکومت کے دوران بہت سے ہندو اور سکھ خاندان سرکاری انتظامیہ میں بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ انہی میں گلاب رائے بھی تھے جنہوں نے اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر اپنے بیٹے جسپت رائے کو بھی گاؤں کے کاردار کی اچھی سرکاری ملازمت دلادی تھی۔ سکھوں کی حکومت کے زوال کے بعد ان دوسرے خاندانوں کی طرح جن کا تعلق سرکاری خدمت پر تھا اس خاندان نے بھی روزی روٹی کے لئے دوسرے ذرائع تلاش کرنے شروع کئے۔^۱

جسپت رائے کے بیٹے رام سنگھ نے زرگری کا آبائی پیشہ اختیار کیا اور سیالکوٹ کے ایک سکھ خاندان میں شادی کر لی۔^۲ مولانا سندھی کا بیان ہے کہ ”میرانا اصل میں میر علی والہ ضلع گجراں والا کا رہنے والا ایک خاندانی سکھ تھا۔ لیکن بعد میں اس نے سیالکوٹ سے بلوال موضع میں نقل مکانی کر لی اور اسی کی بڑی لڑکی پریم کور سے رام رائے کی شادی ہوئی۔ رام رائے نے اپنے خسر کی تحریک پر سکھ پن্থہ اختیار کر لیا اور رام رائے سے رام سنگھ ہو گئے۔^۳ اس شادی سے تین اولادیں ہوئیں۔ پہلی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا بوٹا سنگھ۔

لڑکیوں کی شادی باپ کی حیات ہی میں ہو گئی تھی۔^۴ بوٹا سنگھ کی پیدائش ۱۰ مارچ ۱۸۴۲ء مطابق ۲ محرم ۱۲۹۸ھ کو اپنے والد کے انتقال کے ۴ ماہ بعد آبائی گاؤں چیانوالی میں ہوئی۔^۵ مشترکہ خاندان ہونے کی بنا پر ان کی پرورش کا بار ان کے دادا جسپت رائے پر پڑا۔ جب وہ بھی دو سال بعد انتقال کر گئے تو ان کی ماں اپنے شیرخوار بچے کو لے کر اپنے میکہ چلی گئیں جو ایک خالص سکھ

پریوار تھا۔ لہٰذا دو سال بعد ان کے نانا کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب ان کی والدہ اپنے بھائیوں کے پاس جام پور ضلع ڈیرہ غازی خاں چلی گئیں۔ ۷

بوٹا سنگھ کی ابتدائی تعلیم ڈیرہ غازی خاں کی تحصیل جام پور کے اردو مڈل اسکول سے شروع ہوئی۔ ان کے دو ماموں بدھا سنگھ اور سدھا سنگھ جام پور میں پنواری تھے ۸۔ ۱۸ء میں ان کا اسکول کی فوقانی کلاس میں داخلہ ہو گیا۔ ۹

ڈیرہ غازی خاں پنجاب کا سرحدی ضلع ہے۔ جس کی سرحدیں سندھ اور صوبہ سرحد سے ملتی ہیں۔ معاشی اور تعلیمی دونوں میدان میں پسماندگی کی وجہ سے عوام اور خواص دونوں کو تصوف سے لگاؤ تھا۔ آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ پنجاب پر سکھوں کے جواثرات پڑے۔ اس سے یہ ضلع زیادہ متاثر نہ ہوا تھا۔ سکھ گھرانوں کو اسلام اور مسلمانوں سے کچھ زیادہ بعد نہ تھا۔ مناظروں کا زور تھا اور آریہ سماجی مناظرین کی سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں۔ اس لڑکے کا اپنے ارد گرد کے مسلمانوں سے ملنے سے پرہیز نہ کرنے کی وجہ سے اسکو مسلمانوں کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ ۱۰

مولانا کے نواسے مولانا عبید اللہ انور کی روایت کے مطابق مولانا سندھی نے ایک مرتبہ ان سے فرمایا کہ میری ماں نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارا باپ ہندو سے سکھ ہو گیا تھا اسلئے کہ سکھ مت میں توحید ہے۔ ۱۱

مولانا سندھی نے ایک اور واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ”ایک دن جب میں جامپور کی چوپال (دائرہ) میں بیٹھا تھا کہ میرے رشتے کے ماموں حاکم رائے۔ ۱۲ نے اسلام اور ہندو مذہب کا

موازنہ شروع کیا اور اسکو اسلام کی برتری پر ختم کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ ایک مرتبہ ہندو اور مسلمانوں میں اپنے اپنے مذہب کی حقانیت پر مناظرہ ہوا جو اس بات پر منتج ہوا کہ اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے دونوں مذاہب کے ماننے والوں میں سے ایک ایک فرد کو کھینچ کر چھلانگ لگائے اور اگر وہ کوئی گزند پہونچے بغیر زندہ سلامت باہر نکل آئے تو اسکا مذہب سچا ہے۔ اس مجادلہ کے لئے پہلے ایک ہندو اٹھا۔ اس نے سری رام کو اپنی مدد کے لئے پکارا۔ سری رام کے بھیجے ہوئے دو ہتھیار بھی شاید راستہ میں ہی تھے کہ اس نے سری کرشن کو مدد کے

لئے آواز دی اور جن کی مدد آنے سے پہلے ہی اس نے مہادیو کی دہائی شروع کر دی نتیجہً جب وہ کنویں میں گرا تو اسکو کسی دیوتا سے مدد نہیں ملی۔ وہ گرا اور اس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے۔ اب مسلمان اٹھا اس نے چھلانگ لگاتے وقت اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں پکارا۔ اللہ کے فرشتے اسکی مدد کو آ گئے اور وہ بالکل محفوظ رہا۔ ان کا کہنا تھا کہ جہاں تک انہیں خیال ہے اسلام کی حقانیت پر انکے ماموں کی اس گفتگو نے ان پر انٹ اثر چھوڑا۔^{۱۲} مسلمانوں کی طرف سے ان کے ماموں کے اسی نرم رویہ کے باعث انہیں مسلمانوں کے قریب آنے کے مواقع ملے۔

وہ جام پور کے مڈل اسکول میں تین سال پڑھتے رہے اور اسی دوران ۱۸۸۱ء کی مردم شماری میں بھی کام کیا۔ اسی زمانے میں انہیں گورکھی کی پہلی کتاب دی گئی۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق اس میں سے انہوں نے ایک حرف بھی نہیں پڑھا۔ مگر کتاب کی ایک تصویر جس میں ایک بندر دو بلیوں کی روٹی بانٹ رہا ہے انہیں یاد رہی کیونکہ ان کے ماموں نے بتایا کہ یہ دو بلیاں ہندو اور مسلمان ہیں اور بندر انگریز ہے۔^{۱۳}

اس کے بعد انکی والدہ پھر اپنے گھر آ گئیں اور دو سال ضلع سیالکوٹ کے مختلف دیہاتوں میں دور و نزدیک کے رشتہ داروں میں انہیں ملانے کے لئے لے جاتی رہیں اور وہ برہمن کی غمی اور خوشی کی تقاریب میں شریک ہوتے رہے۔ تھوڑے عرصہ کے لئے جاکلی کے مڈل اسکول کے چوتھے درجہ میں بھی ان کا داخلہ ہوا۔ اور اکثر اوقات مساجد کے مولویوں سے فارسی کی کتابیں پڑھتے رہے۔ ان کی ماں اس عرصہ میں ان کے لئے مناسب رشتہ تلاش کرتی رہیں اور جب اسمیں کامیاب ہو گئیں تو انہیں واپس جام پور بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے سخت محنت کر کے دو ماہ میں چوتھی کا امتحان پاس کر لیا اور ۱۸۸۴ء میں پانچویں کلاس میں آ گئے۔^{۱۴}

انہوں نے فارسی مبادیات سیکھنے پر خاص توجہ دی اور ابتداً چند ہفتوں میں تمام ادبیات کو اس طرح پڑھ لیا تھا کہ تمام سال اسکے اعادہ کی ضرورت نہ رہی اور پھر تمام تر وقت ریاضی کی تحصیل میں صرف کیا۔ علم الحساب، الجبرا اور جیومیٹری میں درسیات کے تعلق سے جو کتابیں ملیں اس کا انہوں نے غائر توجہ سے مطالعہ کیا۔ انہی ایام میں ۱۸۸۶ء میں جب وہ ہفتم کے طالب علم تھے تو اخبار قیصر ہند

جالندھر میں ریاضی کا ایک مسئلہ شائع ہوا۔^{۱۵} وہ اخبار گھر لے آئے اور اسکول کا کام ختم کر کے اس مسئلہ پر غور کیا اور شام تک اسکول تک اسکا جواب اخبار مذکور کو بھیج دیا۔ اخبار کے اگلے شمارہ میں وہ ان کے نام کے ساتھ اخبار کے ۲ کالموں میں شائع ہوا۔ ریاضی کے بعد انکی دلچسپی تاریخ، افسانہ اور ناولوں سے تھی۔ اور ان موضوعات پر جو بھی کتاب انکے ہاتھ لگتی وہ دلجمعی سے اسکا مطالعہ کرتے۔^{۱۶}

رفتہ رفتہ انکی دلچسپی اخبار سے بڑھنے لگی ”پنجابی کے پرانے فائل کھنگال ڈالنے کے بعد آفتاب پنجاب، کوہ نور اور اخبار عام انکے مطالعہ میں رہے تاریخ پنجاب میں سکھ حکومت کے حالات انہوں نے غور اور دلچسپی سے اسطرح پڑھے کہ انہیں اپنے سکھ ہونے پر فخر ہونے لگا۔ اردو میں شائع ہونے والا پنجاب کا سرکاری گزٹ بھی انکے مطالعہ میں رہتا۔^{۱۷}

گھر کی عورتوں سے انگریزوں کے سکھوں پر ڈھائے گئے مظالم کے قصے سن کر بچپن سے ہی انگریز حکمرانوں کے خلاف نفرت انکے دل میں جاگزیں ہو گئی تھی۔^{۱۸} اور انکے بیان کے مطابق جب مہاراجہ دلیپ سنگھ۔^{۱۹} کے پنجاب واپس آنے کی خبر ماموں کے ذریعہ ملی تو خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور ایک ہفتہ بعد خاندان کی خوشیوں پر اس وقت اوس پڑ گئی جب یہ معلوم ہوا کہ مہاراجہ کو عدن سے واپس کر دیا گیا ہے۔ اس واقعہ نے بھی انگریزوں سے انکی نفرت کو ہوا دی۔^{۲۰}

۱۸۸۴ء میں انہیں ایک آریہ سماجی طالب علم سے ایک کتاب تحفۃ الہند^{۲۱} ملی جس میں نو مسلوں کی فضیلتیں اور آخرت کے احوال درج تھے۔ جس کے بار بار مطالعہ سے ان کے دل میں اسلام کی شمع روشن ہوئی۔ تحفۃ الہند کا وہ باب جو نو مسلموں کے فضائل سے متعلق ہے وہی ان کے قبول اسلام کا سبب بنا۔^{۲۲} اس کے بعد شاہ اسماعیل شہید کی تقویت الایمان^{۲۳} کے مطالعہ نے ضیاء توحید پیدا کی اور اس جذبہ کو جلا بخشی۔ ان کے وجود کا داخلی انقلاب کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ سکھ عقائد سے انحراف اور اسلام کی طرف رغبت نہ جذباتی تھی نہ حادثاتی انہوں نے خود تحریر کیا ہے کہ ”سب سے پہلے جس کتاب نے مجھے اسلام کے متعلق واقفیت دی اور جسکی بنا پر ہندو سوامائی میں رہ کر میں ۱۶ برس کی عمر سے پہلے مسلمان ہو گیا وہ تحفۃ الہند ہے جس کے مولف نے ہندو مذہب کے مشرکانہ

عقائد و رسوم کو نقل کرنے کے بعد ہندوؤں کی طرف سے ایک اعتراض نقل کیا ہے کہ مسلمانوں میں بھی مشرکانہ اعمال و رسوم پائے جاتے ہیں۔ اس کا جواب مولف نے مختصر طریقہ پر یہ دیا ہے کہ ہم نے ہندو مذہب کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ ان کی مستند مذہبی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ لیکن اس کے جواب میں جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ اسلام کی مستند کتابوں سے ماخوذ نہیں بلکہ مسلمانوں کے اعمال و رسوم ہیں۔ اس کا اسلام ذمہ دار نہیں ہے اور قرآن و حدیث سے ان کی کوئی سند پیش نہیں کی جاسکتی۔ اس موقع پر میرے ساتھی کو جو میری طرح نو مسلم تھے توجہ ہوئی کہ وہ اس بات کی تحقیق کریں کہ کیا اسلام کی مستند کتابیں اس مسئلہ میں بے داغ ہیں اور ان میں ان اعمال و رسوم کا کہیں کوئی ثبوت نہیں۔ اس موقع پر ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں صرف قرآن و حدیث کے حوالہ سے اسلام کی توحید پیش کی گئی ہو۔

مولانا اسماعیل شہید کی تقویت الایمان اس سوال کا شافی جواب تھا جس سے ہمیں معلوم ہو گیا کہ اسلام کی توحید بالکل خالص ہے اور قرآن و حدیث مسلمانوں کے ان اعمال و رسوم سے بالکل بری ہیں ان دونوں کتابوں سے میں اسلام کے متعلق ایسا عقیدہ پیدا کر سکا کہ آج تک شاید میں انہیں اک حرف کا اضافہ نہ کر سکا۔“ ۲۴

اسلام قبول کرنے سے قبل انہوں نے اسلامی کتب کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ راہ میں آنے والی مشکلات کا انہیں بخوبی علم تھا۔ دل و دماغ میں کشمکش تھی اور اس مسئلہ پر غور کرتے وقت انہوں نے کافی راتیں بے خوابی میں گزار دیں۔ آخر میں حق کی جیت ہوئی اور مذہب کا جذبہ غالب آیا۔

اسی زمانے میں پنجاب میں حافظ محمد لکھوی کی تصانیف کی بہت شہرت تھی اور ان کی منظوم پنجابی کتابیں گھر گھر موجود تھیں جو ذوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ ان کتابوں میں سے ایک کا نام احوال الآخرت ہے جو ناسنگھ کو یہ کتاب بھی میسر آ گئی اس کے پڑھتے ہی ان کی دنیا بدل گئی وہ تیزی کے ساتھ اسلام کے دروازہ پر آکھڑے ہوئے۔ ۲۵ انہوں نے نماز سیکھ لی اور تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر اپنا نام عبید اللہ ۲۶ رکھ لیا۔ ۲۷

ان کا خیال تھا کہ جب وہ کسی ہائی اسکول میں داخلہ کے لئے لاہور جائیں گے تو اظہار اسلام کر لیں گے۔ ۲۸ لیکن وہ ایک روز کمرہ میں نماز پڑھتے ہوئے چٹکنی لگانا بھول گئے اور انکی ماں نے

انہیں شعائر اسلام میں مشغول دیکھ کر بین شروع کر دیا۔ ان حالات میں اپنا گھریا رواقارب کو چھوڑ کر توکل علی اللہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ۲۹

انکا کہنا ہے کہ سب سے زیادہ تکلیف انہیں اپنی ماں کو چھوڑنے سے ہوئی جس سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ ان کے دل، دماغ میں ایک کشاکش تھی۔ اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے انہوں نے کتنی ہی راتیں بے خوابی میں گذاریں۔ مگر اسلام سے انکی محبت اتنی بڑھ چکی تھی کہ وہ کسی محبت کو خاطر میں نہیں لائے۔ ۳۰

۱۵ اگست ۱۸۸۵ء کو کوئٹہ مغیلاں کے ایک ساتھی عبدالقادر کے ہمراہ اپنا آبائی شہر سیالکوٹ چھوڑ دیا اور وہ دونوں عربی مدرسہ کے ایک طالب علم کے ہمراہ مختلف مدرسوں اور خانقاہوں میں گشت لگاتے کوئٹہ رحم شاہ مظفر گڑھ آگئے جہاں ۲۹ اگست کو انہوں نے سکھ مذہب کے دائرہ سے نکل کر اسلام کے دائرہ میں قدم رکھا۔ ۳۱

اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی گرفت سے بچنے کے لئے انہوں نے پنجاب کا علاقہ چھوڑ دیا اور سندھ میں بھرچونڈی متصل دھر کی اسٹیشن۔ ضلع سکھر پہونچے وہاں انکو بزرگانہ شفقت اور محبت کا سکون بخش شجر سایہ دار ملا۔ پیر جی حافظ محمد صدیق نے جوان کے قبول اسلام کے جذبہ سے بہت متاثر ہوئے تھے اس نو مسلم کو اپنا روحانی فرزند بنالیا۔ حافظ محمد صدیق ایک بڑے صاحب نسبت بزرگ اور درویش کامل تھے۔ عبید اللہ نے قادری راشدی طریقہ میں ان سے بیعت کر لی۔ حافظ صاحب کی خدمت کا یہ اثر ہوا کہ اسلامی معاشرت انکی طبیعت ثانیہ بن گئی۔ انہیں اپنے مرشد سے غایت درجہ محبت تھی اور حافظ محمد صدیق کے تعلق ہی کہ وجہ سے عبید اللہ نے سندھ کو اپنا وطن بنالیا۔ ۳۲

بھرچونڈی سے وہ نقل و حرکت کرتے دین پور ریاست بھاو پور آئے جہاں مولانا عبدالقادر سے ابتدائی عربی، ہدایت النحو اور دوسری درسیات سبقاً سبقاً پڑھیں۔ پھر واپس کوئٹہ رحم شاہ پہونچے اور مولانا خدا بخش سے کافیہ پڑھی۔ ۳۳

دین پور میں حافظ محمد صدیق کے خلیفہ ابوسراج غلام محمد صاحب نے انکی والدہ کو ان کی وہاں

ڈالا مگر انہوں نے اپنے لئے جو راستہ چنا تھا اس پر ثابت قدم رہے۔ ۳۴۔

اسی زمانہ میں انہوں نے دیوبند کا تذکرہ سنا اور تحصیل علم کا شوق انہیں کشاں کشاں اکتوبر ۱۸۸۸ء میں دیوبند لے آیا۔ جہاں وہ حضرت شیخ الہند کے حلقہ درس میں داخل ہوئے۔ ۳۵۔

مآخذ و حواشی

- ۱۔ غلام علی الانہ۔ ہمارے مجاہدین آزادی (انگریزی)۔ ص ۱۷۳۔
- ۲۔ عبید اللہ سندھی۔ ولادت سے اظہار اسلام تک۔ رسالہ الولی۔ اگست ۱۹۹۴ء۔ صفحہ ۱۰۱۔
- ۳۔ ڈاکٹر ہاجن شیخ۔ مولانا عبید اللہ سندھی (انگریزی)۔ ص ۱۔
- ۴۔ ایضاً ایضاً ص ۱۔
- ۵۔ مالک رام۔ تذکرہ ماہ و سال۔ ص ۲۶۹۔
- ۶۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۱۸۔
- ۷۔ ڈاکٹر ہاجن شیخ۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ صفحہ ۲۔
- ۸۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۱۸۔
- ۹۔ محمد سرور۔ عبید اللہ سندھی۔ صفحہ ۲۲۔

- ۱۰۔ ڈاکٹر محمد اکمل قادری۔ سیدی وجدی۔ رسالہ خدام دین۔ نومبر ۱۹۹۴ء۔ ص ۱۶
- ۱۱۔ حاکم رائے مولانا سندھی کی والدہ کے چچیرے بھائی تھے جو جامپور میں پنواری تھے۔
- ۱۲۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ ولادت سے اظہار اسلام تک۔ رسالہ الولی۔ اگست ۱۹۹۴ء۔ ص ۱۰۴
- ۱۳۔ ایضاً ایضاً ص ۱۰۳
- ۱۴۔ ایضاً ایضاً ص ۱۰۴-۱۰۵
- ۱۵۔ ۱+ب+ج=۶
- د+ب+ج=۱۴
- د+ب+ج=۳۶۔ رسالہ الولی۔ اگست ۱۹۹۴ء صفحہ ۱۰۶
- ۱۶۔ عبید اللہ سندھی۔ ولادت سے اظہار اسلام تک۔ الولی اگست ۱۹۹۴ء۔ ص ۱۰۶
- ۱۷۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۰۶
- ۱۸۔ خطبات عبید اللہ سندھی۔ مرتبہ محمد سرور۔ ص ۶۵
- ۱۹۔ دلپ سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا چھوٹا بیٹا تھا۔ مارچ ۱۸۴۹ء میں گدی سے معزول کیا گیا۔ اور وظیفہ دے کر انگلستان بھیج دیا گیا جہاں اسے عیسائی بنا لیا گیا۔ اس نے بعد میں عیسائیت ترک کر دی۔ ۱۸۹۰ء میں انگلینڈ میں انتقال ہوا۔
- ۲۰۔ عبید اللہ سندھی۔ ولادت سے اظہار اسلام تک۔ رسالہ الولی۔ اگست ۱۹۹۴ء۔ ص ۱۰۶
- ۲۱۔ پنڈت مولوی عبید اللہ نے قبول اسلام کے بعد اسلام کی حقانیت پر تحفۃ الہند تحریکی جو اسی سال ۱۳۶۴ھ/۱۸۹۳ء میں لدھیانہ سے شائع ہوئی۔ کچھ ترمیم و اضافہ کے بعد اسکا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۶ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں اسلامی تعلیمات، اپنے قبول اسلام کا واقعہ اور ہندو مذہب سے متعلق ضروری تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اور ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو

اس دور میں ہندومت چھوڑ کر مسلمان ہوئے تھے۔

(ٹی۔ ایس۔ آر نلڈ۔ پریچنگ آف اسلام۔ ۱۱ ہور۔ ص ۲۸۱)

۲۲۔ سید محمد میاں۔ تحریک شیخ الہند۔ ص ۵۹

۲۳۔ تقویت الایمان مولانا شاہ اسماعیل شہید دہلوی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں توحید و شرک پر اور دوسرے حصے میں اتباع سنت پر بحث کی گئی ہے۔ اپنے زمانہ میں جہاں ایک طرف مسلمانوں میں ذہنی بیداری پیدا کرنے میں اس کتاب نے اہم کردار ادا کیا۔ وہیں اختلافات کے دروازے بھی وا کئے۔

۲۴۔ عبید اللہ سندھی۔ میری محسن کتابیں۔ رسالہ الندوہ۔ فروری ۱۹۴۱ء۔ ص ۴

۲۵۔ محمد الحق بھٹی۔ نقوش عظمت رفتہ۔ ص ۳۵۹

۲۶۔ اسلام لانے سے قبل عبید اللہ مالیر کوٹلوی کا نام پنڈت امنت رام تھا۔ والد کا نام منشی کوشل تھا۔ اپنے مطالعہ کی بنا پر انہوں نے علی الاعلان یکم شوال ۱۲۶۴ھ مطابق ۱۸۴۸ء عید الفطر کے دن اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ وہ پٹیالہ کے ایک گاؤں پائل کے رہنے والے تھے۔ اس گاؤں میں شرک و بت پرستی اس قدر زوروں پر تھی کہ اسکو بنارس ثانی کہا جاتا تھا۔ اس گاؤں کے بہت سے لوگ مسلمان ہوئے۔ عبید اللہ نے عیسائیوں کے خلاف کئی مناظرانہ کتابوں کے علاوہ اسلام کی حقانیت پر تحفۃ الہند تحریر کی۔ (الحق بھٹی۔ نقوش عظمت رفتہ۔ ص ۳۵۵)

۲۷۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۱۸

۲۸۔ ایضاً ایضاً ص ۱۹

۲۹۔ ڈاکٹر محمد اکمل قادری۔ سیدی وجہی۔ رسالہ خدام دین۔ ۱۴ نومبر ۱۹۹۴ء۔ ص ۱۷

۳۰۔ محمد سرور۔ عبید اللہ سندھی۔ ص ۲۵-۲۶

۳۱۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۱۹

۳۲۔ ابوسلمان شاہجہانپوری۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ رسالہ خدام دین۔ نومبر ۱۹۹۴ء۔ ص ۸۷-۸۸

۳۳۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۲۰

۳۴۔ ایضاً ایضاً ص ۲۰

۳۵۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری۔ عبید اللہ سندھی۔ رسالہ خدام دین۔ نومبر ۱۹۹۴ء۔ ص ۹۳

باب دوم

دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند ایک عرصہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کے علم و فضل کی شناخت رہا ہے۔ یہ ہندوستان کی ان چند درسگاہوں میں سے ایک ہے جو عین سیاسی زوال کے وقت مسلمانوں کی کوشش اور عام چندے سے قائم ہوئیں۔ ایک ایسا ادارہ جس نے دینی علوم کی تعلیم و ترویج اور اشاعت کے پہلو بہ پہلو برطانوی ہندوستان میں مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی تحریکوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

کہتے ہیں کہ مدرسہ دیوبند کی حقیقی اور ظاہری تاریخ کے ساتھ اس کشفی اور الہامی مدرسہ کی ایک معنوی تاریخ بھی ہے۔ مدرسہ کے قیام سے بہت پہلے حضرت سید احمد شہیدؒ اس علاقہ سے علم نبوت کی بو آنے کی پیش گوئی کر چکے تھے۔ شیخ الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے بقول یہ مدرسہ سحرگاہی دعاؤں کا ثمرہ تھا اور یہ دیوبند کی قسمت تھی کہ اس دولت گراں قدر کو لے اڑی گئے۔ قاری محمد طیب کے خیال میں قیام مدرسہ کے سلسلہ میں سعی و کوشش کا محور اس کے بانی بزرگوں کے یہاں اسباب ظاہری نہ تھے بلکہ اسباب غیبیہ تھے اور انہیں پرانکا مدار تھا۔ ۵

مولانا حبیب الرحمن عثمانی کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ وقت کے اولیاء اللہ کے قلوب پر بیک وقت یہ الہام نازل ہوا کہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی بقا و تحفظ کی واحد صورت قیام مدرسہ ہے۔ چنانچہ ایک مجلس مذاکرہ میں کسی نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ حفظ دین و

مسلمین کے لئے اب ایک مدرسہ قائم کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ ایک مدرسہ قائم ہو۔^۸ حتیٰ کہ اس مقبول بارگاہ درسگاہ کے طلبہ کا انتخاب بھی کچھ نیبی انتخابات سے متعلق ہے۔

قاری محمد طیب کے بقول دارالعلوم دیوبند کے مسلک میں سلاسل علمیہ اور سلاسل فقیہہ کے ساتھ سلاسل صوفیہ کو بھی جمع کر دیا گیا تھا۔^۹ اس طرح یہ مدرسہ بھی تھا اور خانقاہ بھی کیونکہ انسانی زندگی کا کمال ان دونوں کے ملنے اور ساتھ چلنے سے ہی حاصل ہوتا ہے اور یہ کمال ریاضت و مجاہدات اور سلاسل تصوف سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ اس مسلک کے تحت جماعت دیوبند کے اکابر اکثر و بیشتر سلسلہ چشتیہ سے اور بہت سے اکابر سلسلہ نقشبندیہ سے وابستہ رہے ہیں۔ نقشبندیہ خاندان کا قریبی مرجع و منتہا سید احمد شہید اور چشتیہ خاندان کے لطائف حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتی ہیں۔ قاری محمد طیب کے مطابق عملی طور پر اس کا مرجع حضرت شاہ ولی اللہ کی ذات گرامی ہے۔ جن پر من جانب اللہ یہ علمی مسلک الہامی طور پر وارد شدہ ہے۔^{۱۰}

بزرگوں سے کسی ادارہ کی نسبت اس کے اعتماد کی بڑی سند ہوتی ہے۔ انقلاب زمانہ کے مدد و جزر اور جبر کے نتیجے میں جب مدرسہ رحیمیہ نے دم توڑا تو فیروز شاہ کوئلہ کی منہ علم و درس دیوبند کو منتقل ہو گئی۔ اور ایک ایسے دور میں جب ذہن پڑ مردہ، مذہبی فکر ماؤف اور دینی بصیرت عنقا تھی چند اہل دل نے اسلاف کا چراغ علم و عرفان تیز و تند ہواؤں کے درمیان روشن رکھا۔^{۱۱}

متذکرہ بالا تمام دعاوی سے قطع نظر غدر ۱۸۵۷ء کے تقریباً ۱۰ سال بعد ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو ایک استاد اور ایک شاگرد سے شروع ہونے والے اس مدرسہ کا قیام اپنی نوعیت کے اعتبار سے کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جسے وقت کا انقلابی قدم قرار دیا جاتا۔ کیونکہ اسلامی تعلیم کے لئے مدرسہ کا قیام کوئی انوکھا تجربہ نہ تھا۔ اس قسم کے مدارس فرنگی محل لکھنؤ، قنوج، بدایوں، ہاپوڑ اور شمالی ہندوستان کے دوسرے شہروں میں موجود تھے۔ جن کا تعلیمی نصاب درس نظامی تھا۔^{۱۲}

درس نظامی کا یہی روایتی نصاب اس جدید مدرسہ میں بھی اختیار کیا گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ درس نظامی کا مروجہ نصاب ہندی مسلمانوں کے دور انحطاط کا نصاب ہے۔ کیونکہ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو وہ بنیادی اصول کی بجائے سطحی امور اور اصول کی بجائے فروع پر زور دینے لگتی

۱۲۔ ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران علامہ جمال الدین افغانی نے ہندوستان میں رائج تعلیم کے قدیم نظام پر سخت تنقید کی تھی۔ ۱۳۔

یہ مدرسہ دو ایک باتوں میں اس وقت کی دوسری درسگاہوں سے ممتاز تھا۔ اس مدرسہ کے بانیوں نے انگریزی علوم کی مخالفت کی نہ ہی ان کی تائید۔ بلکہ صحیح یہ ہوگا کہ انہوں نے جدید علوم کی طرف ذہنی رجحان رکھنے کے باوجود غیر جانبدارانہ موقف اختیار کیا۔ ہر چند اسمیں سے کچھ شاہ عبدالعزیزؒ کی اس رائے سے اتفاق رکھتے تھے کہ انگریزی زبان پڑھنا جائز ہے۔ مگر انہوں نے اپنی توجہ مسلمانوں کے قدیم ورثہ پر مرکوز رکھی۔ ۱۴۔

یہ مدرسہ ابتداء ہی سے فقہ حنفی کی روشنی میں مسلمانوں کی رہنمائی کرتا رہا اور اپنے اس فقہی مسلک پر سختی سے قائم رہا۔ مدرسہ شرعی احکامات کی تعلیم و تبلیغ کے ساتھ مسلمانوں کی روحانی تربیت کا اہتمام بھی کرتا رہا بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس نے مذہبی تعلیم کا مقصد ہی روحانی تربیت اور تزکیہ نفس قرار دیا۔ ۱۵۔

مدرسہ دیوبند کی ایک امتیازی خصوصیت جو اسے اپنے معاصر یا پیش رو درسگاہوں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ ہے کہ اس کا انحصار خدا و عوام پر تھا۔ وہ سرکاری اثر و نفوذ سے یک قلم آزاد رہا اسنے اپنی بقاء کیلئے نہ صرف سرکاری امداد پر بھروسہ نہیں کیا۔ بلکہ اس امداد کو اپنے مقصد کے لئے نقصان دہ خیال کیا۔ مولانا محمد قاسم نے مدرسہ کے آٹھ بنیادی اصولوں کے ضمن میں کہا تھا کہ ”سرکار کی شرکت امراء کی شرکت سے بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے“۔ اس سلسلہ میں مدرسہ کا سب سے قیمتی سرمایہ رجوع الی اللہ ہے اس تعلق کو ہر صورت میں باقی رہنا چاہئے۔ جس دن یہ رشتہ ٹوٹ گیا اور مادی سہاروں پر اعتماد کیا گیا اس دن مدرسہ کا مشن ختم ہو جائے گا۔ ۱۶۔

مدرسہ کے مشاہیر کا سلسلہ اسناد محمد ث شاہ ولی اللہ سے چلتا ہے جن کی سند متصل بنی اکرم تک پہنچتی ہے محلہ۔ اور یہ مشاہیر شاہ ولی اللہ کی تحریک سے حاجی امداد اللہ کے واسطے سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کے دادا پیر شاہ عبدالرحیم شہید سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کے اہم رکن تھے حاجی صاحب کے مرشد اول مولانا سید نصیر الدین دہلوی کا بھی جماعت مجاہدین سے گہرا تعلق تھا۔ اس طرح جہاد کی

وہ روح جس کی تمنا میں مومن نے کہا تھا۔ ع۔

ہو الہی مجھے بھی شہادت نصیب یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

جہاد کا یہ جذبہ یہاں کے بیشتر اساتذہ کو علمی وارثت کے طور پر ملا تھا۔ مدرسہ کی فکری تاریخ سمجھنے کے لئے ۱۸ ویں صدی کے نصف آخر اور ۱۹ ویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان کی معاشرتی، سیاسی اور مذہبی سیاست پر نظر ڈالنی ضروری ہے کیونکہ ان واقعات نے اجتماعی طور پر مدرسہ کے اساتذہ اور طلباء پر گہرا اثر ڈالا۔

مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انہوں نے بحیثیت جماعت اپنی تعلیم کو ریاست کی مداخلت سے محفوظ رکھا ہے اور برصغیر ہند میں تعلیم حکومت کی مداخلت سے آزاد چلی آتی تھی۔ مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں بھی یہ آزادی قائم رہی اور ہر فرقہ کے لوگ اپنے نظام تعلیم کو اپنی مخصوص ضرورتوں اور مصلحتوں کے مطابق چلاتے رہے اور حکومت ان کے کام میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔

لیکن جب کوئی قوم اپنا سیاسی اقتدار کھو بیٹھتی ہے اور سیاسی زوال کے بعد اس پر تہذیبی زوال آتا شروع ہوتا ہے تو اس وقت تعلیم کی ضرورت بہت شدید ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سیاسی بیچارگی کے عالم میں اس کے پاس صرف تعلیمی نظام کا ہی ایک ایسا حربہ رہ جاتا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے اندر قومی روایات و خصوصیات کا احترام باقی رکھ سکتی ہے۔

مسلمانوں کی اقتصادی بے بسی مرو ریا م سے اس مقام تک آچکی تھی کہ بقول، وارن ہیسٹنگز ۱۷۸۱ء میں مسلمانوں کی ایک بڑی پڑھی لکھی تعداد نے اس سے درخواست کی کہ وہ ان کے لئے کوئی مدرسہ قائم کر دے چنانچہ اس نے کلکتہ مدرسہ قائم کیا جس کا مقصد عربی، فارسی اور اسلامی قانون کی تعلیم دینا تھا۔ ۱۷۸۱ء

تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کی پس ماندگی جہاں فکری مسائل سے ان کی بے اعتنائی پر عائد ہوتی تھی۔ وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں ان کا اقتصادی اور معاشی استحصال بھی اس کا ذمہ دار تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اقتصادی پالیسی نے جو لوٹ کھسوٹ پر مبنی تھی، اہل ہند کو بالعموم اور

مسلمانوں کو بالخصوص بہت نقصان پہنچایا۔ تعلیمی اداروں سے وابستہ جاگیریں چھین لی گئیں جس سے بقول ولیم ہنٹر مسلمانوں کی علمی زندگی نے دم توڑ دیا۔^{۱۸}

مغلوں کے دور حکومت میں انتظامی و عسکری عہدوں پر اکثر مسلمانوں کا تقرر کیا جاتا تھا۔ اب یہ دروازے ان پر بند کر دئے گئے۔ عدالتی ڈھانچہ میں بھی تبدیلیاں کی گئیں۔ اب اعلیٰ عدالتی عہدوں پر انگریز فائز تھے۔ البتہ دیہاتوں اور قصبوں میں ابھی تک مسلمان قاضی کام چلا رہے تھے۔ مسلمانوں کی زمین داریاں گو پہلے ہی ختم ہو چکی تھیں۔ لیکن ۱۷۹۳ء میں بندوبست دوا می کے نفاذ کے بعد ان کی تعداد اور بھی کم ہو گئی اب ان کی جگہ ہندو ساہوکار لے رہے تھے۔ ۱۸ویں صدی سے پہلے وہ اراضیات جن پر کوئی ٹیکس عائد نہیں تھا واپس ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ بحالی اراضی کی ان کاروائیوں سے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہونچا اور مسلمان سیاسی طور پر اپاج، اقتصادی طور پر مفلوج اور سماجی طور پر کنگال ہو کر رہ گئے کسانوں کی زمین کا خاصہ بڑا حصہ قسبات میں رہنے والے بیوں اور مہاجنوں کے نام منتقل ہوا۔ جائداد کی نیلامی کے قانون کے نفاذ سے کاشتکار اپنی اراضیات سے ہاتھ دھو بیٹھے اور زمین دار طبقہ بھی تباہ ہو گیا۔^{۱۹}

زندگی کے پرانے استحکامات ختم اور معاش کے دروازے رفتہ رفتہ مسلمانوں پر بند ہوتے گئے۔ مسلمانوں کی زندگی کا ڈھانچہ تیزی سے ایک نئے نظام کی زد میں آ رہا تھا۔ مگر فریب خوردہ شاہین سراب کو حقیقت سمجھ رہا تھا۔ مسلمان اب بھی ماضی کی دلکش فضاؤں میں رہنا چاہتے تھے۔ انکے زوال کے اسباب خود ان کے اندر پوشیدہ تھے۔ جو تدریجی طور پر نمایاں ہوتے گئے اور غیر مرئی طور پر اندر ہی اندر انکی بنیادوں کو کھوکھلا کرتے رہے۔

ہندوستان میں مسلمان جب زوال سے دوچار ہوئے تو وہ تمام شیرازے جو سخت محنت اور توجہ سے ساتھ استوار کئے گئے تھے درہم برہم ہو گئے اور یہ حالت عرصہ تک باقی رہی۔ اور صدیوں کی وہ سوسائٹی اور معاشرت جو فوجی بنیاد پر ڈھالی گئی تھی اور جس حصار سے وہ اپنا اور اپنے معاشرہ کا تحفظ کرتے تھے کلیتاً ختم ہو چکی تھی۔^{۲۰}

ہندوستان ابتداء ہی سے مختلف ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جہاں فرد واحد کو خدا کا درجہ حاصل

تھا۔ اس طرح حکومتوں نے غلامانہ مزاج، غلامانہ عادات اور غلامانہ ذہن پیدا کر دیا تھا۔ عالم اسلام میں اس مطلق عنانیت کے حامی اور وکیل ہمیشہ موجود رہے اور عوام و خواص دونوں نے اسے برداشت کرنا اپنی سرشت و خو بنالیا۔^{۲۲}

حکمران طبقہ کے لئے اپنے محدود مقاصد کے حصول کے لئے کوئی اخلاقی ضابطہ نہ تھا۔ اور جس کے لئے وہ ایسے طریقے استعمال کرتے تھے جس کے آگے میکا ولی بھی شرمسار ہوتا۔^{۲۳}

ہندوستان میں مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے لیکن یہاں اپنی حکومت اور اقتدار کے دور میں بھی کبھی کبھی انہیں اپنے ملتی وجود کی بقاء و استحکام کے لئے فکر مند ہونا پڑا تھا۔ لیکن مجموعی طور پر ایک ملت کی حیثیت سے ان کی امتیازی خصوصیات محفوظ تھیں۔ لیکن جب مغلیہ سلطنت کا انحطاط شروع ہوا جو اتنا تیز رفتار ثابت ہوا کہ جلد ہی مغلوں کے زوال کے آثار شروع ہو گئے۔ اس حالت میں برصغیر میں مسلمانوں کے سامنے پہلی بار پوری گھمبیرتا کے ساتھ اپنے ملتی تشخص کی بقا کا مسئلہ سامنے آیا اور انہوں نے فکر مندی کے ساتھ اسے حل کرنے کی کوشش کی۔^{۲۴}

مسلمانوں کا اونچا طبقہ اس وقت بھی اپنی سازشوں کی اثر انگیزی اور فرسودہ جنگی حکمت عملی پر یقین رکھتا تھا اور مذہبی ذہن رکھنے والے لوگ اپنی قوت و وقار کے لئے مذہبی اصلاحی تحریکوں سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھے۔

شاہ عالم کی وفات کے بعد جب ہندوستان کے مسلمانوں کو اس امر کا احساس ہوا کہ مغل بادشاہ ان کی حفاظت کے قابل نہیں تو اس کے بعد سے ہندوستان میں جمعہ کے خطبے میں عثمانی خلیفہ کا نام پڑھا جانے لگا۔ یہ عمل ہندوستانی مسلمانوں کے اس ذہن کی عکاسی کرتا ہے کہ وہ خود اس کے ذریعہ سے عالم اسلام سے تعلق رکھنا چاہتے تھے اور امید کرتے تھے کہ مصیبت کے وقت میں خلیفہ ان کی مدد کرے گا۔^{۲۵}

اس وقت علماء اور اشرافیہ کی بڑی تعداد ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت اور اقتدار کو اسلام اور مسلمانوں کا ایک بڑا حریف، مادی اور لادینی تحریک کا علمبردار، پورے مشرق اور ایشیا کی عزت کو خاک میں ملانے والا اور دنیا کی تہذیب و سیاست کو ایسا رخ دینے والا سمجھتے تھے جس میں روحانیت،

اخلاقت بلکہ انسانی قدروں کے پینے اور باقی رہنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ۲۶ کمپنی کے حکومت میں اثر بڑھنے کے دوش بدوش عیسائیت نے بھی فروغ پانا شروع کر دیا تھا اور وہ ہر ممکن طریقہ پر ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوشش میں لگی تھی۔ کمپنی کی تائید و اعانت سے ملک کے طول عرض میں مسیحی تبلیغ و تنظیم کے آثار قائم کئے گئے تھے۔ ۲۷

اس سلسلہ میں شاہ ولی اللہ اور ان کے صلیبی اور روحانی سلسلہ کے بزرگوں کے یہاں عملی، علمی، تہذیبی، سیاسی اور کبھی کبھی فوجی تحریکوں کا ایک مربوط سلسلہ ملتا ہے۔

علماء ایک مذہبی جماعت کی حیثیت میں ایک مدت تک برصغیر کے معرکہ ہائے نقد و نظر میں پیش پیش رہے۔ اور ایک مذہبی جماعت کی حیثیت میں اسلام اور اس کی روایتی اور تاریخی تعبیر و تشریح کے دفاع میں اپنا کردار ادا کرتے رہے اور انہیں اسلامی عقائد کے دفاع میں واحد نمائندگی کا دعویٰ بھی رہا۔ ۲۸

یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اسلام کی قانونی اور مذہبی زندگی کی تاریخ دراصل علماء کی علمی سرگرمیوں کی ایک ایسی روئیداد ہے جس میں مسلمانوں کے بحیثیت جماعت فکری اور اجتماعی خدو خال کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ۲۹ حکمرانوں کی نگاہ انتظامی، سیاسی یا فوجی امور پر رہی اور علماء شریعت کی تعبیر و تشریح کے تنہا ترجمان قرار پائے۔

انیسویں صدی کی غلامی اپنے ساتھ آزادی ذہن اور پابندی عقائد کی ایک نئی لہر بھی لائی۔ حکومت کے اشارے سے یا حکومت میں حصہ ختم ہو جانے کی بنا پر علماء کو عقائد کے اصلی اور زیادہ تر فروعی مباحث میں الجھنا پڑا۔ اب رسوم اور محافل پر بحث شروع ہو گئی۔ فقہ اسلامی کے مبادی و مباحث سامنے نہیں رہے۔ ۳۰

انگریزی حکومت کے فیصلہ کن اقتدار کے بڑھنے کا زمانہ ۱۷۴۴ء سے ۱۸۰۳ء کے درمیان ہے۔ روہیلکھنڈ میں حافظ محمد رحمت نہاں کی شکست ۱۸۱۹ء میں ٹیپو کی شہادت ۱۸۰۳ء میں دہلی سے ہریانہ تک لارڈ لیک کی فتوحات نے انگریزی حکومت کے استحکام کا دروازہ کھول دیا۔ اور مذہبی

مباحث ۱۸۰۳ء سے شروع ہو کر بڑھتے ہی چلے گئے۔ ۳۱

انیسویں صدی کے ہندوستان میں عقائد پر مباحث ۱۸ویں صدی کے مقابلہ میں زیادہ نظر آتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ مباحث سے بڑھ کر یہ اختلافات مجادلے کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ ۳۲

اخلاقی پستی کا اس دور میں یہ عالم تھا کہ ایک مسلک کا آدمی دوسرے مذہبی گروہ کے آدمی کی بیوی تک کو اغوا کرنا جائز سمجھتا تھا۔ ۳۳ ایسے لوگ موجود تھے جنہیں حضرت اسمعیل شہید کے کفر پر اصرار تھا۔ ان کے نزدیک وہابی یا وہابیہ کا کسی مسلمان سے نکاح جائز نہ تھا۔ انہوں نے اپنے زمانہ حیات میں کروڑوں مسلمانوں سے بھرے ہندوستان پر نظر ڈالی تو ڈھائی سے زیادہ مسلمان نظر نہیں آئے۔ ۳۴

ایک معروف محدث جنہوں نے دہلی میں ساٹھ سال حدیث کا درس دیا حنفیہ کو بدتر از ہنود کہتے تھے۔ تنگ نظری اور مذہبی فرقہ واریت کا یہ حال تھا کہ ایک ہی مسجد میں دو مسلک کے آدمی نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ایک گروہ پر مساجد کے دروازے بند کرنے کیلئے ”جامع الشواہد فی احراح الوہابین عن مسجد“ کے نام سے کتابیں لکھی گئیں جس پر بڑے بڑے علماء کے دستخط تھے۔ ۳۵

سید احمد شہید اور شاہ اسمعیل شہید کی کتابوں سے مسلمانوں میں فکری تبدیلی آئی۔ اس تحریک نے احیاء دینی کی روح بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں وقت کے تقاضوں سے آشنا کیا۔ قومی جذبات کو یہ کہہ کر آواز دی کہ ”تاجراں متاع فروش اور بیگانگان بعید الدیار“ سے وطن کو آزاد کرایا جائے۔ ۳۶

اس تحریک میں سب سے زیادہ وہ لوگ تھے جن کا تعلق مذہبی تبلیغ اور مساجد سے تھا جن میں مذہبی مدارس میں تعلیم دینے والے علماء بھی تھے دوسرے نمبر پر کاشتکار اور تیسرے نمبر پر سوداگر، تاجر اور دوکاندار تھے۔ شمالی ہند میں جماعت کے مالی و افرادی استعانت کے مراکز قائم تھے۔ ۳۷

ہارڈی کے تجزئے کے مطابق اس تحریک نے تعلیم یافتہ طبقہ کے علاوہ متوسط طبقہ کے ان

افراد کو متاثر کیا جو ابتدائی صنعتی سماج کا حصہ تھے۔ ۳۸

سید احمد صاحب بریلوی کی تحریک کئی لحاظ سے اس لئے اہم ہے کہ مدت دراز کے بعد مسلمانوں میں جہاد فی سبیل اللہ کا آواز بلند ہوا۔ شرعی حکومت قائم کرنیکی کوشش کی گئی۔ ہند کی ملت اسلامیہ کی زندگی میں یہ سب سے پہلا اجتماعی قدم تھا اور مسلمانوں کی پہلی قومی نوعیت کی تحریک تھی۔ مسلم بادشاہوں نے صدیوں سے جہاد کے دینی فریضے پر جہاں گیری و کشور ایشانی کا نقاب ڈالے رکھا۔ جب کسی غیر مسلم قوم سے لڑنے جاتے جہاد کا جھنڈا میدان میں لاتے۔ امیر تیمور نے ہندوستان پر تاخت کی تو بارہ مولویوں سے فتویٰ لکھوایا کہ یہاں فسق و فجور کی گرم بازاری ہے۔ حکومت سد باب نہیں کرتی ایسے مسلمانوں پر کفار کی طرح جہاد واجب ہے۔ تیمور کی اولاد میں بابر نے رانا سانگا سے لڑائی لڑی تو شراب چھوڑ کر دینی جنگ کا اعلان کیا۔ جہانگیر نے (بغیر ترک شراب نوشی ہی) اودے پور کے معرکے اور نگر کوٹ کی فتح پر یہی رنگ چڑھایا۔ ۳۹

سید صاحب محض دین کے شوق سے اٹھے اور اسی راہ میں جان سے گذر گئے۔ ان کے جہاد کا مقصد بظاہر محدود اور عملی دشواریوں کے اندازے ناقص تھے۔ ۴۰

تحریک مجاہدین کا قیام پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف عمل میں لایا گیا تھا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب بست و کشاد بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ اس تحریک سے ان کے دو مقاصد پورے ہو رہے ہیں۔ ایک یہ کہ وادی گنگ و جمن کی مسلم اشرافیہ کے ذہن پر جوش نو جوان ترک وطن کر کے ان کے لئے راہ ہموار کر رہے ہیں۔ دوسرا وہ پنجابی حکومت کے خلاف جہاد میں مصروف ہیں جس سے دونوں قومیں کمزور ہو رہی ہیں۔ ۴۱

انگریزوں نے اس تنگی سیاست سے کام لیا جو کسی کو نظر نہیں آتی۔ سکھوں کے خلاف جہاد شروع ہوا اور آخرش مسلمانوں سے دو بدو ہوئے۔ سید صاحب کے سرحد اور پنجاب پہنچنے تک وہاں انگریزوں کا نام و نشان نہ تھا۔ یہ تحریک ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی اور یہ سب انگریزوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ چونکہ تحریک انگریزوں کے خلاف نہ تھی اس لئے کمپنی نے دانستہ اغماض کیا۔ سید صاحب اپنے ۴ سور فقہاء کے ہمراہ بالا کوٹ ضلع مانسہرہ میں شہید ہو گئے اور ان کے

بقیۃ السیف ساتھی منتشر ہو گئے۔

ہندوستان کی سماجی بنیاد اساسی طور پر بہت تیزی سے بدل رہی تھی۔ مگر مسلمانوں کے مذہبی طبقہ میں معاشرہ کی تقسیم اب بھی دارالاسلام اور دارالحرب کی بنیاد پر قائم تھی اور ہر مخلص مسلمان سید احمد شہید کی اتباع میں جہاد با السیف کے خواب دیکھتا تھا۔

سرحدی محاربات کے بعد مہاجرین حکومت کی نظروں میں کھٹنے لگے اور وہاں بیت ایک خطرہ بن گئی۔ اس کو مالی امداد دینا جرم تصور کر کے بغاوت کے مقدمات قائم کئے گئے۔ اس مصیبت کے شکار شمالی ہندوستان کے مسلمان علماء اور امراء تھے جن کو وہابی کہا جاتا تھا۔ اس وہابی خطرہ کی بنا پر مسلمان جاگیرداروں، زمینداروں کی تمام املاک جو دسعت میں بنگال و بہار کی ایک چوتھائی تھی گورنمنٹ انگلشیہ نے ضبط کر لی۔^{۴۲}

مگر ان سب کے باوجود بالا کوٹ سے منتشر ہونے والوں نے اس تحریک کو کسی نہ کسی طرح جاری رکھا اور تحریک جہاد کا یہ جذبہ جماعت ولی اللہ میں زندہ رہا۔

آزادی وطن کے لئے دارالعلوم کے اکابر بالخصوص حاجی امداد اللہ مہاجر علی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے استخلاص وطن کے لئے عملی اور سر فروشانہ حصہ لیا۔^{۴۳}

جب انقلاب ۱۸۵۷ء کی تحریک اطراف و جوانب شمالی ہند خصوصاً اطراف دہلی میں چلنی شروع ہوئی تو ان حضرات میں جن کے دل میں برطانوی سامراج کی طرف سے ایک تلخ جذبہ ہمیشہ موجود رہا اور جن کو حریت و جہاد اور اسلام کی تعلیمات روحانیہ سے انتہائی شغف اور حسن اعتقاد تھا اور جو سرحد کی ناکامی اور آپس کے افتراق کی وجہ سے ہمیشہ دلگیر رہتے تھے ایک نئی حرکت پیدا ہوئی۔ اور ان بزرگوں نے محسوس کیا کہ اس انقلاب میں حصہ لینا فرض اور لازم ہے۔^{۴۴}

بالا کوٹ کی چنگاری جوان بزرگوں کے رگ و پے میں موجزن تھی اس سے شاملی کا شعلہ بھڑکا۔ شاملی قافلہ مجاہدین کی دوسری منزل تھی۔^{۴۵}

چونکہ اطراف و جوانب میں ان حضرات کے تقویٰ، علم تصوف و تشرع کا بہت شہرہ تھا اور ان

حضرات کے اخلاص اور لٹہیت سے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے۔ ہمیشہ سے ان کی دینداری اور خدا ترسی دیکھتے رہتے تھے اس لئے ان پر بہت زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ علاوہ مریدین اور تلامذہ کے عام مسلمان بھی بے حد معتقد تھے اس لئے بہت تھوڑی مدت میں جوق در جوق لوگوں کا اجتماع ہونے لگا۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہونے لگے تھانہ بھون کے اجتماع میں حاجی امداد اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کو امیر مقرر کیا گیا۔ تھانہ بھون کے اطراف میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ انگریزی عملدار نکال دئے گئے اور انگریزی حکومت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا گیا۔ حاجی صاحب نے قصبہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دیوانی و فوجداری کے جملہ تنازعات شرعی فیصلہ کے مطابق قاضی شرع بن کر فیصل بھی فرمائے۔ حاجی محمد ضامن کو جماعت مجاہدین کا قائد بنایا گیا۔ جنگی زیر قیادت شاملی کی تحصیل پر حملہ کیا گیا اور اس کو آگ لگا دی گئی۔ تحصیل پر قبضہ ہو گیا مگر حافظ محمد ضامن علی اس حادثہ میں شہید ہو گئے۔ ۱۹۶۱ء حافظ صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ سرد پڑ گیا۔ مولانا حسین احمد مدنی کے مطابق ”شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام معاملہ جوش و خروش اور جنگ و جدال کا حضرت محمد ضامن صاحب کی شہادت کے لئے کیا گیا تھا“۔ ۱۹۶۱ء قصبہ تھانہ بھون اور اس کے اطراف وجوانب کے وہ مقامات جن کی شکایت کسی دشمن نے کردی برباد کر دئے گئے۔ ۱۹۶۸ء

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جو اثرات نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک مسلم تجد و پسندی کی ابتداء تھی۔ کیونکہ جنگ آزادی سے پہلے ہر جگہ مسلمان اپنی تہذیب و ثقافت کو ارفع و اعلیٰ سمجھتے تھے اور انگریزوں نے ان کی سلطنت پر جو قبضہ کر رکھا تھا اسے وہ غم و غصہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ۱۹۶۹ء

غدر نے برصغیر پر اپنے جو اثرات چھوڑے اس میں انگریزی حکومت کے استحکام کے منفی پہلو کے ساتھ ساتھ اس کا زبردست افادی پہلو بھی تھا جس کے بارے میں کارل مارکس نے کہا تھا کہ غیر شعوری طور پر اس غدر نے ہندوستان میں ایک تاریخی کارنامہ بھی انجام دیا جس کی وجہ سے ہندوستانی عوام کے ایک طبقہ میں صدیوں سے چلی آرہی روایات سے بغاوت کا رجحان پیدا ہوا۔ مادیت اور عقلیت جیسی قدروں سے رغبت پیدا ہوئی۔ اس ہنگامہ دار و گیر کے بعد ہی ہندوستان میں جدید خیالات اور رجحانات کو واضح طور پر پنپنے اور سنورنے کا موقع ملا۔ ۱۹۷۰ء

مگر مسلمانوں کا رویہ انگریزوں سے محاصمانہ اور بیزارى کا تھا۔ انہوں نے انگریزى زبان کو نظر انداز کر دیا اور انگریزى زبان کی بدولت برصغیر میں جو آزادانہ افکار و نظریات درآئے تھے انہوں نے اس سے کنارہ کشى اختیار کر لی۔

نئی زندگی کے رجحانات سے مسلمانوں کا کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ان میں خود اتنى طاقت تھی کہ دوسرے رجحانات کے ساتھ چل سکیں یا ان کا مقابلہ کر سکیں۔

ملک کے اس سیاسى پس منظر کے ساتھ جب ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو مدرسہ دیوبند قائم ہوا تو مدرسہ کے صدر مدرس مولوی محمد یعقوب علی حکومت وقت کے بڑے ہی خواہ تھے۔ صدر مدرسى قبول کرنے سے قبل وہ اجمیر کالج میں استاد کے علاوہ انگریزى حکومت کے تحت بنارس، بریلی اور سہارنپور میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ ۱۵ اور محکمہ تعلیم کے جدید انداز، نظام اور طریق کار سے بخوبى واقف تھے۔ ۵۲

مدرسہ سے وابستہ کئی دوسرے افراد بھی انگریزى حکومت سے وابستہ رہ چکے تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے والد مولوی ذوالفقار علی م (۱۹۰۴ء) ایک عرصہ تک بریلی کالج میں مدرس رہے پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس بنائے گئے۔ مولانا شبیر احمد عثمانى کے والد مولوی فضل الرحمن بھی انگریزى حکومت کے ملازم رہ چکے تھے۔ چنانچہ حکومت وقت نے بھی مدرسہ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ بلکہ ایک خفیہ سرکاری رپورٹ میں کہا گیا کہ یہاں کے لوگ تعلیم یافتہ نیک چلن اور نہایت سلیم الطبع ہیں۔ ۵۳

مدرسہ دیوبند نے یو مانیو ماً ترقى کی۔ کیونکہ مسلمانوں کا متوسط طبقہ جس میں مذہبى جوش زیادہ تھا انگریزى تعلیم سے متنفر تھا۔ یہ طبقہ دارالعلوم دیوبند اور دوسرے عربى مدارس کی طرف منتقل ہو گیا۔ ۳۱ جنوری ۱۸۷۵ء کو گورنر اسٹریچی کے ایک خاص معتمد مسٹر پامرنے اس مدرسہ کو دیکھا تو نہایت اچھے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپیہ کے صرفہ سے ہوتا ہے وہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے۔ جو کام پرنسپل ہزاروں روپیہ لے کر کرتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپیہ ماہوار پر کر رہا ہے۔ مدرسہ خلاف سرکار نہیں بلکہ موافق و معاون سرکار ہے۔ ۵۴

مدرسہ شروع میں مدرسہ اسلامى عربى دیوبند کے نام سے موسوم رہا اور جب ملک مین جا بجا

اس کی شاخیں قائم ہو گئیں اور عام طور پر اس کی تعلیم کو مفید مان لیا گیا اور علمی حلقوں میں اس کی مرکزیت تسلیم کی جانے لگی تو ۱۳ سال کے بعد دارالعلوم کہا جانے لگا۔ ۵۵ مدرسہ کے بانیوں اور بالخصوص مولانا محمد قاسم نے اپنا تخیل شروع سے بلند رکھا اور مدرسہ کی بنیادیں اس قدر وسیع اور بلند رکھیں کہ ان پر ایک دارالعلوم کی عمارت تعمیر ہو سکے۔ مدرسہ دیوبند کا نام عوام میں مولانا محمد قاسم کے نام سے انتساب ہے۔ وہ مدرسہ کے اصل بانی نہیں تھے۔ مگر مدرسہ کو ایک دارالعلوم بنانے کا خیال انہیں کا تھا۔ انہیں زندگی سے جو وقت مستعار ملا تھا اس کا بھی بہت سا حصہ مناظروں اور دوسرے ہنگاموں میں خرچ ہوا۔ تصنیف و تالیف کی انہیں کبھی صحیح طور پر فرصت ہی نہیں ملی۔ چند رسائل ان کی یادگار ہیں ان میں عالمانہ نہیں مناظرانہ رنگ غالب ہے۔ لیکن مسلمانوں کی علمی تاریخ میں ان کا مقام بلند ہے۔ ۵۶

مدرسہ دیوبند کا پہلا دور مولانا رشید گنگوہی کی وفات پر ختم ہوتا ہے جو صرف علمی تحریک کی توسیع اور مرکزی فکر کی حفاظت کیلئے مخصوص رہا۔ ۵۷

دارالعلوم کے عطیہ دہندگان میں غیر مسلم معطیان کے نام بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ دارالعلوم کے ابتدائی سالوں میں فارسی اور ریاضی کے درجات میں ہندو بچوں کی تعلیم کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ ۵۸

مدرسہ دیوبند کی ایک امتیازی حیثیت جو اسے اپنے معاصر پیش رو درسا گاہوں سے ممتاز کرتی تھی وہ خدا اور عوام پر اس کا انحصار تھا۔ وہ سرکاری اثر و نفوذ سے یکسر آزاد رہا اس نے اپنی بقاء کے لئے صرف سرکاری امداد پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ اس امداد کو نقصان دہ خیال کیا۔ ۵۹

۳ مئی ۱۸۶۶ء کو جب دارالعلوم کا افتتاح عمل میں آیا تو سب سے پہلے طالب علم مولانا محمود حسن تھے۔ فراغت کے اگلے ہی برس ۱۸۷۴ء میں انہیں اعزازی مدرس مقرر کیا گیا اور اگلے سال مدرس چہارم کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ۱۸۸۳ء میں مدرس سوئم اور دو سال بعد انہیں مدرس دوئم بنایا گیا۔ ۱۸۸۷ء میں مولانا سید احمد دہلوی کے دارالعلوم چھوڑنے پر مدرس اول مقرر کیا گیا۔ ۱۹ مولانا محمد یعقوب اور مولانا سید احمد کے بعد دارالعلوم کی مسند صدارت اور شیخ الحدیث کے عہدہ پر فائز ہوئے اور جب

مدرسہ کے سرپرست مولانا رشید احمد گنگوہی کا انتقال ہوا تو مذہبی اور روحانی مرجعیت انہی کو حاصل ہوئی۔ ۶۲۔ مولانا محمد الحسن مدرسہ کی صدارت پر ۴۰ سال فائز رہے۔ مدرسہ کے فارغین کی تین نسلیں انہی کی شاگرد ہیں۔ تدریس اور اہتمام پر ان کی شخصیت ہمیشہ حاوی رہی۔ ۶۳۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے احیاء اسلامی کی جدوجہد میں مولانا محمود الحسن کو ایک مجدد کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور شیخ الہند کے تلامذہ کی نابغہ روزگار جماعت کو شیخ کا ایک تجدیدی کارنامہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ شیخ کے شاگردوں نے گذشتہ صدی کی دینی اور سیاسی جدوجہد کے ہر میدان میں قائدانہ رول ادا کیا ہے۔ ۶۴۔

حضرت شیخ الہند اپنی عملی زندگی کے آغاز میں ہی ایک نقشہ عمل تیار کر چکے تھے۔ اور اس کو عملی لباس پہنانے کی کوشش انہوں نے اس وقت سے شروع کر دی تھی جب ہندوستان کے اندریسی سرگرمیاں برائے نام تھیں۔ ۶۵۔ انہوں نے اپنی تحریک کی ابتدا درس و تدریس سے کی۔ دوران درس جن تلامذہ میں صلاحیت پاتے تعلیم علوم کے ساتھ ساتھ اس کی سیاسی تربیت بھی کرتے جاتے تھے۔ ایک عرصہ تک اس طرح کام کرنے کے بعد جب ملک کے اطراف و جوانب میں تلامذہ کی ایک جماعت منظم طور پر کام کو آگے بڑھانے کے لئے تیار ہو گئی تو جمعیت الانصار کی داغ بیل ڈالی اور پھر دہلی میں مولانا عبید اللہ سندھی کے ذریعہ نظارۃ المعارف کے عنوان سے درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا اور اس طرح سے ملک کے ذہین، بیدار مغر، متحرک اور فعال افراد پر مشتمل ایک جماعت اپنے گرد جمع کر لی اور پھر انہی کے واسطے سے تحریک کا جال پورے ملک میں بچھا دیا۔ ۶۶۔ حضرت شیخ الہند حزب ولی اللہی کے ایک رکن اور ان کی تحریک درحقیقت حزب ولی اللہی کی ایک کڑی ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کا کہنا ہے کہ میں دارالعلوم کے نائب مہتمم مولانا حبیب الرحمن کے فرستارہ کی حیثیت سے حضرت الاستاذ شیخ الہند کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور بطور پیغام رساں حضرت سے دریافت کیا کہ آپ کا سیاسی مسلک کیا ہے۔ شیخ الہند نے فرمایا کہ ”حضرت الاستاد مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس، تعلیم و تعلم کے لئے قائم کیا تھا۔ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا

تھا تاکہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۷۱ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔“ آخر میں ارشاد فرمایا کہ۔ ”صرف تعلم و تعلیم جن کا مقصد اور نصب العین ہے۔ میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں لیکن اپنے لئے تو اسی راہ کا انتخاب کیا ہے جس کے لئے دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاد نے قائم کیا تھا۔“ ۱۸۷۱ء چنانچہ حضرت نے احاطہ مدرسہ میں طلباء کو فنون سپہ گری سکھانے کا بندوبست بھی فرمایا تاکہ علم کے ساتھ سپاہیانہ اسپرٹ بھی انہیں قائم رہے۔ محکمہ قضاء بھی قائم فرمایا تاکہ تنقید احکام شرعیہ کی خوبھی ان میں محفوظ رہے۔ ترکوں کی امداد کیلئے بھی مساعی فرمائیں۔ انگریزی تسلط کے خلاف ایسی اجتماعی انجمنوں کی حمایت و تائید بھی کی جو انگریزوں سے ملکی حقوق حاصل کرنے کے لئے قائم کی گئیں تھیں۔ ۱۸۷۱ء

حضرات اساتذہ کے حلقہ میں حضرت شیخ الہند کا یہ مقولہ مشہور تھا کہ فرنگی سے نفرت جزا ایمانی ہے۔ ۱۸۷۱ء کہا جاتا ہے کہ جب مولانا محمود حسن سے ۱۹۱۹ء کی تحریک ترک موالات کے متعلق سوال پوچھا گیا تو آپ نے مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی کو بلا کر کہا۔ یہ فتویٰ آپ لوگ لکھیں۔ اسلئے کہ انگریزوں سے نفرت کا جذبہ مجھ میں شدت لئے ہوئے ہے۔ مجھے اپنے نفس پر اعتماد نہیں کہ حدود کی رعایت ہو سکے۔ ۱۸۷۱ء

برطانوی حکومت نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف ایک اعصابی جنگ شروع کر دی تھی۔ اس بنا پر ہندوستانی مسلمانوں میں بہت جوش تھا کیونکہ وہ خلافت عثمانیہ کو اسلام کا پشت پناہ سمجھتے تھے۔

حضرت شیخ الہند نے ایک مستقل مکان اپنے مکان کے قریب کرایہ پر لے رکھا تھا جس میں ان کے ہم خیال غیر مسلم حضرات اور فقائے انقلاب بہت رازدارانہ طور پر ٹہرائے جاتے تھے۔ اور خدام خاص بہت احتیاط اور رازداری سے ان کے طعام وغیرہ کا اہتمام کرتے۔ حضرت شیخ الہند اکثر تنہائی کے اوقات میں یا رات کو ان سے ملاقات فرماتے۔ یہ لوگ سکھ یا بنگالی ہندو ہوتے تھے۔ ان ملاقاتوں میں رازداری کا بے حد خیال رکھا جاتا تھا اس لئے مولانا حسین احمد مدنی کے مطابق ان کے نام اور پتے محفوظ نہیں۔ ۱۸۷۱ء

شیخ الہند نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بیرونی ممالک میں اپنے خفیہ مشن بھیجنے کا

سلسلہ بھی شروع کیا تھا۔ جس طرح شیخ نے یاغستان اور افغانستان میں اپنے مخلصین کے ذریعہ تحریک جہاد کو پھیلا یا تھا اسی طرح چین و برما تک بھی اپنے کارکنوں کو پہونچایا تھا۔ چنانچہ مولانا مقبول الرحمن سرحدی اور شوکت علی بنگالی بی اے کی رہنمائی میں ایک مشن چین بھیجا گیا۔ مقبول الرحمن انگریزی و چینی زبانوں سے واقف تھے یہ وفد چھ ارکان پر مشتمل تھا جس میں ہندو مسلم دونوں شامل تھے۔ اس وفد نے سیرت کمپنی کے نام سے اپنا کام شروع کیا اور ایک ماہنامہ ”الیقین“ کے نام سے اردو و چینی زبان میں جاری کیا۔ اس مشن کو جب چین میں کامیابی ہوئی تو اس مشن کو برما بھیجا گیا۔ برما میں مقبول الرحمن نے ”الانسان“ کے نام سے ایک عربی کتاب تصنیف کی جس کا ترجمہ شوکت علی نے برمی اور انگریزی میں کیا۔ اس کتاب میں برطانوی سامراج کے مظالم اور استحصال پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ یہ مشن ۱۹۱۵ء تک اپنا کام کرتا رہا۔ مولانا مقبول الرحمن اپنے اخراجات طب یونانی اور شوکت علی ایلوپیٹھی علاج کے ذریعہ پورا کرتے رہے۔ برما میں بھی اس مشن کو کامیابی ہوئی۔ ۲۷

نومسلم عبید اللہ صفر ۱۳۰۶ھ کو دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ تخمیناً ۵ ماہ میں منطق کے رسائل مختلف اساتذہ سے اور شرح جامی حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی ایک فاضل استاد کی مدد سے مطالعہ کا طریقہ سیکھ لیا۔ منطق و فلسفہ کی کتابیں جلد ختم کر کے چند ماہ کانپور میں مولانا احمد حسن کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی اور چند ماہ رامپور میں مولانا ناظر حسن کے سامنے زانوادب تہہ کیا اور پھر ۱۳۰۷ء میں دیوبند واپس آ گئے۔ ۳۷

دیوبند میں ابتدائی دو تین مہینے مولانا حافظ احمد صاحب کے زیر تعلیم رہے۔ اس کے بعد حضرت شیخ الہند کے درس میں شامل ہو گئے۔ ۱۳۰۷ھ کو ہدایہ، تلخیص مطول، شرح عقائد، مسلم الثبوت میں امتحان دیا اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوئے۔ مولانا سید احمد دہلوی مدرسہ اول نے ان کے جوابات کی بہت تعریف کی اور فرمایا کہ اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبدالعزیز ثانی ہوگا۔ ۳۷

شوال ۱۳۰۷ھ سے بیضاوی کے دورہ حدیث شریف میں شریک ہوئے۔ جامع ترمذی مولانا شیخ الہند سے پڑھی اور ابوداؤد کے لئے حضرت رشید احمد گنگوہی صاحب کی خدمت میں گنگوہ پہونچے۔ حدیث کی باقی کتابیں دہلی میں مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد کے ایک

غیر معروف محقق شاگرد مولوی عبدالکریم پنجابی سے پڑھیں۔ اثناء قیام دہلی میں دودفعہ مولانا نذیر حسین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں دودو سبق لئے۔ ۵۷
درسیات سے فراغت پا کر ۲۰ جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ کو دہلی سے بھرچوٹڈی کے لئے روانہ ہو گئے۔

مآخذ و حواشی

۱۔ دارالعلوم کے بانی حاجی سید عابد حسین ایک بار چلے میں تھے کہ آپ نے جمعہ کی شب رسول اکرم کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے حاجی صاحب کو حکم دیا کہ یہاں ایک عربی مدرسہ دین اسلام کی بقاء اور ترویج کے لئے قائم کیا جائے۔ (دارالعلوم کا بانی کون ڈاکٹر یحییٰ انجم ص ۲۶)

۲۔ قاری محمد طیب۔ مقدمہ تاریخ دارالعلوم۔ ص ۱۱

۳۔ قاری محمد طیب۔ مقدمہ تاریخ دارالعلوم۔ ص ۱۱

۴۔ سید اشتیاق اظہر۔ فخر العلماء مولانا فخر الحسن۔ ص ۳۵

۵۔ قاری محمد طیب۔ دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ تاریخ۔ ص ۱۵

۶۔ ایضاً ایضاً ص ۵۱

۷۔ حاجی رفیع الدین خلیفہ خاص حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی مہاجر مدنی نے خواب میں دیکھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک مدرسہ قائم فرمایا ہے۔ اس مدرسہ میں

ایک طالب علم سے حاجی رفیع الدین کی ملاقات ہوئی۔ دارالعلوم قائم ہونے کے کچھ عرصہ بعد جب وہ دارالعلوم کے مہتمم بنائے گئے تو آپ نے ایک روز ایک طالب علم کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ وہی طالب علم ہیں جن کو میں نے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مدرسہ میں دیکھا تھا۔ (فخر العلماء مولانا فخر الحسن گنگوہی کی سوانح۔ سید اشتیاق اظہر۔ ص ۳۶)

۸۔ قاری محمد طیب۔ دیباچہ تاریخ دارالعلوم مصنفہ سید محبوب رضوی۔ ص ۳۲

۹۔ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص ۲۸

۱۰۔ خلیق احمد نظامی۔ مولانا حسین احمد مدنی حیات و کارنامے۔ مرتبہ رشید احمد الوحیدی۔ ص ۵۱

۱۱۔ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری۔ برطانوی ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم، دارالعلوم دیوبند۔ ص ۱۲۰

۱۲۔ ڈاکٹر بختیار حسین صدیقی۔ برصغیر پاک و ہند کے قدیم عربی مدارس اور ان کا نظام تعلیم۔ ص ۲۳

۱۳۔ قاضی عبدالغفار۔ آثار جمال الدین افغانی۔ ص ۱۳۴

۱۴۔ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری۔ دارالعلوم دیوبند۔ ص ۱۲۰

۱۵۔ قاری محمد طیب۔ مقدمہ تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ سید محبوب رضوی۔ ص ۱۸-۱۷

۱۶۔ رشید احمد جالندھری۔ برطانوی ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم۔ ص ۱۲۲

۱۷۔ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری۔ برطانوی ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم۔ ص ۹۶

۱۸۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۹۷

۱۹۔ ڈاکٹر عبدالکریم۔ نواب عبداللطیف اور بنگالی مسلمانوں کی حالت فکر و نظر ۱۹۷۱ء۔ ص ۶۴

۲۰۔ محمد عزیز احمد۔ اسلامی سیاسی فکر میں شریعت کی اہمیت۔ ڈاکٹر اشتیاق احمد قریشی یادگاری مجلہ۔ ص ۳۰

۲۱۔ چودھری خلیق الزماں۔ شاہراہ پاکستان۔ ص ۲۸۹

۲۲۔ عبدالکریم عابد۔ مسلمانوں کا زوال کیوں۔ روزنامہ جسارت

۲۳۔ ڈاکٹر تارا چند۔ تاریخ تحریک آزادی ہند۔ جلد ۲۔ ص ۴۵

۲۴۔ ڈاکٹر عبدالکریم۔ نواب عبداللطیف اور بنگالی مسلمانوں کی حالت فکر و نظر ۱۹۷۱ء۔ ص ۶۴

- ۲۵۔ ڈاکٹر مبارک علی۔ مسلمان حکمران اور خطبہ۔ المعارف لاہور جولائی ۱۹۹۰ء۔ ص ۲۶
- ۲۶۔ سید ابوالحسن علی ندوی۔ سید حسین احمد مدنی حیات و کارنامے۔ مرتبہ رشید الوحیدی۔ ص ۳۸
- ۲۷۔ قاری محمد طیب۔ مقدمہ تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول، سید محبوب رضوی۔ ص ۱۱۷
- ۲۸۔ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری۔ برطانوی ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم۔ ص ۶
- ۲۹۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۷
- ۳۰۔ سید فرخ علی جلالی۔ سرسید کے دینی افکار و عقائد۔ مقدمہ تفسیر سرسید۔ مرتبہ عابد رضا بیدار۔ ص ۱۴۵
- ۳۱۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۴۵
- ۳۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۴۵
- ۳۳۔ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری۔ دیوبند۔ ص ۱۴۶
- ۳۴۔ عبدالرزاق ملیح آبادی۔ آزاد کی کہانی۔ ص ۱۲۱
- ۳۵۔ رشید احمد جالندھری۔ دیوبند۔ ص ۱۴۶
- ۳۶۔ خلیق احمد نظامی۔ سید حسین احمد مدنی حیات و کارنامے۔ مرتبہ رشید الوحیدی۔ ص ۶۷
- ۳۷۔ معارف لاہور فروری ۱۹۸۲ء۔ ص ۲۹
- ۳۸۔ سید سبط حسین ضیغم۔ تحریک مجاہدین اور برطانوی ریکارڈ۔ رسالہ جامعہ۔ ص ۲۹
- ۳۹۔ مطلبی ہاشمی فرید آبادی۔ سید احمد کی تحریک۔ رسالہ تاریخ و سیاست فروری ۵۳ء۔ ص ۵
- ۴۰۔ حافظ محمود شیرانی۔ مکاتیب شیرانی۔ ص ۲۳۸
- ۴۱۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ برصغیر ہند و پاک کی ملت اسلامیہ۔ ص ۲۶۸-۲۶۹
- ۴۲۔ سر عبدالرحیم۔ خطبہ صدرات مسلم لیگ۔ ۱۹۲۵ء۔
- ۴۳۔ قاری محمد طیب۔ مقدمہ تاریخ دارالعلوم۔ سید محبوب رضوی۔ ص ۵۰۹
- ۴۴۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات جلد دوم۔ ص ۴۲
- ۴۵۔ خلیق احمد نظامی۔ سید حسین احمد مدنی۔ حیات و کارنامے۔ ص ۶۷

- ۴۶۔ حسین احمد مدنی۔ نقش حیات جلد دوم۔ ص ۴۳
- ۴۷۔ دارالعلوم دیوبند کا حصہ تحریک آزادی میں۔ مولانا سید حسین احمد سیمینار۔ ص ۵۱
- ۴۸۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ نقش حیات۔ جلد دوم۔ ص ۴۴-۴۵
- ۴۹۔ ڈاکٹر معین الدین خاں۔ نواب عبداللطیف۔ فکر و نظر۔ اسلام آباد۔ مارچ ۱۹۶۸ء۔ ص ۶۸۳
- ۵۰۔ فیروز احمد۔ احسان اللہ عباسی حیات و کارنامے۔ ص ۲۱
- ۵۱۔ محمد ایوب قادری۔ مولانا احسن نانوتوی۔ ص ۱۹۲ء
- ۵۲۔ شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر۔ ص ۲۰۶
- ۵۳۔ محمد ایوب قادری۔ مولانا احسن نانوتوی۔ ص ۲۱
- ۵۴۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۲۱
- ۵۵۔ ڈاکٹر رشید جالندھری۔ دیوبند۔ ص ۱۸۸
- ۵۶۔ شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر۔ ص ۲۲۰
- ۵۷۔ ایضاً ایضاً۔ ص ۲۲۰
- ۵۸۔ سید اشتیاق اظہر۔ فخر العلماء سید فخر الحسن۔ ص ۵۶
- ۵۹۔ رشید احمد جالندھری۔ دارالعلوم دیوبند۔ ص ۱۲۲
- ۶۰۔ سید احمد دہلوی۔ قیام دارالعلوم کے تیسرے سال (۱۸۶۸ء) میں مدرس دوم کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ مولانا محمد یعقوب کے سبکدوش ہونے کے بعد مدرس اول مقرر ہوئے جس پر چھ سال تک فائز رہے۔ منقولات کے علاوہ علوم معقولہ خصوصاً ریاضی میں بہت درک تھا۔ ۱۸۸۵ء میں دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کی۔
- ۶۱۔ ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ مولانا محمود حسن۔ ص ۲۳
- ۶۲۔ ایضاً۔ ایضاً۔ ص ۲۳
- ۶۳۔ باربرا ڈالی مکاف۔ برطانوی ہند میں اسلامی احیاء دیوبند ۱۹۰۰ء-۱۸۶۰ء۔ ص ۱۰۸

- ۶۴۔ محمود احمد برکاتی۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان۔ ص ۲۹۔
- ۶۵۔ سید محمد میاں۔ تحریک شیخ الہند بحوالہ سرگزشت مجاہدین۔ ص ۲۹
- ۶۶۔ قاری محمد طیب۔ مقدمہ تاریخ دارالعلوم۔ مرتبہ سید محبوب رضوی۔ ص ۴۴
- ۶۷۔ مناظر احسن گیلانی۔ سوانح قاسمی جلد دوم۔ ص ۲۲۶
- ۶۸۔ سید محمد میاں۔ تحریک شیخ الہند۔ ص ۳۵
- ۶۹۔ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری۔ دارالعلوم دیوبند۔ ص ۱۷۶
- ۷۰۔ سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات حصہ دوم۔ ص ۲۰۷
- ۷۱۔ ایضاً ایضاً ص ۲۱۵
- ۷۲۔ قاضی زاہد الحسنی۔ بھوپال تحریک آزادی کے آئینہ میں۔ ص ۲۵۵
- ۷۳۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۲۰-۲۱
- ۷۴۔ ایضاً ایضاً ص ۲۱
- ۷۵۔ ایضاً ایضاً ص ۲۲

باب سوم

سندھ کی طرف مراجعت

عبید اللہ سندھی کو سندھ سے جو وابستگی تھی۔ اس کے نتیجہ میں فراغت تحصیل علوم کے بعد جب وطن کی طرف مراجعت کی تو سیدھے بھر چونڈی تشریف لے گئے۔ مگر ان کے پہونچنے سے دس دن قبل ہی ان کے مرشد حافظ محمد صدیق صاحب جو ان کے لئے بمنزلہ باپ کے تھے دنیا سے رحلت فرما گئے تھے۔ جس کا ظاہر ہے انہیں بے حد صدمہ ہوا۔ مگر ان کے لئے یہ امر باعث تسکین تھا کہ ان کے مرشد اپنے آخری ایام میں بھی ان کی طرف سے غافل نہیں تھے۔ اپنی وصیت میں انہوں نے اپنے دو خلفاء مولانا غلام محمد دیپوری اور مولانا تاج محمود امروٹی کو عبید اللہ کی دیکھ رکھ کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ سلوک کی تعلیم مولانا دیپوری کے ذمہ تھی اور مادی وسائل کا ذمہ دار تاج محمود کو قرار دیا گیا تھا۔ حافظ صاحب کے دونوں خلفاء غلام محمد دین پوری اور مولانا تاج محمود امروٹی بھر چونڈی میں موجود تھے۔ مولانا سندھی کو حضرت دین پوری نے اپنی بیعت میں لیکر طریقہ قادریہ میں داخل کیا۔ اور حضرت امروٹی مزید تربیت کے لئے ان کو اپنے ہمراہ امروٹ ضلع سکھر لے گئے۔ مولانا امروٹی نے عبید اللہ سے اپنے مرشد کے تعلق خاطر کا خیال رکھتے ہوئے ان کے قیام کے لئے تمام وسائل مہیا کئے۔ اور انہی کی محبت کی بنا پر عبید اللہ نے امروٹ میں مستقل قیام کا فیصلہ کرنے کے بعد اپنی علمی اور سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا۔ امروٹ میں مولانا امروٹی کا بڑا کتب خانہ تھا۔ مولانا سندھی نے اس سے

خوب استفادہ کیا۔ اس کتب خانہ کے علاوہ سندھ کے بعض دیگر کتب خانوں کی بھی سیر کی۔^۵

مولانا مروٹی نے سکھر کے اسلامیہ اسکول کے استاد مولوی محمد عظیم یوسف زئی کی بیٹی سے ان کی شادی کرادی۔^۶ اب تک انہوں نے اپنی والدہ سے کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔ کیونکہ ان کے خیال میں وہ کافرہ تھی۔ مگر اپنے استاد حضرت شیخ کے اس ارشاد کے بعد کہ ماں کی خدمت فرض ہے چاہے وہ کافرہ ہی کیوں نہ ہو۔ انہوں نے اپنی والدہ کو بلوایا جو آخر تک سکھ مت پر قائم رہتے ہوئے ان کے ہمراہ رہیں۔^۷

جس وقت مولانا سندھی نے مروٹ کو مستقل مستقر بنا کر اپنی علمی اور سیاسی زندگی کا آغاز کیا اس وقت سندھ زندگی کے ہر میدان میں بہت پیچھے تھا۔^۸ مسلم اکثریت کے اس صوبہ کا صوبہ بمبئی سے الحاق کے بعد آبادی کا تناسب بدل گیا تھا۔ مسلمانوں کی اوسط آبادی تین فیصد ہو گئی تھی۔^۹ مسٹریس ایچ کورنٹس نے اپنی ایک تحقیقاتی رپورٹ میں بتایا تھا کہ ”سندھ میں ۱۹۰۵ء سے لیکر چند ہی سال میں پونے پانچ لاکھ ایکڑ زمین ہاریوں اور زمینداروں کے ہاتھ سے نکل کر ہندو سیٹھوں کے ہاتھوں میں جا چکی تھی۔ معاشی طور پر مسلمانوں کی یہ حالت تھی تو مذہبی طور پر بھی وہ ہندوؤں کے ہاتھوں ہمدھی ہوتے رہتے ہیں وقت کے بے رحم ہاتھوں نے مسلمانوں کو اس قدر تباہ کر دیا ہے کہ ان کے جسموں کی توانائی ختم ہو گئی ہے مسلمانوں کے جسم اب ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے ہیں کہ ذرا سے دھلے سے منہ کے بل ایسے گریں گے کہ قیامت تک اٹھنا نصیب نہ ہوگا۔“

سیاسی لحاظ سے سندھ تقریباً عضو معطل تھا۔ کراچی کے علاوہ پورے صوبہ میں کہیں سیاسی شعور نہ تھا۔ علمی اور ادبی لحاظ سے سندھ برطانوی ہند کے دوسرے صوبوں مقابلہ میں صفر تھا۔ جو اسکول قائم تھے وہ صرف شہروں تک محدود تھے۔ دیہاتیوں کے لئے ان سے استفادہ کرنا مشکل تھا۔ پریس اور نشر و اشاعت کے دوسرے ذرائع پر غیر مسلم دانشوروں کا قبضہ تھا۔ پورے صوبہ میں کوئی مرکزی دینی درسگاہ نہ تھی۔ بعض قصبات میں چھوٹے چھوٹے دینی مدارس تھے جنکا آپس میں کوئی ربط نہیں تھا۔ ان کا نصاب فرسودہ تھا جس میں کوئی تبدیلی ممکن نہ تھی۔ اور اس نصاب کے ذریعہ دینی مدارس کے

طلبہ میں کسی قسم کی ذہنی بیداری لانا ناممکن تھا۔ سندھ میں ولی اللہی تحریک و سلسلہ کے فروغ کے لئے ضرورت اس امر کی تھی کہ پہلے ایک مدرسہ قائم کر کے ہم فکر علماء پیدا کئے جائیں۔ اس کے بعد ہی آئندہ سیاسی یا مذہبی کام کے نشوونما کا فروغ ممکن تھا۔^{۱۰}

شیخ الہند کی ہدایت پر مولانا سندھی نے امرٹ میں پہلے ایک درسگاہ قائم کی۔ جسکو دیوبند کے خطوط پر منظم کر کے دیوبند کے نصاب کو رائج کیا گیا۔ مگر نصاب میں علوم نقلیہ و عقلیہ کے ساتھ ساتھ شاہ ولی اللہ کی تصانیف کو بھی شامل کیا گیا تھا۔^{۱۱} عبید اللہ نے پڑھا تو تھا ایک علمی فریضہ سمجھ کر سچے دل اور پورے خلوص سے اور اب پڑھاتے تھے تو ثواب کا کام سمجھ کر۔

اس درسگاہ میں فکری جلا پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ اور طلبہ میں حریت وطن اور احیاء دین قیم کی روح پیدا کرنے کی پوری کوشش ہوتی تھی۔ تو حید و جہاد یہ دو چیزیں تھیں جن پر طلباء کو تعلیم دیتے وقت خاص زور دیا جاتا تھا۔^{۱۲}

اس درسگاہ کے اساتذہ میں الحاج مولانا عبدالعزیز تھریچا نوی، مولانا خوشی محمد لاڑکانوی کے نام قابل ذکر ہیں۔^{۱۳}

مولانا سندھی نے مسلمانوں میں دینی بیداری پیدا کرنے کے لئے پریس کی ضرورت کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ وہ صوبہ سندھ کے لئے دارالاشاعت کا قیام بہت ضروری سمجھتے تھے۔ آخر ذاتی جدوجہد سے مولانا سندھی نے ایک چھوٹی سی چھپائی کی مشین خرید لی اور سندھ کے اس چھوٹے سے قصبے میں طباعت و اشاعت کا کام شروع کر دیا۔^{۱۴} تھوڑے ہی عرصہ میں دارالاشاعت سے

سندھی زبان میں ایک ماہنامہ ہدایت الاخوان بھی جاری کیا اگرچہ یہ رسالہ زیادہ دن جاری نہ رہ سکا۔ لیکن اس کا نقش بہت گہرا تھا۔ یہ پرچہ سندھی صحافت میں نہ صرف اپنا نام کر گیا بلکہ انقلابی فکر کی ایک ایسی شمع روشن کر گیا جسکی روشنی میں انقلاب پسندوں کا ایک قافلہ چل پڑا۔ سندھ میں آزادانہ اور انقلابی صحافت کی یہ ایک مستثنیٰ مثال تھی جو انیسویں صدی کے آخر میں نظر آتی ہے۔ یہ رسالہ سکھر کے الحق پریس سے شائع ہوتا تھا۔^{۱۵}

اس دارالاشاعت سے ماہنامہ کے علاوہ سندھی زبان میں کئی کتابیں شائع ہوئیں جن میں مولانا مروٹی کا قرآن مجید کا سندھی ترجمہ ”الہام الرحمن فی تفسیر القرآن“ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔^{۱۶}

ایک دینی درسگاہ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی تعلیم اور محمود المطالع کے قیام کی وجہ سے مروٹ نے تھوڑے ہی عرصہ میں سندھ میں علمی اور سیاسی لحاظ سے ایک مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔^{۱۷}

حضرت سندھی مروٹ میں پرسکون متاہل زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت تصنیف و تالیف، مطالعہ اور غور و فکر میں گزرتا تھا اس مطالعہ کی روشنی میں انہوں نے اپنی آئندہ سیاسی زندگی کا پروگرام بنایا۔ رفتہ رفتہ حالات ناسازگار ہوتے گئے۔ آپ کی اہلیہ مختصر علالت کے بعد اس دارفانی سے رخصت ہو گئیں اور اپنے پیچھے ۳ صغیر سن لڑکیاں چھوڑ گئیں اسی دوران حضرت مولانا سندھی اور مولانا مروٹی کے درمیان دینی درسگاہ کو چلانے کے طریقے کار میں اختلافات پیدا ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب سلطنتِ برطانیہ کے زیر سایہ نیا نظامِ تعلیم رو بہ ترقی تھا اور پرانا نظامِ تعلیم دم توڑ رہا تھا۔ مسلمانوں کی نئی پودان اسکولوں میں تعلیم پارہی تھی جن کا مستقبل مادی لحاظ سے بڑا اچھا ہو جاتا تھا۔ اور مسلم معاشرہ کے ذہین اور طبقہ اشرافیہ کے بچے ان اسکولوں کی طرف کھینچے جا رہے تھے۔ اور دینی مدارس کی طرف اکثر معاشی یا جسمانی لحاظ سے معزور بچے ہی رخ کرتے۔ مولانا سندھی کا خیال تھا کہ اس مدرسہ کا رہائشی معیار اونچا ہونا چاہیے۔ اور اس کے لئے ان کا مستقل ہاسٹل ہو جس میں انکے لئے عمدہ خوراک اور عمدہ لباس کا بندوبست کیا جائے۔ مگر اس کام کے لئے جن ذرائع اور وسائل کی ضرورت تھی وہ وہاں ناپید تھے اور انہیں نہ مولانا سندھی مہیا کر سکتے تھے اور نہ مولانا مروٹی۔ اس کے علاوہ یہ دینی درسگاہ مروٹ کی خانقاہ کے احاطہ میں تھی جہاں مولانا مروٹی اپنے متوسلین کو روحانی فیوضات سے مستفید کرتے۔ ان متوسلین کو تصوف کے مشہور طریقہ پر فقر و فاقہ صبر و قناعت کی تلقین کی جاتی تھی۔ کیسے ممکن تھا کہ ایک ہی جگہ پر طریقت کے طالب تو سادگی اور فقر و فاقہ سے زندگی بسر کریں اور انہیں کے مقابل شریعت ظاہریہ کے تلامذہ ٹھاٹ سے رہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت مولانا مروٹی اس سلسلہ میں مولانا سندھی کی نہ صرف معاونت نہ کر سکے بلکہ ان کے

اس خیال کی تائید پر بھی آمادہ نہ ہوئے۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ مولانا مروٹی، مولانا عبید اللہ سندھی کو اپنا گدی نشین بنانا چاہتے تھے اور اس کے لئے درس و تدریس کی بجائے ذکر و شغل میں انکی رہنمائی اور دوسرے انداز سے ان کی تربیت ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن عبید اللہ کی فطرت سے یہ باتیں میل نہ کھاتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اس ماحول سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔^{۱۸} اس طرح مولانا سندھی کی مروٹ میں سات سال سے جاری تمام اسکیمیں بند ہو گئیں۔ ان کے اس طرح مروٹ چھوڑنے پر مولانا مروٹی کو بہت رنج ہوا اور انہوں نے مولانا عبید اللہ کو ان کے اس ارادہ سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن انہوں نے اپنے عزم میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ بالآخر مولانا مروٹی نے بادل نا خواستہ رخصت کی اجازت دے دی۔^{۱۹}

انہی ایام میں سید ابوتراب پیر رشید اللہ صاحب العلم کو پیر جھنڈو میں قائم اپنے مدرسہ کو وسعت دینے کا خیال آیا۔ انکے والد پیر رشید الدین صاحب العلم ثالث کے قائم کردہ حفظ القرآن کے اس مدرسہ میں دو بڑے استاد تھے ایک حافظ محراب بلوچ اور دوسرے حافظ امین محمد صاحب متو و کچھ والے۔ یہاں سے کافی تعداد میں حفاظ فارغ ہو کر اطراف و کنار میں قرآن کریم کی خدمت سرانجام دے رہے تھے۔ پیر رشید الدین کی خواہش تھی کہ ایک عربی مدرسہ بھی قائم کیا جائے تاکہ مسلمان قرآن اور حدیث کو سمجھ کر اسلام کی خدمت کریں۔^{۲۰} اس کے لئے انہیں ایک ایسے عالم کی تلاش تھی جو جدید و قدیم علوم کا جامع ہونے کے علاوہ کام کرنے کی تڑپ بھی رکھتا ہو۔ پیر رشید اللہ خود بھی ایک عالم اور شیخ تھے اور مسلمانوں کی اصلاح و انقلاب حال کا ایک قوی داعیہ رکھتے تھے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے عبید اللہ سندھی کو مروٹ سے مشورہ کے لئے بلایا۔ مدرسہ کے سلسلہ میں پیر صاحب کے خیالات سے واقف ہو کر وہ بہت خوش ہوئے۔ گوٹھ پیر جھنڈو سے واقف تو وہ پہلے سے تھے مطالعہ کتب کیلئے مستقل پیر جھنڈو آتے رہتے اور پیر صاحبان کی علمی مجالس میں شریک ہوتے رہتے تھے۔ مولانا سندھی کو پیر رشید اللہ کے والد پیر رشید الدین عرف بیعت دھنی (بیعت والے) سے بہت عقیدت تھی اور ہمیشہ ان کی بزرگی اور کشف و کرامت کی باتیں کرتے تھے۔ اس لئے مدرسہ کے قیام کا منصوبہ قبول فرما کر مدرسہ کے انتظام اور اہتمام کی باگ ڈور اپنے

ہاتھ میں لے کر کام میں لگ گئے۔^{۲۱}

پیر رشید اللہ اور مولانا سندھی نے ملکر توکل علی اللہ ماہ رجب ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء بروز جمعرات مدرسہ دارالارشاد کا افتتاح فرمایا۔^{۲۲} پیر صاحب نے مدرسہ کے تمام اخراجات کا بار اپنے ذمہ لیا۔ اور سندھ میں دورہ کر کے خطیر رقم فراہم کی مولانا عبید اللہ نے دیوبند اور پنجاب سے بڑے بڑے علماء اور ماہر علوم اسلامی کو مدرسہ میں جمع کر دیا اور پیر جھنڈو کے ایک چھوٹے سے گوٹھ کو عظیم الشان تحریک کا مرکز بنا دیا۔^{۲۳}

مدرسہ میں مندرجہ ذیل حضرات مدرس مقرر ہوئے:-^{۲۴}

- ۱۔ مولانا عبید اللہ سندھی صدر مدرس و مہتمم مدرسہ دارالارشاد۔
- ۲۔ مولانا نجم الدین صاحب۔ ڈریالہ ضلع جہلم والے۔ مدرس دوم
- ۳۔ مولانا محمد صاحب احمد انی لغاری۔ ڈیرہ غازی خاں۔ مدرس سوئم۔
- ۴۔ مولانا عبد اللہ صاحب لغاری۔ مدرس چہارم

کچھ ہی عرصہ میں مدرسہ دارالارشاد اتنا مشہور ہو گیا کہ بڑے بڑے علماء مدرسہ کو دیکھنے کے لئے تشریف لائے۔ جن میں شیخ الہند مولانا محمود حسن، حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مولانا اشرف علی تھانوی جیسے عالم شامل تھے۔ ان کے علاوہ مولانا غلام محمد صاحب صدر مدرس مدرسہ نعمانیہ لاہور کو خاص طور پر طلباء کا امتحان لینے لئے مدعو کیا گیا۔^{۲۵} سندھ کے مشہور سیاسی و سماجی رہنما جی۔ ایم سید کے مطابق مولانا سندھی نے تھوڑے ہی عرصہ میں پیر جھنڈا کے ایک چھوٹے سے گوٹھ (گاؤں) کو عظیم الشان تحریک کا مرکز بنا دیا۔ اور طلباء و عوام میں آزادی کی جوت جگانی شروع کی۔^{۲۶}

آٹھ دس سال کی مسلسل تعلیم اور علمی جدوجہد کے بعد شعبان ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۱۰ء کو طلباء کی رسم دستار بندی کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا۔^{۲۷}

جلسہ کی صدارت کے لئے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے علاوہ شیخ حسین بن محسن یمانی کو مدعو کیا گیا تھا۔^{۲۸} اس جلسہ میں مندرجہ ذیل حضرات نے علم سے فراغت کی دستار فضیلت باندھی:

- ۱۔ پیرمیاں ضیاء الدین خلف مولانا سید رشد اللہ
 - ۲۔ مولانا محمد اکرم ہالائی (محدث)
 - ۳۔ مولانا محمد الیاس صاحب جمالی کھیتڑ و تعلقہ ہالہ
 - ۴۔ مولوی ابوالحسن صاحب درس ہوتی۔ مشائخ والا
 - ۵۔ مولوی خان محمد صاحب درس
- مولانا سندھی نے مدرسہ کو چلانے کے لئے دس سال کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ جب یہ عرصہ پورا ہوا تو انہوں نے پیر جھنڈا سے اجازت لی۔ کیونکہ مدرسہ اس مقام پر پہنچ چکا تھا کہ جہاں ان کے ہٹ جانے سے کوئی حرج واقع نہ ہوتا۔^{۲۹}

مآخذ

- ۱۔ مولانا ابوبکر شبلی۔ امروٹ میں علوم ولی للہی کی تعلیم۔ الرحیم ستمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۱۔
- ۲۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۲۲
- ۳۔ شیخ ہاجن۔ عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۱

- ۴۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۲۳-۲۴
- ۵۔ محمد الحق بھٹی۔ نقوش عظمت رفتہ۔ ص ۳۵۸
- ۶۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۲۲
- ۷۔ شاہ محمد عثمانی۔ ٹوٹے ہوئے تارے۔ ص ۹۳
- ۸۔ کریم لودھی۔ جدوجہد آزادی میں سندھ کا حصہ۔ جسارت ۲، اگست ۱۹۸۲ء
- ۹۔ الوحید ۲۹ جنوری ۱۹۳۰ء۔
- ۱۰۔ مولانا ابوبکر شبلی۔ امروٹ میں علوم ولی اللہی کی تعلیم۔ الرحیم ستمبر ۶۳۔ ص ۳۰-۳۱
- ۱۱۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۳۳
- ۱۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۳۳
- ۱۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۳۳
- ۱۴۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۳۴
- ۱۵۔ سندھی صحافت۔ ماہنامہ تہذیب۔ کراچی۔ ص ۱۹
- ۱۶۔ مولانا ابوبکر شبلی۔ امروٹ میں علوم ولی اللہی کی تعلیم۔ الرحیم ستمبر ۱۹۶۳۔ ص ۳۴
- ۱۷۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۳۴
- ۱۸۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۳۵
- ۱۹۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۳۵
- ۲۰۔ مفتی عبدالقادر لغاری۔ مدرسہ دارالرشاد پیر جھنڈا۔ الرحیم جولائی ۱۹۶۵ء۔ ص ۱۴۲
- ۲۱۔ مفتی عبدالقادر لغاری۔ مدرسہ دارالرشاد پیر جھنڈا۔ الرحیم جولائی ۱۹۶۵ء۔ ص ۱۴۲
- ۲۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۴۳

- ۲۳۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۴
- ۲۴۔ مفتی عبدالقادر لغاری۔ مدرسہ دارالرشاد پیر جھنڈا۔ الرحیم جولائی ۱۹۶۵ء۔ ص ۱۴۳
- ۲۵۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۴۴
- ۲۶۔ جی ایم سید۔ میری کہانی۔ ص ۱۳
- ۲۷۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۴
- ۲۸۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۲۶
- ۲۹۔ مفتی عبدالقادر لغاری۔ مدرسہ دارالرشاد۔ الرحیم جولائی ۱۹۶۵ء۔ ص ۱۴۴

باب چہارم

جمیعتہ الانصار

مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے دو مقاصد تھے اول اسلامی تعلیمات کی اشاعت، دوم انگریزوں کے خلاف جذبہ جہاد کو زندہ رکھنا۔ اور ان ہی مقاصد کے لئے دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تھا۔^۱ حضرت شیخ الہند دوران درس جن تلامذہ میں صلاحیت پاتے تعلیم کے ساتھ اسکی سیاسی تربیت بھی کرتے جاتے۔ ایک عرصہ تک اس طرح کام کرنے کے بعد ملک کے اطراف و جوانب میں تلامذہ کی ایک جماعت کام کو منظم طور پر آگے بڑھانے کے لئے تیار ہو گئی۔

حضرت شیخ الہند دارالعلوم کو ایک علمی انداز سے ملتی تعلیم کا مرکز بنانا چاہتے تھے جس کا نقش اول جمیعتہ الانصار کا قیام تھا^۲ اور جس کے ذریعہ انہوں نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری کا جذبہ پیدا کرنے کی سعی کی۔

ایک خیال یہ ہے کہ جمیعتہ الانصار کی بنیاد شیخ الہند کی طالب علمی کے دوران ہی پڑ چکی تھی۔ ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں دیوبند کے کچھ فضلاء نے مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ارکان شوریٰ کی خدمت میں درخواست پیش کر کے اس کی داغ بیل ڈالی تھی۔ عطیہ یا چندہ کا نام ثمرۃ التربیت رکھا گیا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ جو حضرات دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہو چکے ہیں اور مختلف کاموں میں لگے ہوئے ہیں ان پر اپنی مادر علمی کا بڑا حق ہے۔ ان کو چاہیے کہ وہ سال میں ایک مرتبہ اپنی ایک ماہ کی آمدنی کا چوتھائی حصہ اپنی مادر علمی کو ضرور پیش کیا کریں۔ ابتدا میں یہ جماعت ۱۹ افراد پر مشتمل تھی اور

سالانہ پیشکش کی مقدار ۲۶ روپیہ آٹھ آنہ تھی۔ مگر کیونکہ یہ تحریک اس وقت ضرورت زمانہ کے مطابق نہ تھی اس واسطہ رک گئی۔ حضرت شیخ الہند نے اسی جماعت کو خفیہ رازداری کے ساتھ آگے بڑھایا۔^{۳۱}

مولانا محمد میاں کا خیال ہے کہ مدرسہ کے فارغ التحصیل افراد میں اخوت اسلامی کے فروغ کے لئے کوشاں رہنے کے علاوہ ہندوستان میں انگریزی سامراج کے خلاف رائے عامہ ہموار کر کے ان کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے لئے ہندوستان میں جہاں اور بہت سی جماعتیں قائم کی گئیں جمیعتہ الانصار بھی ان میں سے ایک تھی۔ حکومت کی نگاہ سے بچنے کے لئے ضروری تھا کہ مقاصد کو چھپایا جائے اور مختلف مدارس عربیہ کو جمیعتہ الانصار کے تحت ایک سلسلہ میں مربوط و منسلک کیا جائے۔ دیوبند کے فارغ التحصیل طلباء کو دیگر دارالعلوم اور مدارس میں بھیجا جائے تاکہ اس طرح اسلام کے اصول و تعلیمات کے ساتھ ساتھ اپنے مقاصد کی بھی ملک میں صحیح اشاعت ہو سکے۔^{۳۲}

جمیعتہ الانصار کے قیام کے سلسلہ میں مولانا سندھی کے قریبی رفیق عبداللہ لغاری کا بیان ہے کہ: ”مولانا محمود حسن صاحب نے جشن دستار بندی سے ڈیڑھ یا دو سال پیشتر مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا محمد صادق کراچی والے کو دیوبند طلب کیا۔ میں بھی مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ رفیق سفر ہو گیا۔ اس ملاقات کے بعد ہی ہماری انقلابی، سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔“

اس ملاقات کے موقع پر مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا صادق دونوں حضرات شیخ الہند کے سامنے بیٹھے تھے اور میں ان دونوں حضرات کے پیچھے بیٹھا تھا۔ حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ یہ مدرسہ دیوبند ۱۸۶۶ء میں قائم کیا گیا تھا۔ میں پہلا شاگرد تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے اس موقع پر جو تقریر فرمائی وہ مجھے یاد ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ یہ مدرسہ اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے شکست کے نقصان کی تلافی کی جاسکے۔

حضرت شیخ الہند نے فرمایا لیکن اب یہ مدرسہ اصل مقصد سے ہٹ گیا ہے۔ صرف تدریس کے لئے تو اس طرح کے کئی مدارس قائم کئے گئے ہیں۔ اب کیا کرنا چاہئے جس سے اس مدرسہ کے قیام کا اصل مقصد پورا ہو۔ اسی ادھیڑ بن میں ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ سندھ سے ایک شخص آیا ہے جسکی ڈھاڑھی خوب گھنی ہے۔ اس نے آکر اصل مقصد کی طرف رہنمائی کی ہے۔

بیداری کے بعد میں نے غور کیا تو اس وضع قطع کے سندھ میں دو آدمی نظر آئے۔ ایک مولانا عبید اللہ سندھی اور دوسرا مولانا محمد صادق اس لئے میں نے آپ دونوں کو مشورہ کے لئے بلایا ہے۔

یہ سن کر مولانا عبید اللہ نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ اس مدرسہ کے تمام فارغ شدہ علماء کو چاہے وہ اندرون ہند کے ہوں یا بیرون ہند کے دستار بندی کے جلسے کے لئے بلایا جائے۔ اس اجتماع کے ذریعہ اس مدرسہ کی مرکزی حیثیت اور واضح ہوگی۔ اور مدرسہ کی اصل مقصد والی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے تجاویز بھی سوچی جاسکیں گی۔ حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ آپ لوگ یہیں ٹھہریں اور اس جلسہ کی تدبیر کریں۔^۵

حضرت شیخ الہند نے بجائے اس کے کہ کوئی سیاسی جماعت تشکیل دی جائے اپنے رفقاء کا رکو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ مدرسہ کے فارغین کے لئے جلسہ دستار بندی منعقد کی جائے یہ جلسہ دستار بندی ۱۹۱۰ء میں ہوا۔ مختلف خیالات و نظریات کے تقریباً ۳۰ ہزار لوگ اس میں شریک ہوئے۔ تقریباً دو سو علماء کے دستار فضیلت باندھی گئی۔ اسی جلسہ میں رسالہ القاسم کے اجراء کا اعلان کیا گیا۔^۶ لہٰذا خیال کیا جاتا ہے کہ اسی جلسہ میں جمعیت الانصار کی نشاۃ الثانیہ کو عمومی شکل دی گئی۔ یہ جلسہ بہت کامیاب ہوا اور پہلی مرتبہ ایم۔ اے۔ او کالج سے ایک جماعت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی سرکردگی میں دیوبند پہنچی۔ جلسہ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے مدرسۃ العلوم مسلمان علی گڑھ اور دارالعلوم دیوبند کے درمیان اشتراک عمل کی تجویز پیش کی جسکے تحت دونوں ادارے خیر سگالی کے طور پر آپس میں طلباء کا تبادلہ کریں۔^۷

مولانا عبید اللہ سندھی کا بیان ہے کہ جمعیت الانصار قائم کرنیکی پہلی تحریک جس مجلس اساسی میں حضرت مولانا شیخ الہند کے سامنے پیش ہوئی اس کا مسودہ مولانا عبید اللہ سندھی کے مطابق انہوں نے مدرسہ پیر جھنڈا کے دارالرشاد میں تحریر کیا تھا اور اول مرتبہ الحق پریس سکھر میں طبع کرا کر دیوبند کی مجلس میں پیش کیا تھا۔ اور دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے مولانا سندھی کی تحریک پر ۲۷ رمضان ۱۳۷۲ھ کو الانصار کے نام سے فضلاء دارالعلوم کے جماعت کی منظوری دے دی۔^۸

جمیعتہ الانصار کے مقاصد میں بتلایا گیا تھا کہ اس جمیعت کی غرض مدرسہ عالیہ دیوبند کے مقاصد کی تائید و حمایت اور اس کے ملقہ کے ترویج و اشاعت کو ہمہ گیر بنانے کے ساتھ ساتھ اسکی مالی امداد و معانت بھی تھی۔^۹

اس جمیعت کا پہلا اجلاس ۱۵-۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء کو مراد آباد میں ہوا جس نے تمام ملک کے اصحاب نظر کو اپنی طرف متوجہ کیا جلسہ کا اہتمام دارالعلوم کے قدیم طلباء نے کیا تھا۔ اس میں علیکڈھ، ندوہ اور دیوبند کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے اداروں کے مندوبین بھی شریک ہوئے۔ اہم افراد میں مولانا شبلی بھی تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے ”الاسلام“ کے نام سے اپنا کلامی مضمون پیش کیا۔^{۱۰}

صدر جلسہ مولوی احمد حسن امروہوی ^{۱۱} نے کہا کہ جمیعتہ الانصار کسی دوسرے ادارہ کی نقالی نہیں ہے۔ اس کی تحریک غالباً اب سے تیس برس پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اس تحریک کے بانی مدرسہ عالیہ کے وہ طالب علم تھے جو آج علوم کے سرچشمہ اور آفتاب فنون ہیں اور جن کی ذات بابرکات پر آج زمانہ جس قدر ناز کرے بجا ہے۔ لیکن یہ تحریک اس وقت زمانے کی ضرورت کے مطابق نہ تھی۔ اس لئے رک گئی۔ آخر اس کلیہ کی بنا پر کہ ضرورت ہر چیز کو خود بخود پیدا کر دیتی ہے۔ اس انجمن کو دوبارہ زندہ کر کے جمیعتہ الانصار کا نام رکھ لیا گیا۔^{۱۲} اس کے مقاصد سیاست سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ ملکی سیاست سے اسکا کوئی تعلق نہیں۔ اصلاح عقائد و اعمال کی ترقی اور امت مسلمہ کو مغربی زہر آلود تعلیم اور بے دینی کے وبائی جراثیم سے حفاظت اسکا نصب العین ہے۔^{۱۳}

جمیعتہ الانصار کے قرارداد مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا گیا کہ ”اس جمیعتہ کے اراکین مدرسہ عالیہ دیوبند کے سابقہ تعلیم یافتہ حضرات ہیں۔ جس میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ مدرسہ کی تعلیمی انتظامی اور مالی ترقی میں انتہائی کوشش کرے ان فرائض کے ادا کرنے کے لئے جمیعتہ نے پانچ شعبے قرار دئے ہیں۔ (۱) تکمیل تعلیم۔ (ب) نظام تعلیم۔ (ج) الارشاد۔ (د) التالیف و اشاعت (ع) جلسہ علمیہ۔ درجہ تکمیل میں حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہ کی تالیفات اور حضرت مولانا شاہ

ولی اللہ اور ان کے خاندان کی کتابیں حجتہ اللہ البالغہ۔ خیر کثیر۔ عبققات۔ تکمیل الاذہان اور حضرت
مجدد الف ثانی کے بعض مکتوبات پڑھائے جائیں گے۔ علم تفسیر کلام و ادب وغیرہ فنون کی اعلیٰ
کتابیں بھی داخل درس ہوں گی۔ تقریر و تحریر کی خاص مشق کرائی جائے گی۔ طریق درس و انتظام
سکھایا جائے گا۔^{۱۴}

جلسہ انتہائی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا اس میں منظور شدہ تجاویز کو بظاہر بے ضرر تھیں۔ مگر اس
نے انگریزوں کا چونکا دیا۔ اگرچہ جلسہ میں حکومت کا شکریہ بھی ادا کیا گیا۔^{۱۵} مگر انگریزوں کی بدگمانی
دور نہ ہوئی۔^{۱۶} اور اس کی کارگزاری پر نظر رکھی جانے لگی۔ اجلاس کے ختم ہوتے ہی صدر جلسہ مولانا
احمد حسن سے پوچھ گچھ ہوئی اور حضرت شیخ الہند کی آمدنی پر ٹیکس لگا دیا گیا۔^{۱۷}

دوسرا اجلاس ۱۹۱۲ء میں میرٹھ میں مولانا اشرف علی کی صدارت میں ہوا اور تیسرا اجلاس
شملہ میں۔ ان اجلاسوں کی وجہ سے دارالعلوم کے حلقہ اثر میں وسعت اور قوت پیدا ہوئی۔ زیادہ
عرصہ نہ گزرا تھا کہ ملک میں جابجا قاسم المعارف کے نام سے جمعیۃ الانصار کی شاخیں قائم ہو گئیں۔
مولانا حبیب الرحمن عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند جمعیۃ الانصار کے امیر، مولانا عبید اللہ
سندھی سکریٹری اور مولوی محمد میاں (منصور انصاری) جوائنٹ سیکریٹری مقرر ہوئے اور مدرسہ کے قدیم
طلباء کی تنظیم کا کام ان کے سپرد ہوا۔ مولانا محمد صادق کراچی، مولانا ابو محمد لاہوری، اور مولانا محمد علی
بھی ان کے شریک کار تھے۔ مجلس منظمہ ۷ ارکان پر مشتمل تھی۔^{۱۸}

مولانا کے ایک تلمیذ شائق احمد عثمانی کا بیان ہے کہ ”مولانا عبید اللہ سندھی کی تحریک پر
دارالعلوم میں درجہ تکمیل قائم کیا گیا جس میں حضرت شاہ ولی اللہ کی تصنیف حجتہ اللہ البالغہ اور مولانا
محمد قاسم نانوتوی کی بعض کتابیں نصاب میں رکھی گئیں۔ نظارۃ المعارف قرانیہ کے نام سے ایک
دارالاجتہاد کھولا گیا۔ بظاہر درجہ تکمیل کا مقصد طلبہ میں علمی مہارت پیدا کرنا تھا۔ مگر دراصل اس کا
مقصد ان کو دنیا کے حالات سے باخبر رکھنا اور سیاست کے میدان کے لئے تیار کرنا تھا۔ مولانا
عبید اللہ کی سرگرمیوں نے طلبہ کے حلقوں میں ایک خاص قسم کی سیاسی بیداری اور انقلاب کی تڑپ

پیدا کردی تھی۔ ۱۹۰۰ء

مولانا سندھی کے خیال میں مدرسہ کے اثر اور ترویج کی اصل بنیاد اشاعت کلام اللہ اور احادیث رسول کے صحیح معانی اور حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہ کی علمی تحقیقات ہیں جن کی اشاعت کرنے سے بہت کام بن سکتے ہیں۔ کیونکہ جو شکوک فلسفہ جدیدہ سے اب پیدا ہو رہے ہیں ان کو حضرت نے عرصہ ہوا رفع فرما دیا تھا۔ اب ہمارے لئے جدید علم کلام یہی ہے کہ ہم مولانا مرحوم کی تالیفات کو بھی اسی نظر و تحقیق سے پڑھیں جیسا کہ فلسفہ و منطق کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ مولانا کی تحقیقات کے ذریعہ سے خدمت اسلام کرنا جمیعتہ الانصار کا فرض ہوگا۔ ۲۰

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کا خیال ہے کہ جمیعتہ الانصار کے اہم اور ضروری مقاصد حضرت شیخ الہند کے مقاصد سے الگ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ شاید شیخ الہند کا مقصد ابنائے قدیم کی ایسی تنظیم قائم کرنا تھا جو بوقت ضرورت کام میں لائی جاسکے۔ ۲۱

جمیعتہ کا ایک اندرونی حلقہ بھی تھا جو ایک طرح سے خفیہ تنظیم تھی اور اس کے اغراض و مقاصد کا علم صرف مخصوص افراد ہی کو تھا۔ کیونکہ یہ حکومت کے خلاف کام کر رہی تھی۔ جمیعتہ نے اس کا بھی اہتمام کیا تھا کہ ہند اور بیرون ہند تقسیم کرنے کے لئے انقلابی اور انگریز مخالف لڑچتر تیار کیا جائے اور اس کے لئے فنڈ بھی جمع کیا گیا۔ کچھ کل وقتی کارکنان کو جمیعتہ کے فنڈس سے الاؤنس بھی ملتا تھا۔ ۲۲

C.I.D. نے اپنی رپورٹوں میں جمیعتہ الانصار کے درج ذیل مقاصد کی نشاندہی کی تھی۔

۱۔ مدرسہ دیوبند کے دائرہ عمل کی توسیع کے لئے جدوجہد۔

۲۔ صحیح خطوط پر کام کرنے کے لئے فنڈ کی فراہمی۔

۳۔ دارالعلوم کے قیام کے مقاصد اور اس کے بنیادی اصول کی تشہیر۔

۴۔ دارالعلوم کے خطوط پر ملک میں دوسرے اداروں کا قیام۔ ۲۳

اس دوران اٹلی اور ترکی کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور اس کے بعد جنگ بلقان شروع

ہوئی۔ اس جنگ کے دوران برطانیہ نے جو کردار ادا کیا اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ برطانوی پالیسی ترک مخالف تھی۔ مسلمان ہند نے برطانیہ کی ترک دشمن مخالف پالیسی کی مخالفت کی برصغیر کے مسلمانوں کو ترکوں کے ساتھ گہری جذباتی وابستگی تھی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مسلمانان عالم کا احیاء اور ان کا وقار سلطنت عثمانیہ کی بقاء میں ہے^{۲۴}۔ برطانوی سامان کے مقاطعہ کی باقاعدہ تحریک شروع ہو گئی۔^{۲۵} برعظیم پر برطانوی قبضہ کے خلاف مخالفت کی طویل روایت کو آسانی کے ساتھ ختم نہیں کیا جاسکتا تھا۔^{۲۶}

دارالعلوم کے تمام اساتذہ اور طلباء نے حضرت شیخ الہند کی تحریک پر دن رات کام کیا۔ دارالعلوم اس زمانے میں بند کر دیا گیا۔ اس وقت علماء دیوبند کے سامنے تعلیم سے زیادہ سلطنت عثمانیہ کی حفاظت و حمایت اور اس کا دفاع تھا۔ حضرت شیخ الہند نے فتوے چھپوائے اور طلبہ کے وفد ملک میں بھیجے خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے۔^{۲۷}

انجمن ہلال احمر نے دارالعلوم کی طرف سے ایک اپیل شائع کی جس پر جمعیتہ الانصار کے ناظم عبید اللہ سندھی اور دارالعلوم کے مہتمم حافظ محمد احمد کے دستخط تھے۔ اس اپیل کے نتیجے میں تقریباً پچھتر ہزار روپیہ جمع ہوا جو نیشنل بینک کے توسط سے پریسیڈنٹ ہلال احمر قسطنطنیہ کو بھیجا گیا۔ اس کے علاوہ دارالعلوم کی طرف سے جاری کروہ فتویٰ ایک لاکھ سے زائد تقسیم کیا گیا۔^{۲۸}

دارالعلوم کی بظاہر پرسکون بہتی ہوئی موجوں کی تہہ میں ایک خفیہ لہر بھی تھی جو اصل روح کے طور پر کام کر رہی تھی۔ دیوبند میں حضرت شیخ الہند کا ایک مقولہ مشہور تھا کہ انگریز سے نفرت جزایمان ہے۔

اسی عرصہ میں حضرت شیخ الہند نے بیعت جہاد لینی شروع کر دی اور جب مولانا حسین احمد مدنی نے لوگوں کے اس خدشہ کا ذکر کیا کہ اگر اس بیعت جہاد کی انگریزوں کو خبر ہو گئی تو دارالعلوم کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور مسلمانوں کا یہ مرکز علمی اجاڑ دیا جائے گا۔ تو اس کے جواب میں حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دعا فرمائی تھی کہ پچاس برس تک یہ

دارالعلوم قائم رہے سو بھگت اللہ پچاس برس گزر چکے ہیں اور دارالعلوم اپنی خدمات بحسن و خوبی انجام دے چکا ہے۔ ۲۹

ممالک متحدہ (یو پی) کے لیفٹیننٹ گورنر جیمس میسٹن کو ۱۹۱۲ء میں دیوبند مدعو کیا گیا اور دارالعلوم کی طرف سے اس کو سپاس نامہ بھی پیش کیا گیا۔ دیوبند میں ہوتے ہوئے بھی شیخ الہند اس جلسہ میں شریک نہیں ہوئے۔ اسی جلسہ میں مہتمم مدرسہ حافظ محمد احمد کو شمس العلماء کا خطاب بھی دیا گیا۔ حضرت شیخ الہند اور مولانا عبید اللہ سندھی دونوں کا زاویہ خیال مدرسہ کے ارباب بست و کشاد سے جدا ہوتا گیا۔ اس کے بعد دوراں میں مختلف ہو گئیں۔ ایک راہ تعلیم اور دینی نشر و اشاعت کی اور دوسری راہ وہی تھی جسے بالآخر حضرت شیخ الہند نے اختیار فرمایا تھا اور اسی مسلک کے ساتھ اپنے مالک سے جا ملے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ فرائض الہیہ جس حد تک بن پڑا ادا کرتا رہا۔ اب آخری کام یہی رہ گیا ہے جسے اپنی حد تک تو میں کر گزروں گا۔ ۳۰

برٹش حکومت کے کارندوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ مولانا سندھی کے لئے آزادی کے ساتھ کام کرنا مشکل ہو گیا۔ دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہند کی تحریک کے خلاف ارباب اہتمام نے کئی طرح کی رکاوٹیں پیدا کیں کیونکہ حضرت شیخ الہند کی ذات خود مرکزیت اور اہمیت کی حامل تھی۔ اسلئے آپ سے اختلاف رکھنے کے باوجود آپ کے سامنے آنے کی ہمت کسی میں نہ تھی اسلئے حضرت کے خلاف کچھ کہنے یا تحریک کی مخالفت کی بجائے مگر عملاً شیخ الہند کو مفلوج کرنے کی غرض سے مولانا عبید اللہ سندھی سیکرٹری جمیعتہ الانصار کی ذات کو نشانہ بنایا گیا۔

مولانا حسین احمد مدنی کا خیال ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام کے سامنے دارالعلوم کی بقاء اور تحفظ کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات اور اس کے بعد انگریزوں کی پالیسی ان کے سامنے تھی۔ اس لئے انہوں نے مولانا سندھی کی سرگرمیوں کو نہ صرف دیوبند بلکہ عام مسلمانوں کیلئے بھی خطرناک جانا اور اپنے خیال کے مطابق ضروری سمجھا کہ مولانا سندھی کا تعلق اس مرکز سے نہ رہے۔ ۳۱

مولانا حسین احمد مدنی کا بیان ہے کہ بعض مسائل دیدیہ کو درمیان میں رکھا گیا اور مولانا

سندھی کے دو بلند پایہ معاصرین کو بدظن کر کے تغلیل کفر پر آمادہ کیا گیا۔^{۳۲} مولانا کے یہ دو ہم عصر معاصر مولانا شبیر احمد عثمانی اور انور شاہ کشمیری تھے۔^{۳۳} افسوس کہ ان علماء کے دلائل ان کے نام سے کم درجہ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ وہ علما جو روایتی مدرسوں میں تعلیم پاتے ہیں کتنی ہی کوشش کریں مگر قدامت پرستی کے اثرات پر غالب نہیں آسکتے۔ مدرسہ بجائے خود ایک الگ دنیا ہے جو ہزاروں سال پرانی ہے۔ یہ ایک طرز زندگی بھی ہے اور طرز فکر بھی۔ اور اظہار ذات کا ذریعہ بھی۔^{۳۴}

حضرت شیخ نے جب دیکھا کہ حالات ایسے پیدا کر دئے گئے ہیں جس میں تحریک کو جاری رکھنا مفید نہیں ہو سکتا تو انہوں نے مولانا سندھی سے استعفیٰ دلوا دیا۔^{۳۵} مولانا عبید اللہ کا بیان ہے کہ ”جمیعتہ الانصار کے امیر مولانا حبیب الرحمن عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور انتظامیہ کے تمام ممبر میری معلومات کے مطابق میرے تعلق سے اچھے خیالات نہیں رکھتے اور اگر میں اپنی برأت ثابت بھی کر دوں تو بھی اتفاق رائے سے کام چلانا مشکل ہے۔“^{۳۶} مولانا حسین احمد مدنی کا بیان ہے کہ انور شاہ کشمیری کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ انہیں اس معاملہ میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور انہوں نے مولانا عبید اللہ سندھی سے ان کے حجاز کے قیام کے دوران معذرت کر لی تھی۔^{۳۷}

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مولانا حفظ الرحمن کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ جب ۱۹۲۸ء میں وہ حج کے لئے روانہ ہونے سے قبل انور شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت شاہ صاحب نے آبدیدہ ہو کر رقت آمیز آواز سے فرمایا ”مکہ میں مولانا عبید اللہ سے میرا بہت بہت سلام کہنا اور یہ پیام پہونچا دینا کہ آپ کے قیام دیوبند کے زمانہ میں میں آپ کے لئے باعث تکلیف بنا۔ اس وقت مجھ کو اصل حالات کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔ اب احساس ہوا ہے اور اصل حقیقت معلوم ہوئی ہے تو مجھ کو بڑی ندامت اور انفعال ہے۔ اب میں یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں آپ کی طرف سے کوئی ملال نہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ اب آپ میری جانب سے کوئی تکرار نہ رکھیں گے۔“^{۳۸}

مولانا عبید اللہ سندھی کی علیحدگی پر دارالعلوم کی طرف سے جس روش کا اظہار کیا گیا اور جس

طرح کی تحریریں سامنے آئیں اس سے ان اندرونی جذبات اور ذہن و فکر پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ مخصوص حالات پیدا کئے جانے کے بعد جب مولانا علیحدہ ہو گئے تو بجائے اس کے کہ مولانا کے اس فیصلہ کو ان حالات کا نتیجہ اور رد عمل سمجھا جاتا ان کو موردِ عتاب خیال کیا گیا۔ دارالعلوم کے سرکاری ترجمان القاسم کے مدیر مولوی سراج احمد نے لکھا ہے کہ ”بد قسمتی سے اس پر آشوب زمانے میں جناب مولوی عبید اللہ نہ صرف جمیعت کی نظامت سے علیحدہ ہوئے بلکہ اپنی جماعت سے بھی مفارقت فرما کر اور ایسے حالات میں جمیعت کو زیر بار چھوڑ کر دلی میں نظارۃ المعارف قائم کر لی۔ انسا للہ و ان الیہ راجعون۔“

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے ۳۹

اسمیں مولانا سندھی کو جس طرح مطعون کیا گیا اور نظارۃ المعارف کے سلسلہ میں جس جذبہ کا اظہار کیا گیا وہ تحریر سے ظاہر ہے مولانا سندھی کی علیحدگی پر علمی اور مذہبی حلقوں میں جو رد عمل ہوا اس کے سلسلہ میں ترجمان مذکور کا بیان تھا۔ ”کسی ایک کارکن کی علیحدگی یا معزولی سے کیا کوئی سرشتہ، کوئی مدرسہ، کوئی انجمن ختم ہو جاتی ہے۔ بڑے بڑے کالجوں میں بڑے افسر، پرنسپل، ناظم، سیکریٹری علیحدہ ہو جاتے ہیں اور معزول کر دئے جاتے ہیں اور معاً ان کا کوئی دوسرا جانشین ہو جاتا ہے۔ کل کی بات ہے کہ حضرت شبلی نظامت ندوہ سے علیحدہ ہوئے تھے۔ کیا خدا نخواستہ ندوہ کا خاتمہ ہو گیا۔ علی گڑھ کالج سے بھی کبھی کبھی بعض جلیل القدر عہدیدار جدا ہوتے ہیں کیا کالج بند ہو گیا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ جمیعت الانصار کے متعلق ان بے معنی وساوس کی پیدائش کا مادہ کیوں ہیجان میں ہے۔“ ۴۰

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا سندھی اور ان کے ساتھیوں کی جبریہ علیحدگی کا کیا رد عمل ہوا ہوگا۔ اور لوگوں نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ رونما ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ایک فعال شخصیت کی علیحدگی کسی ادارہ کی برہنہ برسی کی کارگزار یوں پر پانی پھیر دیتی ہے وہ ختم تو نہیں ہوتا مگر افادیت کھو بیٹھتا ہے یہی حال جمیعت الانصار کا بھی ہوا۔

جمیعت کی عمر کا پیمانہ جلد لبریز ہو گیا۔ اور اس کا وہ خواب جو اس نے دارالعلوم کی فلاح و ترقی کی بابت دیکھا تھا شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ اربابِ اہتمام کے خاص رویہ کی وجہ سے حضرت شیخ الہند

نے یہ مناسب سمجھا کہ سیاسی تعلیم و تربیت کا مرکز دیوبند سے دہلی منتقل کر دیا جائے۔

مولانا سندھی نے ۱۱ مئی ۱۹۱۳ء کو نظامت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اور اتمام حجت کے لئے انہوں نے دارالعلوم کے ذمہ داران کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا جب کوئی جواب نہیں ملا تو ایک سال بعد ۳۰ مئی ۱۹۱۴ء کو الہلال میں ایک خط شائع کرایا۔

”میری جمیعتہ الانصار سے علیحدگی اور نظارة المعارف کے قائم ہونے پر جس قدر سوالات بعض اراکین جمیعتہ الانصار یا دیگر حضرات کی طرف سے اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں ان کے جواب میری طرف سے صرف اسی لئے نہیں دئے گئے کہ میں اس قسم کے منافشات کا صحیح اور مفید حل یہی تصور کرتا ہوں کہ بذریعہ تحکیم فیصلہ کرایا جائے۔ دفتر جمیعتہ الانصار نے جلسہ انتظامیہ کا فیصلہ میرے پاس صفر سے پہلے نہیں بھیجا۔ ملنے پر میں دیوبند گیا اور مولانا حبیب الرحمن صاحب امیر جمیعتہ الانصار کی خدمت میں دارالعلوم کی مجلس اعلیٰ تک مرافعہ کی درخواست پیش کی۔ اس کا جواب نہیں ملا۔ اب تک سکوت دیکھ کر فقط ایک درجہ کوشش کا نظر آیا ہے کہ دارالعلوم کے معظم اراکین خصوصاً مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا عبدالرحیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر معاملہ پیش کروں۔“ اے

نظارة المعارف قرآنیہ

نظارة المعارف کے قیام کا زمانہ ہندوستان میں بڑی بے چینی اور شدید اضطراب کا زمانہ تھا۔ صوبہ بنگال کی تقسیم نے بنگال اور اس کے ملحقہ صوبوں میں نوجوانوں کی ایک دہشت پسند پارٹی پیدا کر دی تھی جو تھوڑے دنوں کے ذریعہ ملک کو آزاد کرانا چاہتی تھی۔ پنجاب میں نوآبادیاتی بل نے ایک ہنگامہ پیدا کر دیا تھا۔ پنجاب کے گورنر سر ڈنل ہنس کے بقول لوگ ہر جگہ کسی تبدیلی کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے دماغوں میں نئی ہوا بھری ہوئی تھی۔ اور وہ حکومت کے خلاف ایک عام بے چینی کا نتیجہ معلوم کرنے کے لئے بے چین تھے۔

تقسیم بنگال کی منسوخی اور دارالسلطنت کے کلکتہ سے دہلی منتقل ہونے کے بعد مختلف سیاسی قوتیں اب دہلی میں جمع ہو گئیں تھیں۔ اس لئے دارالعلوم دیوبند میں پیش آنے والے واقعات کے

بعد جو جمعیت الانصار کی سرگرمیوں کو معطل کرنے پر منبج ہوئے تھے۔ حضرت شیخ الہند نے یہ دیکھ کر کہ حالات ایسے پیدا کر دئے گئے ہیں جن میں تحریک کو جاری رکھنا مفید نہیں ہو سکتا مولانا عبید اللہ سندھی سے استعفیٰ دلوا کر ان کا کام دہلی منتقل کر دیا۔

مولانا حسین احمد مدنی کا کہنا ہے کہ جن اختلافات کو وجہ قرار دے کر مولانا سندھی کو دیوبند سے علیحدہ کیا گیا ان کی وجہ سے دارالعلوم کے اساتذہ، ملازمین اور عام طلباء مولانا سندھی سے بہت بعید ہو گئے تھے۔ لیکن حضرت شیخ الہند سے ان کے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خفیہ آمد و رفت جاری رہی۔ رات کے اندھیروں میں دیوبند کے باہر ملاقاتیں ہوتیں اور ضروری باتیں انجام دی جاتیں۔^{۴۲}

نظارۃ المعارف کا قیام ایک طویل المیعاد منصوبہ تھا۔ جس کا مقصد تعلیم یافتہ خصوصاً علیگزہ کالج کے نوجوانوں کی سیاسی تربیت اور حضرت شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت اور ملک کے حالات کے مطابق ان کی رہنمائی کرنا تھا۔ اندون ملک شیخ الہند کی تحریک کا کام دو مراحل میں انجام پانا تھا۔ پہلا حصہ جمعیت الانصار کے کام کی تکمیل پر ختم ہو گیا۔ اور دوسرا مرحلہ نظارۃ المعارف کے قیام سے شروع ہوا۔ اور یہ ۱۹۱۵ء میں اس وقت تکمیل کو پہونچا جب مولانا سندھی کو کابل روانہ کیا گیا۔^{۴۳}

مولانا سندھی کا کہنا ہے کہ: ”مراد آباد کے اجلاس میں یہ خیال بہت شدت سے ان کے سامنے آیا کہ ہم تعلیم یافتہ انگریزی جماعت سے دوری کیون بنائے ہوئے ہیں ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد کا سوال بھی سامنے آیا تھا۔ جسے مناسب جانا کہ پہلے قدم کے طور پر قدیم و جدید نوجوانوں کا سمجھوتہ ہونا چاہئے پھر دوسرا قدم اٹھانا مشکل نہ ہوگا۔“^{۴۴}

مولانا کے خیال میں نئے اور پرانے خیالات کے مسلمانوں میں وجہ نزاع صرف قیادت کا مسئلہ تھا۔ علماء برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ عام مسلمانوں کی رہنمائی کا منصب ان کے ہاتھ سے نکلے۔ اور پھر تعلیم یافتہ طبقہ علماء کی امامت کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ مولانا کے خیال میں اس کا حل یہی تھا کہ اہل علم لیڈر شب کے ادعا سے دستبردار ہو جائیں اور تعلیم یافتہ لوگوں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ اہل علم کی قدر و قیمت کو نہ بھولیں۔ مولانا سندھی کا کہنا ہے کہ حضرت شیخ الہند کا اپنا یہی خیال تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مولانا محمد علی گورنریو پی کی آمد کے موقعہ پر دیوبند تشریف لائے تو حضرت شیخ الہند

ان کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے تھے اور مولانا کے مطابق اس وقت سے ہمارے امام نے مولانا محمد علی کو اپنا امام مان لیا تھا۔^{۴۵}

مولانا سندھی کا بیان ہے کہ شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا۔ اس طرح دہلی بھیج کر وہ مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے اس غرض کی تکمیل کیلئے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ اور ڈاکٹر انصاری نے مولانا آزاد اور مولانا محمد علی سے مجھے متعارف کرایا۔^{۴۶} نظارة المعارف کے سرپرستوں میں شیخ الہند کے علاوہ حکیم اجمل خاں اور ایم۔ اے۔ اوکالج کے سیکریٹری نواب وقار الملک شامل تھے۔^{۴۷}

۱۳۳۱ھ میں مسجد فتح پوری کے ایک کمرے میں نظارة المعارف کی ابتداء ہوئی۔ مدرسہ فتحپوری کے مدرس اول مولانا سیف الرحمن^{۴۸} بھی مولانا سندھی کے شریک کار مقرر ہوئے۔ اس میں مدارس عربی کے فضلاء اور کالجوں کے گریجویٹ طلباء کو تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کو قرآن حکیم کے حقائق و معارف سے روشناس کرانے کے علاوہ حالات وقت کے مطابق تبلیغی اور سیاسی کاموں کی انجام دہی کے طریقے بھی بتائے جاتے۔

مولانا سندھی جب قرآن پڑھاتے تھے تو اس کے ساتھ جہاد کے عملی پہلوں کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ مولانا سندھی اپنے شاگردوں کو قرآن کریم کا درس بہ اعتبار فوض الکبیر مصنفہ شاہ ولی اللہ کے علاوہ حجتہ اللہ البالغہ پر بھی درس دیتے تھے۔^{۴۹}

مڈن اینگلو اورینٹل کالج کے اسٹنٹ سکریٹری مولوی محمد ادریس نظارة المعارف سے منسلک ہو گئے۔ بیگم بھوپال نے دوسروں سے پیہما ہوار کی امداد مقرر کی۔ مولانا عبید اللہ سندھی ناظم اور مولوی احمد علی نائب ناظم مقرر کئے گئے۔ خواجہ عبدالحی فاروقی اور انیس احمد کے وظائف مقرر کئے گئے۔^{۵۰} دوسرے افراد جو تحریک سے منسلک ہوئے وہ مولانا آزاد حسرت موہانی اور حکیم اجمل خاں تھے۔

حکیم صاحب کے سوانح نگار قاضی عبدالغفار کا بیان ہے کہ حکیم صاحب کی ذہنی، انقلابی اور

سیاسی زندگی نظارۃ المعارف ہی کے ساتھ شروع ہوئی۔ وہ مولانا سندھی کے عزائم کے عملی معاون تھے۔^{۵۱} نواب وقار الملک، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولوی محی الدین قصوری نے پچاس روپیہ ماہوار دینا طے کیا۔ اس کے علاوہ کچھ رقوم سفراء کے وسیلہ بھی حاصل ہوتی تھیں۔

حکومت کی خفیہ پولیس کا کہنا تھا کہ جمیعتہ الانصار اور نظارۃ المعارف قرآنیہ جیسی تعلیم گاہوں میں حکومت برطانیہ کے خلاف جذبات بھڑکائے گئے۔ جمیعتہ الانصار میں سازش کی بنیاد رکھی گئی۔ اور دیوبند میں مشنریوں کی تربیت گاہ بنانے میں ناکام ہونے پر دہلی میں اس سازش کی بنیاد رکھی گئی جس میں مولوی ابو محمد، مولوی محمد میاں، مولوی انیس احمد، خواجہ عبدالحی، مولوی ظہور احمد، عبید اللہ کے ساتھی تھے۔ یہ ادارہ سارشیوں کے وقتاً فوقتاً مل بیٹھنے کے لئے ایک تخیلہ گاہ کا کام دیتا تھا۔ عبید اللہ نے قرآن کی جو خاص تشریح و تفسیر بنائی وہ جہاد کی فریضیت کے بارے میں تھی۔ وہ تعلیم کے دوران بالعموم مذہب کے سیاسی پہلو پر زیادہ زور دیتے اور خاص طور پر جہاد اور قربانی کی فریضہ پر۔^{۵۲}

حضرت شیخ الہند کے خیال میں مسلمانوں کی پستی اور تباہ حالی کی ایک سب سے بڑی وجہ قرآن کو چھوڑ دینا تھا۔ ان کے خیال میں آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ قرآن کو لفظاً و معنیاً عام کیا جائے۔^{۵۳} اسی خیال کے مد نظر شیخ الہند نے مولانا سندھی کے ذریعہ نظارۃ المعارف کا نام سے درس قرآن ایک حلقہ قائم کرایا تھا جنہوں نے رفتہ رفتہ متحرک اور فعال افراد پر مشتمل ایک جماعت اپنے گرو جمع کر لی۔^{۵۴}

مولانا ان نوجوانوں کی صلاحیتوں و تدبیر، سیاست فہمی اور اعتماد کا اندازہ لگاتے اور کبھی کبھی اس جماعت کو لے کر دہلی سے باہر بھوپال وغیرہ بظاہر سیر و تفریح و بباطن سیاسی تربیت کے لئے جاتے۔ مولانا سندھی کو اس پروگرام میں بھوپال کے بعض اہل الرائے حضرات کی ہمدردیاں بھی حاصل تھیں۔^{۵۵} مولانا نے ہر طالب علم کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا جو اسے باقاعدہ ملتا تھا۔ سب طلباء ایک جگہ کھانا کھاتے تھے اور کبھی کبھی تو صرف چنوں پر گزار بسر ہوتی تھی۔^{۵۶}

نظارۃ المعارف کے ناظم کی حیثیت سے وہ مختلف ملی اور تعلیمی اجتماعات میں شریک ہوتے

اور تقاریر کرتے جنکا موضوع صرف قرآن فہمی ہوتا۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس ۱۹۱۳ء منعقدہ آگرہ اور ۱۹۱۴ء کے راولپنڈی کے اجلاس میں اسی موضوع پر انہوں نے مقالات پیش کئے۔

اجلاس آگرہ میں انہوں نے اپنے مقالہ میں صرف دو امور پر بحث کی تھی اول یہ کہ جدید طبقہ میں مذہبی تعلیم کی کس حد تک ضرورت ہے اور اس طبقہ کی تعلیم کیلئے کس نوع کے مضامین پر زور دیا جائے۔

اجلاس راولپنڈی کی تقریر انہوں نے صرف قرآن تک محدود رکھی اور یہ کہ صرف مذہب ہی مسلمانوں کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ انہوں نے کہا ”کہ عام مسلم گھرانوں کے افراد سے جب بچوں کو مذہبی تعلیم دینے کی بات کی جاتی ہے تو ان کا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ طالب علموں کو نصاب ہی فرصت نہیں لینے دیتا۔ لیکن جتنا وقت سینکڑوں مشن اسکول اور کالجوں کے مسلمان اور ہندو طالب عالم بائبل کے لئے دیتے ہیں کیا اتنا وقت قرآن کی تعلیم کے لئے ہمارے قومی اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم نہیں دے سکتے۔“ ۵۷

”علیگزھ کالج کے طالب علم جو میرے دوست ہیں اتفاق سے سینٹرل انڈیا کے ایک مشن اسکول میں تعلیم پاتے تھے۔ جب امتحان کا زمانہ قریب ہوا تو تیاری کے لئے روزانہ کے تمام اسباق بند ہو گئے۔ مگر بائبل کلاس جو خود پرنسپل صاحب لیتے تھے جاری رہی۔ ایک روز یہ پرنسپل صاحب کے پاس گئے کہ اب امتحان بہت قریب آگیا ہے ہمیں صرف بائبل کلاس کی وجہ سے کالج آنا پڑتا ہے۔ اگر آپ اسکولم تو فرمادیں تو ہم پوری طرح امتحان کی تیاری کر سکیں گے پرنسپل نے جواب دیا۔ یہ تمام عورتیں۔ تم سب طالب علم اور میں اور تمام پروفیسر فقط اسی ایک گھنٹہ کی بدولت یہاں ہیں۔ اگر یہ گھنٹہ نہ ہو تو یہ کالج بھی نہ ہو۔ مولانا نے کہا کہ اگر ہم صرف اس واقعہ کی تقلید کر سکیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“ ۵۸

مولانا سندھی نے ۱۹۱۴ء میں مولانا ابولکلام کی تحریک نظم جماعت کے لئے بھی کوشش کی جس کا منشاء تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مذہب کی راہ سے منظم کیا جائے۔ مسلمانوں کا ایک امام ہو اور امام کی اطاعت کو وہ اپنا دینی فرض سمجھیں۔ کیونکہ امام کے بغیر انسان کی زندگی غیر اسلامی ہے اور ان

کی موت جاہلیت پر ہوگی اور جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد امام کو مان لے تو امام ہندوں سے معاندہ کر کے انگریزوں پر جہاد کا اعلان کرے اور ہندو مسلمانوں کی متحدہ قوت سے انگریزوں کو شکست دے دی جائے۔

مولانا آزاد کا بیان ہے کہ ”میں نے ہندوستان کے بعض اکابر علماء و مشائخ کو عزم و سعی کی دعوت دی بعض سے خود ملا اور بعض کے پاس مولانا عبید اللہ کو بھیجا اکثر نے یہی کہا کہ جب علماء و مشائخ کی اتنی بڑی تعداد ملک میں موجود ہے اور کسی نے بھی آج تک یہ دعوت نہیں دی تو اب سواد اعظم کے خلاف یہ قدم کیوں اٹھایا جا رہا ہے۔ صرف ایک شخصیت کو مستثنیٰ کرنے کے بعد سب کا متفقہ جواب یہی تھا کہ یہ دعوت ایک فتنہ ہے۔ اور وہ واحد شخصیت مولانا محمود حسن کی تھی“۔ ۵۹

یکم فروری ۱۹۱۵ء کو مسلم یونیورسٹی کی جامع مسجد کی تکمیل کے موقع پر جو تقریباً بائیس سال کی مدت میں کالج کے سکریٹری نواب محمد اخلق خاں کی سیکریٹری شب کے عہد میں مکمل ہوئی تھی۔ ایک عظیم الشان جلسہ کا انعقاد کیا گیا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، امام جامع مسجد دہلی سید احمد صاحب، درگاہ شاہ غلام علی (سرسید کے والد علی متقی کے مرشد تھے۔ سرسید کے رسم بسم اللہ آپ ہی نے کرائی تھی) کے سجادہ نشین مولانا ابوالخیر صاحب کے علاوہ نظارۃ المعارف قرآنیہ کے ناظم کی حیثیت سے مولانا عبید اللہ نے بھی شرکت کی۔ ۶۰

کالج کی جامع مسجد کی تکمیل کے اس موقع پر طلباء کے لئے تفسیر اور تجوید قرآن کے مقابلوں کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

اس موقع پر منعقدہ جلسہ سے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبید اللہ سندھی نے خطاب کیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے یونیورسٹی میں قرآن کی تعلیم پر اظہار اطمینان اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں۔ ایم۔ اے۔ او کالج کے طلباء اور دوسرے عدیم الفرصہ لوگوں کے لئے انہوں نے یہ طریقہ تجویز کیا کہ وہ قرآن کو اول با معنی اور غور سے پڑھیں۔ اس کے بعد اس کو اس نظر سے پڑھیں کہ جو شکوک ہوں انکو نوٹ کرتے جائیں اور

تیسرے دور میں ان شکوک کو کسی استاد سے رفع کریں۔ ۶۱

یہ عجب بے چینی اور اضطراب کا زمانہ تھا۔ نو جوانوں کے دلوں میں ہیجان برپا تھا۔ ۱۹۱۱ء کے بعد سے شمالی افریقہ کے تمام ممالک ایک ایک کر کے استعمار کی نذر ہو چکے تھے۔ طرابلس پر اٹلی نے اچانک حملہ کر دیا تھا۔ برطانیہ نے مصر پر اپنے قبضے کا اعلان کرتے ہوئے ترکی فوجوں کو طرابلس کی طرف جانے سے روک دیا تھا۔ روس نے برطانیہ کے ساتھ ایران اور افغانستان کو تقسیم کرنے کی سازش کر لی تھی جس کے تحت برطانیہ نے جنوبی ایران کے حملوں کے تعاون پر روس کو ایران کے شمالی صوبوں پر قبضہ کی اجازت دے دی تھی۔ ۶۲

بلاد اسلامیہ کے حصے بخرے کرنے کے لئے مغربی ممالک نے اتحاد کر لیا تھا۔ جس کا اثر ہندوستانی مسلمانوں پر پڑ رہا تھا سامراجی چالوں کے مقابلوں اور مقام مقدسہ کی حرمت بچانے اور خلافت کے لئے مسلمان جان کی بازی لگانے کو تیار تھے۔

ہندوستان کی مسلم قیادت میں ایک اہم موڑ آچکا تھا۔ اب ان کا سفر وفاداری سے حریت کی طرف اٹھ رہا تھا۔ پے در پے ایسے حالات پیش آرہے تھے جنہوں نے ہند کی ملت مسلمہ کو ایک نقطہ پر جمع کر دیا تھا۔ ہندوستان کے مسلمان جواب تک سیاست کے شجر ممنوعہ سے اپنا دامن بچایا کرتے تھے ان حالات سے متاثر ہو کر برطانوی سامراج کے مقابلہ پر آ گئے تھے۔ اس زمانہ میں جو تحریکات شروع ہوئیں انہوں نے خلوت نشین علماء، مولوی، اور صوفیوں کو خالص مذہبی بنیادوں پر میدان عمل میں اتار دیا۔ انہی ایام میں مسجد فتحپوری میں مسلمانوں کا جو اجتماع ہوا اس میں امام جامع مسجد اور امام فتحپوری جیسے نیاز منداں حکومت کو بھی عوامی دباؤ اور جوش کی وجہ سے میدان میں آنا پڑا گو بددلی کے ساتھ۔ ۶۳

سلطان عبدالحمید نے خلافت عثمانیہ کو عالم اسلام کا حقیقی مرکز بنانے کی جو تحریک شروع کر رکھی تھی اس نے ہندوستانی مسلمانوں کے تخیل کو چھیر دیا تھا اور وہ اسلام کی عالمگیر نشاۃ الثانیہ کے خواب دیکھنے لگے تھے۔

اس وقت کچھ لوگوں کی ساری امیدیں ترکی خلافت سے وابستہ تھیں جس کے خلاف دول

یورپ نے جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ ہندوستان کے مسلمان اپنے ترک بھائیوں کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ ہر حساس مسلمان کے غیر متمدد دل میں ایک بے چینی تھی۔ اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ برطانوی سامراج مسلمانوں کا بدترین دشمن ہے۔

حضرت شیخ الہند ہندوستان کے اندر مسلح انقلاب کے ذریعہ انگریزوں کا اقتدار ختم کرنے کے منصوبہ بنا رہے تھے۔ ان کے شاگردوں اور فقہاء کار کی ایک بڑی تعداد جو ہند اور بیرون ہند کے کئی ممالک میں پھیلی ہوئی تھی ان کے مشن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نہایت سرگرمی اور جانبازی کے ساتھ کوشاں تھی۔

اس وقت ایک عام خیال یہ تھا کہ طاقت کے بغیر انگریزوں کا ہندوستان سے نکال دینا ممکن نہیں اس لئے جنگ آزادی کے لئے ضروری ہے کہ اسلحہ اور سپاہ وغیرہ کے لئے غیر ملکی امداد و اعانت حاصل کی جائے۔ ہندوستان اور افغانستان کی سرحدیں ملنے کی وجہ سے وہاں سے مدد اور اسلحہ ملنا آسان تھا اس لیے شیخ الہند کی نگاہ افغانستان پر گئی۔

ان کا خیال تھا کہ اس جہاد میں ہندوستان کی سرحدوں پر بے قبائل سے بھی مدد لی جاسکتی تھی شیخ الہند کا منصوبہ تھا کہ افغانستان سے لے کر ہندوستان تک انگریزوں کے خلاف ایک جال بچھا دیا جائے اور کسی مناسب موقعہ برطانوی ہند پر افغانستان حملہ آور ہو اور دوسری طرف ملک میں جنگ آزادی کا اعلان کر دیا جائے تو ان کے خیال میں ایسی صورت حال پیدا ہو جائے گی جس کا انگریز مقابلہ نہ کر سکیں گے۔

مسلل کوششوں کے نتیجہ میں شیخ الہند اور ان کے رفقاء کے خیال میں اب اندروں ملک زمین ہموار ہو چکی تھی اور اس انقلابی پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے بیرونی ممالک سے روابط اور تعلقات پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ ملک کے سیاسی حالات کے پس منظر کو سامنے رکھ کر شیخ الہند نے مولانا عبید اللہ کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ اپنے سابقہ نصب العین سے ہٹ گئے۔ شیخ الہند نے ان سے کہا کہ جب تک انگریزی حکومت اور اقتدار ہندوستان میں قائم ہے تو جس مدت تک تم اپنی اس تعلیم اور اس مدرسہ سے دس بیس آدمی صحیح النیال مسلمان بناؤ گے اس مدت میں انگریز ہزاروں کو لٹھاؤ اور زندیق بنادیں گے۔ چنانچہ مولانا عبید اللہ کی سمجھ میں حضرت شیخ الہند کی اسکیم آگئی اور وہ علوہمتی اور تن

وہی کے ساتھ تمام ہولناک مصائب کو پس پشت ڈالنے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیلنے کو تیار ہو گئے۔ اور آزادی ہند اور آزادی ممالک اسلامیہ انکا نصب العین ہو گیا۔ ۶۴

یاغستان سے بار بار تقاضے ہو رہے تھے کہ حضرت شیخ الہند مرکز میں آجائیں تو اطراف و جوانب سے مجاہدین جمع ہو جائیں گے۔ مگر حضرت شیخ الہند کو مالی امداد کی وجہ سے اس کی مصلحت معلوم نہ ہوئی۔ کیونکہ مرکز کو مالی امداد کی زیادہ ضرورت تھی۔ کہ رسد و کار تو میں ختم ہو جانے کی بنا پر ضروری تھا کہ کوئی باقاعدہ حکومت پشت پناہ ہو جو رسد اور ہتھیار پہونچاتی رہے۔ اس لیے شیخ الہند نے یاغستان جانے کا ارادہ منسوخ کر دیا۔

چنانچہ ۱۹۱۵ء میں مولانا محمود الحسن نے مولانا عبید اللہ سندھی کو افغانستان اور آزاد قبائل میں کام کرنے کے لئے بھیجا اور دوسری طرف دولت عثمانیہ سے تعلقات قائم کرنے کیلئے جو انقلابی پروگرام کی تکمیل کے لئے از بس ضروری تھا خود حج کا سفر اختیار کیا۔

مولانا محمد میاں کا خیال ہے کہ: ”کار پردازان حکومت کا اس وقت یہ احساس تھا کہ مولانا خود یاغستان اس لئے تشریف نہیں لے گئے کہ دارالعلوم دیوبند حکام کی نظر میں مشتبہ ہو جاتا“۔ ۶۵

ملک معظم بنام عبید اللہ وغیرہ انسٹھ افراد کے نام بغاوت کا جو مقدمہ ان کی غیابت میں دائر کیا گیا تھا اس میں بتایا گیا تھا کہ ”یکم جنوری ۱۹۱۳ء کے بعد سے عبید اللہ نے برطانوی ہند کے باہر اور اندر ملک معظم شہنشاہ کو برطانوی ہند کے اقتدار اعلیٰ سے محروم کرنے ان کے خلاف جنگ کرنے اور مخالفین کو جنگ میں مدد دینے کی سازش کی ہے۔“ ۶۶ سرکاری کاغذات سے جون ۱۹۱۵ء سے عبید اللہ کا کوئی پتہ نہیں۔ اس تاریخ کے بعد سے اسے برطانوی ہند میں نہیں دیکھا گیا۔ معلوم ہوا ہے کہ اس نے پرانے روابط کو تازہ کیا ہے اور براہ کوٹہ قند ہار روانہ ہو گیا ہے۔ ۶۷

مولانا عبید اللہ کی روانگی کے سلسلہ میں بڑا مسئلہ روپیہ کی فراہمی کا تھا۔ اس سلسلہ میں مولانا آزاد سیٹھ عبداللہ ہارون سے ملے اور انہوں نے بے تامل پانچ ہزار روپیہ دئے جو مولانا کو بھجوا دئے گئے۔ ۶۸ مولانا شوکت علی نے پانچ ہزار روپیہ کا انتظام کیا۔ وہ یہ روپیہ دینے خود مسجد فتحپوری گئے تھے مگر

مولانا سندھی کی عدم موجودگی میں اصطفیٰ کریم کو روپیہ دئے گئے۔ جو ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے گریجویٹ تھے اور نظارۃ المعارف میں شامل ہو گئے تھے۔ مولانا شوکت علی کے رقم فراہم کرنے کی خبر کچھ حوالوں سے سرکار کو پہنچ گئی۔ ۶۹ خفیہ پولس مولانا سندھی پر متعین تھی اور ان کی ہر حرکت کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ اس لئے مولانا ان کی توجہ ہٹانے کے لئے بھاو پور اور سندھ کی طرف چلے گئے۔ ۷۰

مولانا عبید اللہ کے دہلی سے چلے جانے کے بعد مولانا احمد اعلیٰ بحیثیت نائب ناظم نظارۃ المعارف کو چلاتے رہے۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد انہیں گرفتار کر لیا گیا اور جھکڑیاں ڈال کر لاہور لے جایا گیا۔ اس طرح یہ مرکز بند ہو گیا۔

ایک افواہ یہ تھی کہ یہ درسگاہ بعض طلباء کی خفیہ کارواہیوں کی وجہ سے بند ہوئی جو درپردہ حکومت کے جاسوس تھے خیال تھا کہ مولوی انیس احمد اس گرفتاری کا باعث بنے تھے۔

مولانا کے ہندوستان واپس آنے پر ۱۹۳۹ء میں جب ضیاء الدین برنی نے مولانا سندھی سے یہ سوال کیا تو ان کا جواب تھا ”درسگاہ کے بند ہونے کے جہاں اور بہت سے اسباب تھے وہاں حکومت کا رویہ بھی کسی حد تک ذمہ دار تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مسلمانوں میں صحیح اسلامی روح پھیلے۔ مدرسہ کے بند ہونے کا انیس احمد کی ذات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ضیاء الدین صاحب کا کہنا ہے کہ مولانا سندھی کی گفتگو سے مجھے اس آگ کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکا جو ان کے سینے میں دھک رہی تھی۔ اس نشت میں زیادہ تر گفتگو مسلمانوں کی سیاسی، اخلاقی و معاشی حالت پر ہوئی۔ وہ ان کے مرض اور علاج سے واقف تھے۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہیں اور محمدؐ عربی کی طرف پھر سے لوٹ جائیں۔ محض مادی ترقی سے ہمارے مرض کا مداوا نہیں ہو سکتا۔“ انہوں نے کہا کہ میں پرانی درسگاہ کی بنیاد پر ایک نئی درسگاہ کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ اے

مآخذ و حواشی

- ۱۔ قاری محمد طیب۔ دارالعلوم کی صد سالہ زندگی۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ مرتبہ سید محبوب رضوی۔ ص ۱۱
- ۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۶۸
- ۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۷۸
- ۴۔ سید محمد میاں۔ علماء حق، جلد اول۔ ص ۱۱۲
- ۵۔ عبدالرحمن۔ معماران پاکستان۔ ص ۵۲۱-۵۲۰
- ۶۔ ڈاکٹر اقبال حسن۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن۔ ص ۱۸
- ۷۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی۔ دیوبند اور مطالبہ پاکستان (انگریزی) ص ۵۸
- ۸۔ عبید اللہ سندھی۔ خطبہ جو دیا نہ جاسکا۔ مولانا سندھی کا انقلابی منصوبہ۔ ص ۱۳۰
- ۹۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ نقش حیات۔ حصہ اول۔ ص ۱۳۲
- ۱۰۔ انوار الحسن شیرکوٹی۔ خطبات شبیر احمد عثمانی۔ ص ۱۸
- ۱۱۔ احمد حسین امروہوی (۱۲۶۷ھ-۱۳۳۰ھ) امروہہ کے مشہور رضویہ خاندان سے تعلق تھا۔ مراد آباد کے مدرسہ شاہی کے پہلے صدر مدرس تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ طب کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ امروہہ کی جامع مسجد میں بھی ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی سے سلسلہ بیعت و خلافت تھا، ان کے مضامین کا ایک مجموعہ افادات احمدیہ کے نام سے شائع ہوا ہے۔
- ۱۲۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ نقش حیات، حصہ اول۔ ص ۱۳۴
- ۱۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۳۴
- ۱۴۔ اقبال حسن خاں۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن۔ ص ۲۲۲-۲۲۳
- ۱۵۔ سید محمد میاں۔ علماء حق، حصہ اول۔ ص ۱۳۴
- ۱۶۔ ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن۔ ص ۲۸

- ۱۷۔ مفتی عزیز الرحمن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص ۱۷۵-۱۷۶
- ۱۸۔ سید محمد میاں۔ تحریک شیخ الہند۔ ص ۶۲
- ۱۹۔ محمد ایوب قادری۔ کاروان رفتہ۔ ص ۲۳۱
- ۲۰۔ سید محبوب رضوی۔ تاریخ دارالعلوم۔ ص ۲۲۲۔ بحوالہ روندادار العلوم ۱۳۲۸ھ ص ۲۱
- ۲۱۔ ضیاء الحسن فاروقی۔ دیوبند اور مطالبہ پاکستان (انگریزی)۔ ص ۵۱
- ۲۲۔ سید محمد میاں۔ تحریک شیخ الہند۔ ص ۱۹۲
- ۲۳۔ ضیاء الحسن فاروقی۔ دیوبند اور مطالبہ پاکستان (انگریزی) ص ۵۹
- ۲۴۔ انوار الحسن شیرکوٹی۔ خطبات شبیر احمد عثمانی۔ ص ۱۱
- ۲۵۔ مولانا محمد میاں۔ تحریک شیخ الہند۔ ص ۱۹۳-۱۹۴
- ۲۶۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ۔ ص ۳۳۱
- ۲۷۔ عبد الرحمن۔ معماران پاکستان۔ ص ۱۴۷
- ۲۸۔ مکتب مولانا عبید اللہ سندھی۔ مرتبہ ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ ص ۱۴۴
- ۲۹۔ رشید الوحیدی۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ حیات و کارنامے۔ ص ۱۳
- ۳۰۔ حسین احمد مدنی۔ نقش حیات، جلد دوم۔ ص ۴۱
- ۳۱۔ مناظر احسن گیلانی۔ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن۔ ماہنامہ دارالعلوم جمادی الثانی ۱۳۷۲-۷۳ ص ۴۲
- ۳۲۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ نقش حیات، جلد دوم۔ ص ۱۴۴
- ۳۳۔ ایضاً ایضاً ص ۲۴۰
- ۳۴۔ جے پیڈورسن۔ مختصر قاموس اسلام (انگریزی) ص ۳۰۰-۳۰۱
- ۳۵۔ مولانا محمد میاں۔ تحریک شیخ الہند۔ ص ۴۹
- ۳۶۔ مکتب مولانا سندھی۔ مرتبہ ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ ص ۲۱
- ۳۷۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ نقش حیات، جلد دوم۔ ص ۲۴۰

- ۳۸۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔ ماہنامہ برہان: اپریل ۱۹۴۵ء۔ ص ۱۹۷
- ۳۹۔ ڈاکٹر اقبال حسن خاں۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن۔ ص ۲۳۱
- ۴۰۔ ایضاً ایضاً ص ۲۳۲
- ۴۱۔ مکتب مولانا سندھی۔ مرتبہ ابوسلمان شاہ جہاں پوری۔ ص ۲۱-۲۲
- ۴۲۔ حسین احمد مدنی۔ نقش حیات جلد دوم۔ ص ۱۴۴
- ۴۳۔ ایضاً ایضاً ص ۲۱
- ۴۴۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۶۶
- ۴۵۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۶۶-۶۷
- ۴۶۔ ایضاً ایضاً ص ۶۶-۶۷
- ۴۷۔ ایضاً ایضاً ص ۲۶
- ۴۸۔ مولانا سیف الرحمن، اصلاً پٹھان تھے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی سے علم حدیث کی تکمیل کی۔ کچھ عرصہ ریاست ٹونک میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ مدرسہ فتحپوری میں مدرس اول ہو گئے۔ بعد میں حضرت شیخ الہند نے انہیں یاغستان کی طرف ہجرت کا حکم دیا تا کہ وعظ و تبلیغ کے ذریعہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنائیں۔ حاجی ترنگ زئی کے ہمراہ انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد میں حصہ لیا۔ جنود اللہ میں ان کا عہدہ معین سالار کا تھا۔
- ۴۹۔ غلام مصطفیٰ قاسمی۔ الولی عبید اللہ سندھی نمبر۔ ص ۸
- ۵۰۔ سید محمد میاں۔ تحریک شیخ الہند۔ ص ۱۴۴-۱۴۵
- ۵۱۔ قاضی عبدالغفار۔ حیات اجمل۔ ص ۱۳۱
- ۵۲۔ سید محمد میاں۔ تحریک شیخ الہند۔ ص ۱۸۹-۲۵۰
- ۵۳۔ جسٹس محمد تقی عثمانی۔ اکابر دیوبند۔ ص ۱۷
- ۵۴۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۶۶

- ۵۵۔ محمد ایوب قادری۔ کارواںِ رفته۔ ص ۲۳۵
- ۵۶۔ سید عابد علی وجدی الحسینی۔ بھوپال تحریک آزادی کے آئینہ میں۔ ص
- ۵۷۔ عبید اللہ سندھی۔ تعلیماتِ قرآنی۔ مرتبہ عبدالرحمن۔ ص ۱۰۶
- ۵۸۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۰۷
- ۵۹۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبید اللہ سندھی۔ الرحیم۔ ص ۴۴
- ۶۰۔ ڈاکٹر سعود عالم قاسمی۔ مسلم یونیورسٹی اور انوارِ سیرت۔ ص ۴۳
- ۶۱۔ ایضاً ایضاً ص ۴۴
- ۶۲۔ محمد علی قصوری۔ مشاہداتِ کابل و یاغستان۔ رسالہ تاریخ و سیاست اپریل ۱۹۵۱ء۔ ص ۶۷
- ۶۳۔ قاضی عبدالغفار۔ حیاتِ اجمل۔ ص ۱۵۶-۱۵۷
- ۶۴۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ نقشِ حیات جلد دوم۔ ص ۱۴۰
- ۶۵۔ مولانا محمد میاں۔ تحریکِ شیخ الہند۔ ص ۱۱۲
- ۶۶۔ ایضاً ایضاً ص ۱۸۳
- ۶۷۔ ایضاً ایضاً ص ۷۶
- ۶۸۔ ایضاً ایضاً ص ۶۸
- ۶۹۔ چودھری خلیق الزماں۔ شاہراہِ پاکستان۔ ص ۲۹۵
- ۷۰۔ مولانا محمد میاں۔ تحریکِ شیخ الہند۔ ص ۶۸
- ۷۱۔ ضیاء الدین برنی۔ عظمتِ رفته۔ ص ۱۱۷

باب پنجم

افغانستان کا کارگہ عمل

اپریل ۱۹۱۵ء میں مولانا سندھی کابل جانے کے ارادہ سے دہلی چھوڑ کر سندھ چلے آئے۔ جہاں ۴ ماہ اگلی منزل کی تیاری میں لگ گئے۔^۱

چند خاص لوگوں کے علاوہ کسی کو ان کے ارادہ کا علم نہ تھا۔ جانے سے چند روز قبل آپ نے مدرسہ دارالارشاد گوٹ پیر جھنڈا کے طلباء اور اساتذہ کو پارکھ داہ نہر کے کنارے جو مدرسہ کے مغربی کنارے پر ایک پر فضا مقام ہونے کی وجہ سے عمدہ تفریح گاہ تصور کی جاتی تھی دعوت دی۔ اس دعوت میں آم کے ساتھ سندھ کی مشہور مچھلی پلا بھی تھی۔^۲

کابل روانہ ہونے سے قبل مولانا سندھی نے مولانا محمد صادق کراچی کے بھتیجے شیخ محمد ابراہیم کو جو بمبئی یونیورسٹی سے اقتصادیات میں ایم اے تھے اور مولانا سے عقیدت رکھتے تھے کابل میں حبیبیہ اسکول میں معلم کے طور پر بھیج دیا تھا۔ جنہوں نے مولانا سندھی کی آمد سے قبل یہاں فضا کو تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور یہاں کے سربر آوردہ افراد اور خاص طور پر سپہ سالار نادر خاں کو ان کی شخصیت سے متعارف کروادیا تھا۔^۳

عبداللہ لغاری نے جو مولانا کے شریک سفر تھے لکھا ہے کہ اسی اثناء میں مولانا سندھی نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پشاور میں ہونے والی کانفرنس میں شرکت کی جہاں مسلمانوں کے

صف اول کے کئی رہنماؤں سے جو نظارۃ المعارف کے کاموں میں ان کے شریک کار تھے بات چیت کی۔ مگر مولانا لغاری کو سہو ہوا ہے کیونکہ کانفرنس کا کوئی اجلاس پشاور میں منعقد نہیں ہوا۔^۵

پشاور سے وہ سندھ چلے آئے۔ کراچی میں مولانا سندھی نے دارالرشاد کی شاخ کھولی تھی۔ اور تعلیم کے لئے دو تنخواہ دار معلم رکھے تھے۔ چار پانچ مہینے تو وہ شاخ چلی مگر مستقل سرمایہ فراہم نہ ہونے کے باعث وہ بند ہو گئی۔ معلمین کی تنخواہ کے بقیہ جات واجب رہ گئے تھے۔ مولانا سندھی کا ارادہ تھا کہ کابل جانے سے قبل قرض سے دامن پاک ہو جائے۔ اس کے لئے انہوں نے دارالرشاد پیر جھنڈا کے مہتمم عبداللہ لغاری کی معرفت درگاہ ہالا کے سجادہ نشین مخدوم پردہ جام صاحب سے ایک ہزار روپیہ منگوائے۔ جس سے انہوں نے کراچی آکر قرضہ بیباق کیا۔^۶

ڈاکٹروں کی صلاح پر بظاہر بحالی صحت کے لئے مولانا دین پور ہوتے ہوئے کوئٹہ پہونچے جہاں عبداللہ لغاری اور احمد علی بھی ان کے پاس پہونچ گئے۔ زادراہ کے لئے کچھ چندہ بھی جمع ہو گیا تھا۔ شیخ عبدالرحیم حیدر آبادی کے اہل خانہ نے اپنے زیورات بیچ کر ان کے لئے زادراہ کا انتظام کیا۔ کئے کوئٹہ سے انھوں نے شراوک تک جو افغانستان کی سرحد پر سومیل کی مسافت پر واقع ہے ایک گنی کی اجرت پر ایک راہبر کو ساتھ لیا۔^۷

برطانوی خفیہ پولیس سے بچنے کے لئے انہوں نے عام راستہ سے ہٹ کر سفر کیا جس سے راستہ طویل ہو گیا تھا۔ افغانستان میں وہ شراوک کے علاقہ میں داخل ہوئے۔ پاسپورٹ کے بغیر سفر کرنے پر قدرتی طور پر وہ افغانستانی حکام کی نظر میں مشتبہ ٹہرے۔ مگر سوالات کے جوابات نے ان کے شکوک رفع کردئے اور حکومت کا مہمان قرار دیتے ہوئے ان کے قندھار پہونچنے کا انتظام دیا گیا۔^۸

قندھار کے نائب الحکومت نے چند روز نہایت احترام سے مہمان رکھا۔ کابل کے سفر کا ہی نہیں بلکہ چند روز کابل میں رہنے کا انتظام بھی کر دیا۔ اس طرح وہ ۱۵ اکتوبر کو کابل پہونچے۔^۹

ان کے ملک چھوڑنے کا اندازہ حکومت کو جلد ہی ہو گیا۔ کیونکہ سرکاری گماشتوں کی رپورٹ

میں کیا گیا تھا کہ ۱۱ جون ۱۹۱۵ء سے عبید اللہ کا کوئی پتہ نہیں اور اس تاریخ کے بعد انہیں برطانوی ہند میں نہیں دیکھا گیا۔ معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے اپنے پرانے روابط کو تازہ کیا ہے اور براہ کوشہ قندھار روانہ ہو گئے ہیں۔^{۱۱}

مولانا عبید اللہ سندھی آزادی ہند کے نصب العین پر کابل بھیجے گئے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ کابل پہنچ کر انہیں حضرت شیخ الہند کے منصوبہ کی نوعیت معلوم ہوئی کہ طاقت کے ذریعہ جہاد کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ شیخ الہند جس جماعت کے نمائندے تھے اس کی پچاس سالہ محنتوں کا حاصل ان کے سامنے غیر منظم شکل میں موجود تھا۔ اور یہ کہ کابل میں انہیں شیخ الہند کی نمائندگی کرنی تھی انہیں اس ہجرت اور شیخ الہند کے انتخاب پر فخر ہونے لگا تھا۔^{۱۲}

مولانا حسین احمد مدنی کا خیال ہے ”کہ اس ارشاد قرآنی“ یا ایہا اللدین آمنوا اخذوا حذرکم فانصر واثنتاوا انصرو اجمیعا“ کی روشنی میں حضرت شیخ الہند نے اپنی سرگرمیوں کا ایک مرکز کابل میں قائم کرنا چاہا (کیونکہ تجربہ سے یاغستان جو ۱۹۰۵ء سے مرکز خارجی تھا نا کام ثابت ہوا تھا) اور اس کے لئے مولانا سندھی کی نگرانی کو مناسب سمجھ کر انہیں کابل جانے کا حکم دیا تھا۔ ایک کامیاب مدبر کی طرح حضرت شیخ الہند نے اپنی بیرون ہند سرگرمیوں کی تفصیلات سے مولانا سندھی کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ مولانا سندھی وہاں کے کام سے تو کیا اس کی ضرورت سے بھی نا بلد تھے۔ اس عظیم الشان اہم سفر کا حکم ان کو نہایت بے خبری میں غیر متوقع طور پر ملا تھا۔^{۱۳}

مولانا سندھی کا کہنا تھا کہ انہیں پروگرام نہیں بتایا گیا تھا اس لئے ان کی طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن تعمیل حکم کیلئے ہانا ضروری تھا۔^{۱۴}

محمد علی قصوری کا بیان ہے کہ ”امیر حبیب اللہ نے ہندوستان پر حملہ کرنے کا ذہن بنالیا تھا مگر وہ پہلے انڈین نیشنل کانگریس سے معاہدہ کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے انکی خواہش تھی کہ اس کام کیلئے مولانا محمد علی، حکیم اجل خاں، پنڈت موتی لال نہرو یا اس پایہ کے کسی اور ہندوستانی لیڈر کو کابل آنا چاہئے۔ حکیم صاحب کو جب کابل کی دعوت پہنچی تو انہوں نے مولانا عبید اللہ سندھی کو جن

کی گرفتاری کی افواہیں گرم تھیں کابل بھیج دیا مجھے اس کی پہلے سے اطلاع مل چکی تھی اسلئے میں نے مولانا سندھی کیلئے زمین ہموار کر دی تھی اور مولانا میرے ہی گھر آکر ٹہرے،^{۱۵}

انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے ہی افغانستان کی سیاست میں دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ افغانستان پر انگریزوں کا پہلا حملہ ۱۸۱۵ء میں ہوا۔ امیر دوست محمد خاں نے آنکھیں بند کر کے اپنے ملک کو انگریزی حملوں کی آماجگاہ بنا دیا۔ اور اس کے بعد مختلف جیلہ بہانوں سے انگریز افغانستان کی سیاست میں دخل دینے لگے۔ انگریزوں نے امیر عبدالرحمن کو روس سے بلا کر تخت پر بٹھایا تھا۔ اس لئے وہ حکومت افغانیہ کو اپنی ماتحت ریاست شمار کرتے تھے۔ خارجہ پالیسی میں وہ ہر طرح انگریزوں کے دست نگر تھے اور آزادانہ طور پر کسی ملک سے رابطہ نہ رکھ سکتی تھی۔^{۱۶}

روسی حملہ کے پیش نظر انگریزوں کے فوجی نمائندے معہ اسٹاف کابل میں رہنے لگے۔ امیر عبدالرحمن کے زمانے میں انگریزوں نے افغانستان سے ایک بڑی قاش اتار کر صوبہ شمال مغربی قرار دے دیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پچاس ہزار روپیہ وظیفہ میں بڑھا کر اس قاش ملک کو خریدا گیا تھا۔ کلم افغانستان کو انگریزوں سے ایک لاکھ روپیہ ماہانہ کی امداد ملنے لگی۔ جو بھی حکمران تخت پر بیٹھتا انگریزوں کی امداد اس کے شامل حال رہتی۔

افغانستان پر مکمل قبضہ کی ناکامی کے بعد انگریزوں کی یہ پالیسی رہی کہ افغانستان کو روس اور افغانستان کے درمیان بفرزون بنا دیا جائے۔^{۱۸}

امیر عبدالرحمن کے انتقال کے بعد امیر حبیب اللہ ۱۹۰۱ء میں تخت نشین ہوئے تو ایک اعلان کے ذریعہ سابقہ پالیسی برقرار رکھی۔ ان کا سارا بجٹ انگریزوں کے روپیہ کا ممنوں احسان تھا۔ امیر حبیب اللہ پر انگریزی حکومت کا اس قدر خوف طاری تھا کہ وہ علانیہ انگریز کے خلاف کسی سازش میں شرکت سے ڈرتے تھے۔^{۱۹} حکومت کہنے کو تو عین مطابق شریعت اسلامہ کہی جاتی تھی مگر افغانستان میں حکومت اور قانون سب امیر کی ذات میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ ہر لحاظ سے مطلق العنان بادشاہ تھے۔^{۲۰}

امیر حبیب اللہ اگرچہ اعلیٰ حضرت شاہ افغانستان کا لقب رکھتے تھے مگر سوائے ایک معمولی انگریزی قونصل کے جو عموماً مسلمان ہوتا تھا ان کے دربار میں کسی دوسری حکومت کا رسمی طور پر بھی کوئی آدمی نہیں رہتا تھا۔^{۲۱}

افغانستان تعلیمی لحاظ سے نہایت پست اور حکومت نہایت رجعت پسند اور خود غرض قسم کی تھی۔ افغانستان نے ہندوستان کی نقل میں اپنے اداروں کے پر شکوہ نام رکھ لئے تھے۔ لیکن وہ صرف الفاظ ہی تک محدود تھے اور ان کی حیثیت اسم بے مسمیٰ سے زیادہ نہ تھی۔^{۲۲}

افغانستان کے تعلق سے ہندوستان میں جو کچھ اطلاعات تھیں اس میں زیادہ تر شاعرانہ مبالغہ آمیزی سے کام لیا گیا تھا۔^{۲۳} افغانستان میں علوم اسلامی علی الخصوص علوم القرآن وحدیث نہایت کسمپرسی اور زوال کی حالت میں تھے۔ ایک اسلامی ملک میں علوم اسلامی سے یہ بے اعتنائی افغانستان جانے والوں کی نظر میں نہایت ہی قبیح امر تھی۔^{۲۴} ملک میں بظاہر ایک قاضی القضاۃ بھی تھے جو شرعی احکام کے نافذ سمجھے جاتے تھے۔ مگر ان کی اصل حیثیت اعلیٰ حضرت کی مرضی کے مطابق شریعت اسلامی کی توجیہ وتقید کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اعلیٰ حضرت کے ذاتی مشاغل میں مداخلت تو کیا انہیں عین مطابق شریعت ثابت کرنا قاضی صاحب کے وظائف میں شامل تھا۔^{۲۵}

مولانا سندھی کابل پہونچ کر شیخ محمد ابراہیم کے قریب ایک کرایہ کے مکان میں اترے اور انہی کے توسط سے ان سب افراد سے ملے جن کے لئے ان کے پاس تعارفی خطوط تھے۔ ان لوگوں میں سپہ سالار محمد نادر خاں اور سردار محمود طرزی تھے۔ سپہ سالار نادر خاں نے انہیں ہر طرح امداد دینے کا یقین دلایا اور مولانا کے قیام کابل میں جو سرکاری مشکلات آسکتی تھیں ان کو حتی المقدور حل کرنے کی کوشش کی۔ مولانا سندھی کا بیان ہے کہ کابل کے مقامی حالات کے تحت ان کا رابطہ سردار محمود طرزی سے زیادہ ہوتا گیا۔^{۲۶}

سردار محمود طرزی امیر حبیب اللہ خاں کے دونوں صاحبزادوں عنایت اللہ خاں اور امان اللہ خاں کے خسر تھے۔ شام اور ترکی میں طویل عرصہ قیام کیوجہ سے وہ ترکی معاشرت کے دلدادہ تھے اور

انگریزوں کے ترکوں کے خلاف صف آرا ہونے کی وجہ سے انگریزوں سے نفرت کرتے تھے۔

سردار محمود طرزی نے عنایت اللہ خاں معین السلطنت سے مولانا سندھی کی ملاقات کا اہتمام اپنے گھر کی گئی ایک دعوت میں کیا۔ اس طرح دوسرے افغان سرداروں کو مولانا کے کابل پہنچنے کی اطلاع ہو گئی۔ ۲۷

قاضی القضاۃ حاجی عبدالرزاق خاں جو افغانستان کے محکمہ شرعیہ (جسکو تحقیقات شرعیہ کہتے تھے) کے رئیس تھے وہ دیوبند کے فارغ التحصیل اور مولانا رشید احمد گنگوہی مرحوم کے شاگرد تھے۔ حاجی صاحب کے خاص تعلقات سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت کے ساتھ تھے جو غیر سرکاری طور پر افغانستان کے سیاسی حالات خاص کر امور متعلق قبائل سرحد کا انتظام کرتے تھے۔ انہوں نے مولانا کو نائب السلطنت کی خدمت میں پیش کرنا چاہا تھا۔ مگر مولانا سندھی کی خواہش تھی کہ یہ ملاقات سردار معین السلطنت سردار عنایت اللہ کے ذریعہ ہو جو امیر افغانستان حبیب اللہ خاں کے بڑے صاحبزادہ تھے۔ مولانا سندھی اپنی فراست کی وجہ سے کابل پہنچتے ہی سمجھ گئے تھے کہ سرداروں کی باہمی رقابتیں ان کے کام میں رکاوٹیں ڈال سکتی ہیں۔ دوسرے سلسلہ مراتب کا خیال رکھنا انہوں نے اپنے لئے ضروری سمجھا۔ حاجی عبدالرزاق خاں صاحب نے مولانا کی بات مان لی۔ سردار نصر اللہ خاں کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے مولانا سندھی نے اپنا مقصد سفر مختصر طور پر یوں لکھا کہ وہ مسلمانان ہند کے نمائندے کے طور پر افغانستان آئے ہیں۔ تاکہ شاہ افغانستان کو انگریزوں کے خلاف ہندوستان پر حملہ کی ترغیب دلائیں۔ ۲۸

سردار معین السلطنت کے ذریعہ مولانا سندھی ولی عہد سردار نائب السلطنت سے ملے جنہوں نے ان دونوں سے تخلیقہ میں ملاقات کی اور دو گھنٹہ تک مفصل حالات سنتے رہے۔ سوالات کئے جن کے جوابات سے وہ مطمئن ہو گئے۔ مولانا سندھی کا بیان ہے کہ یہ ایک طرح ان کا امتحان تھا جس میں وہ کامیاب ہوئے انہیں محسوس ہوا کہ نائب السلطنت اس گفتگو سے محفوظ ہوئے ہیں۔ ۲۹

ولی عہد سلطنت سردار نصر اللہ خاں نے مولانا سندھی سے اس گفتگو کا خلاصہ مانگا تھا۔ جس کو مولانا نے پندرہ دن کی مدت میں سات آٹھ صفحات پر لکھا اور مسودہ شیخ ابراہیم کو دکھایا جنہوں نے

اس میں بعض ترامیم کیں جس سے اس کو صرف ہندوستانی مسلمانوں کی تجویز کی بجائے تمام ہندوستان کی تجویز کا رنگ حاصل ہو گیا۔ یہ تحریر سردار محمود طرزی کی معرفت سردار ولی عہد سلطنت کو بھیج دی گئی اور انہوں نے اس کی اہمیت کی وجہ سے اپنے بھائی امیر حبیب اللہ خاں کی خدمت میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک روز سردار نائب السلطنت نے مولانا سندھی کو اپنی کوٹھی زین العمارۃ پر بلایا۔ عصر کے بعد امیر حبیب اللہ بھی وہاں آگئے اور انہوں نے مولانا کو اپنے حضور میں باریابی دی۔ مولانا سندھی نے ذاتی ڈائری میں اس ملاقات کا حال تحریر کیا ہے۔ ”کہ کمرہ میں اس وقت اعلیٰ حضرت (امیر حبیب اللہ خاں) اور سردار نائب السلطنت (سردار نصر اللہ خاں) کے سوا کوئی آدمی نہ تھا۔ سردار نائب السلطنت نے میرا عریضہ پیش کیا۔ آدھ گھنٹہ تک حضور اسے غور سے ملاحظہ فرماتے رہے۔ آخر میں دعائیہ فقرات سے بہت متاثر ہوئے۔“^{۳۱} عزیز احمد کا بیان ہے کہ مولانا نے اپنے عریضہ کا درج ذیل مصرعہ پر اختتام کیا تھا۔

دامن شہ آور دہ ام بکف گر بکشم زہے طرب گر بکشد زہے شرف

دم از ریاست دہلی نمی زخم ہرگز منم ز خاک نشیناں آں دیار و بس

اس عرضداشت کے جواب میں امیر نے فرمایا۔ مقصد ما قریب قریب است۔^{۳۲}

مولانا سندھی کا بیان ہے کہ ”امیر حبیب اللہ نے مختصر الفاظ میں پسندیدگی کا اظہار کیا اور کام کرنے کے لئے زبانی ایک حکم ارشاد فرمایا جس کی تعمیل میں امکان بھر آخر تک کام کرتا رہا۔ ہمارے عریضہ میں مبالغہ سے قطعی پرہیز کیا گیا تھا۔ اعلیٰ حضرت کو جس قدر بذات خود واقفیت تھی۔ ہمارا بیان اس کے قریب قریب رہا۔ ایک محکوم ملت میں ایک متوسط طبقہ کا آدمی اور پھر وہ بھی مذہبی عالموں میں صحیح معلومات کا مالک ہے۔ اور ایک ایسے نادر موقعہ پر صداقت کا خیال رکھتا ہے۔ اعلیٰ حضرت اور سردار نائب السلطنت کے لئے ایک نادر مثال تھی۔“^{۳۲}

پروفیسر سرور کا بیان ہے کہ مولانا نے اکثر مواقع پر فرمایا کہ امیر حبیب اللہ نے جس کام کا

حکم دیا تھا وہ یہ تھا کہ ”جو بھی کام کرو غیر مسلم اہل وطن سے ملکر کرو۔“^{۳۳} ۱۸۸۰ء میں خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید نے بھی مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ امن و سلامتی کے ساتھ رہنے اور آزادی کی جدوجہد میں مل کر کام کرنے کی ہدایت دی تھی۔^{۳۴}

سردار نائب السلطنت (نہر اللہ خاں) سے ملاقات کے بعد انہوں نے ان ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو پولیس کی حراست سے آزاد کرایا جو لاہور اور ہندوستان کے دیگر مقامات سے یاغستان ہوتے ہوئے کابل اس ارادہ سے پہونچے تھے کہ ترکی جا کر انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیں گے۔ مگر افغانستان پہونچتے ہی وہ غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہونے کے جرم میں گرفتار ہو گئے تھے۔ رہائی کے بعد ان کے لئے وہی گھرتجویز ہوا جہاں مولانا سندھی کا قیام تھا۔ مولانا کی خواہش تھی کہ وہ ترکی جانے کا خیال چھوڑ دیں اور کابل میں ان کے ساتھ رہ کر حکومت کی مصلحت جس قدر اجازت دیتی ہو کام کریں۔^{۳۵}

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے خلافت بہت کچھ تھی مگر افغانیوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس کے اندر ایک ایسا چھپا ہوا ہتھیار دیکھتے تھے۔ جو انگریزوں کے خلاف چلایا جاسکتا تھا۔^{۳۶}

مشہور انقلابی کارکن شوکت عثمانی کا بیان ہے کہ مولانا سندھی ہندوستانی معاملات میں امیر کے مشیر و صلاح کار تھے۔ وہ ہندوستانیوں سے ملتے تھے ان کے دلی حالات معلوم کرتے اور انہیں اپنی پارٹی میں شامل کرتے۔^{۳۷} وہ انہیں ترغیب دیتے کہ افغانی فوج میں شریک ہو جائیں۔^{۳۸}

مولانا سندھی کے کابل پہونچنے سے قبل ایک جرمن، ترکی اور ہندوستانی وفد کابل پہونچا تھا۔ اور اراکین حکومت سے ان کی مفصل ملاقاتیں ختم ہو چکی تھیں۔^{۳۹} افغانستان میں جو لوگ

انگریزوں کے خلاف تھے وہ اس مشن کی آمد سے خوش تھے۔ مگر افغان حکومت کو جس میں انگریز پرستوں کی اکثریت تھی۔ وفد اپنا ہموانہ بنا سکا۔ امیر حبیب اللہ ایک طرف اس مشن کے ساتھ تو دوسری طرف انگریزوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔^{۴۰} اور جب مولانا سندھی کی

ملاقات امیر حبیب اللہ سے ہو چکی تو انہیں وفد کے ہندوستانی ممبران سے ملنے کی اجازت ہو گئی۔^{۴۱}

افغانستان میں اس مشن کی آمد کا مقصد اور پس منظر یہ تھا کہ یورپ میں فرانس اور برطانیہ کے اشتراک نے جرمنی کی اس طرح ناکہ بندی کر رکھی تھی کہ اس کو ایشیاء میں پھیلنے پھولنے کا موقع نہ مل سکے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے جرمنی کو اپنے عزائم ملک گیری پورا کرنے کے لئے سنہرا موقع عطا کیا تھا۔ جرمن مصنف برن ہارڈی نے اپنی کتاب ”جرمنی اور آئندہ جنگ“ مطبوعہ ۱۹۱۱ء میں اس امر کا اشارہ دیا تھا۔ کہ بنگال کی ہندو آبادی میں پائے جانے والے انقلابی فوجی جذبات سے فائدہ اٹھا کر اور مسلمانوں سے رابطہ اور اتحاد قائم کر کے حکومت برطانیہ کے عالمگیر اقتدار کی بنیادیں نہ صرف ہندوستان بلکہ مشرق وسطیٰ تک متزلزل کی جاسکتی ہیں۔^{۴۲} پہلی جنگ عظیم شروع ہونے پر جس قدر آزادی پسند ہندوستانی یورپ میں تھے وہ سب برلن میں جمع ہو گئے تھے اور انہوں نے جرمن دفتر خارجہ کے تحت ایک انڈین نیشنل پارٹی قائم کر لی تھی۔^{۴۳}

حکومت جرمنی نے ہندوستان میں انقلاب کے امکانات کا جائزہ لیکر اس کے لئے عملی کارروائی شروع کر دی اور سمندری ذرائع سے رائل، کارتوس اور اسلحہ کا ایک بڑا ذخیرہ بنگال اور سندھ کے ساحل پر اتارنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش برطانوی بحریہ نے ناکام بنا دی۔ جرمن حکومت کا دوسرا منصوبہ یہ تھا کہ جو ہندوستانی قیدی جرمن، ترکی اور عراق کے محاذ پر گرفتار ہوئے ہیں ان کی ایک رضا کار فوج تشکیل دے کر اور عرب، ایرانی قوم پرستوں کا اشتراک حاصل کر کے افغانستان کی راہ سے ہندوستان پر حملہ کر کے ہندوستان کو آزاد کرایا جائے۔^{۴۴}

انقلابیوں کے لئے جرمنی سے ہندوستان جو ہتھیار بھیجے جاتے تھے اس میں سے کافی برطانوی حکومت کے ہاتھ لگ جاتے تھے مگر پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگست ۱۹۱۷ء کے بعد بنگال میں جو ہنگامے ہوئے ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس میں جرمن ہتھیار استعمال نہ کئے گئے ہوں۔^{۴۵}

مشہور انقلابی ایم این رائے نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے۔ ”۱۹۱۴ء میں جب جنگ عظیم چھڑی تو ہندوستانی باغیوں کی توقعات جرمنی سے وابستہ ہو گئیں۔ کیونکہ جرمن حکومت نے

”ہندوستان انقلابی کمیٹی“ سے ہندوستان کی آزادی کی لڑائی کے لئے مالی امداد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ اس کو کس طرح ہندوستان لایا جائے۔ خیال تھا کہ یہ اسلحہ جرمنی سے ہندوستان کے قریب کسی غیر جانبدار ملک میں اتارا جائے۔ ۶۷ اس کے لئے افغانستان ایک مناسب ملک تھا۔ مگر یہ تمام تجاویز عملی جامہ نہ پہن سکیں۔

جرمن وزیر خارجہ بیرن فارن اور فیلڈ مارشل ملک کیزن نے برلن کمیٹی کے ارکان کو ایک وفد ترکی بھیجنے کی صلاح دی تاکہ خلیفۃ المسلمین اور شیخ الاسلام ترکیہ سے فتویٰ جہاد حاصل کر کے امیر افغانستان کو اس پر رضامند کیا جائے کہ وہ جرمن ترک افواج کے ساتھ ہندوستانیوں کی رضا کارانہ فوج کو اپنے علاقہ سے گزرنے اور ہندوستان کے شمالی مغربی علاقوں پر نیا محاذ کھولنے کی اجازت دے۔ ۶۷

راجہ مہندر پرتاب سنگھ کی تجویز تھی کہ ہندوستان کے والیان ریاست کو انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے کا پیغام دیا جائے کہ وہ ہندوستانی انقلابیوں کے ہمراہ اپنے وطن کو آزاد کرانے کی پیشقدمی کریں لہذا جرمن چانسلر کی طرف سے چھبیس والیان ریاست کے نام خریطے لکھے گئے۔ جن میں مہاراجہ نیپال اور امیر افغانستان بھی شامل تھے۔ ۶۸

انڈو جرمن وفد میں ہندوستانی انقلابیوں کے علاوہ حکومت جرمنی کے ڈپلومیٹ ڈاکٹر فون ہٹینگ ان کے سیکریٹری رور، آسٹرین نمائندے پنڈر مارز، ڈاکٹر بارکر اور دیگر فوجی افسران بھی تھے۔ یہ وفد پہلے خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی سلطان محمد خامس سے ملنے قسطنطنیہ گیا۔ اور امیر افغانستان کے نام سلطان کا خط حاصل کیا۔ وزیر اعظم حلمی پاشا نے بھی چند خطوط ان والیان ریاست کے نام تحریر کئے جن کے علاقے شمالی مغربی سرحد کے قریب تھے تاکہ یہ سب تحریک آزادی میں شریک ہو کر انگریزوں کے خلاف عوام کو طاقت پہنچائیں۔ وفد کی درخواست پر ایک ترکی افسر کپتان کاظم بے کو بھی وفد میں شامل کر لیا گیا تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ اس وفد کی پشت پر خلافت اسلامیہ ترکیہ ہے۔ ۶۹

یہ وفد ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہونچا۔ اس وفد کا مقصد امیر افغانستان کو انگریزوں کے خلاف اکسا کر افغانستان سے ہندوستان پر حملہ کرانے کی تیاریاں کرنا اور اس طرح پر انگریزی فوجوں کے ایک معتد بہ حصہ کو یورپین محاذوں کی بجائے ہندوستان میں رہنے پر مجبور کرنا تھا تاکہ جرمن اور ترکی فوجوں کو روس کے خلاف زیادہ جنگ کرنے کا موقع مل سکے اور اگر افغانستان انگریزوں سے لڑ پڑے تو ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا بھی اس کے مقاصد میں شامل تھا۔^{۵۰}

جب مولانا سندھی کو جرمن ترکی ہندی مشن سے ملنے کی سرکاری طور پر اجازت مل گئی تو وہ ان سے ملے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستانی معاملات میں ان کے اور مشن کے ممبران کے طرز فکر میں کسی قدر فرق ہے۔ مشن کے جرمن اراکین سے ان کی گفتگو ترجمان کے ذریعہ ہوتی تھی وفد کے اراکین سے گفتگو کے دوران انہیں محسوس ہوا کہ مشن کے ممبران کے آپسی خیالات میں کافی بعد ہے۔ اس مشن کے پریسڈنٹ مولانا برکت اللہ اس باب میں کوئی زیادہ رہنمائی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو عمر بھر افغانستان، صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ، بلوچستان کا نقشہ تک دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ مولانا سندھی کا بیان ہے کہ مشن کے ممبران شروع میں ان سے اخلاص سے نہیں ملے۔ مگر بتدریج ان کے متعلق مشن کے ممبران کے خیالات میں تبدیلی آتی گئی۔ کیونکہ مولانا کی ساری عمر شمالی مغربی ہندوستان میں گزری تھی اور اس علاقہ کے بارے میں ان کے پاس ایسی معلومات تھیں جو کابل میں فوجی نقطہ نظر سے بہت قیمتی سمجھی جاتی تھیں اس لئے ان کی رائے غالب ہونے لگی۔ اور وہ رفتہ رفتہ مشن کے ممبران کے قریب آتے گئے۔^{۵۱} مشن کے ہندوستانی اور جرمن ممبران آپس میں وہ یکجہتی

قائم نہ رکھ سکے جو ایسی مہمات کے لئے ضروری ہیں۔ مشن نے اپنے پلان کے متعلق کوئی تیاری نہیں کی تھی۔^{۵۲} ہندوستانی سیاست کے نظری حصہ پر ان کی نظر تھی لیکن کابل میں تو وہ عملی کارروائی کے

لئے آئے تھے۔ ہندوستانی ممبران سارا الزام جرمنوں پر تھوپتے تھے لیکن جرمن ممبروں کو شکایت تھی کہ برلن اور استنبول میں انہیں جو سبز باغ دکھائے گئے تھے اس کا عشر عشر بھی یہاں نظر نہیں آتا تھا۔ مولانا سندھی کا کہنا ہے کہ جب میں نے مشن کے صدر راجہ مہندر پرتاپ سنگھ کو کچھ کوتاہیوں کی طرف متوجہ کیا تو انہوں نے کہا کہ جرمن چانسلر نے بھی اس طرف توجہ دلائی تھی اور ہمارے لئے آسانی پیدا کرنی

چاہی تھی مگر میں نے خلاف شان سمجھ کر انکار کر دیا تھا۔ ۵۳

مشن کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ حبیب اللہ خاں افغانستان کو جنگ میں ڈھکیلا نہیں چاہتے تھے اور اس کے صلہ میں انہیں انگریزوں سے بہت سی مراعات کی توقع تھی۔ ۵۴

دوسری طرف جرمنی نے اسلحہ و سامان مہیا کرنے کا جو وعدہ کیا تھا بعض وجوہات کی بنا پر وہ ایفانہ ہو سکا۔ ۵۵

اسی زمانہ میں مولانا سندھی نے جنود ربانیہ یا جنود اللہ کا منصوبہ بنایا۔ ان کے پیش نظر وہ مہاجر نوجوان تھے جو ترکی اور ترک افواج کے شانہ بشانہ انگریزوں سے لڑنے کی خواہش لئے گھر سے نکلے تھے اور افغانیوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے تھے اور مولانا کی کوششوں سے ان کی رہائی عمل میں آئی تھی۔ مولانا سندھی نے لکھا ہے کہ ہماری خواہش تھی کہ وہ ترکی جانے کا خیال چھوڑ دیں اور کابل میں ان کے ساتھ رہ کر حکومت کی مصلحت جس قدر اجازت دیتی ہو اس قدر کام کرنے میں مصروف رہیں۔ یہ نوجوان جب لاہور سے نکلے تھے تو منظم شکل میں سفر کر رہے تھے مگر کابل میں لاہوری نوجوانوں کے ساتھ چند نوجوان پشاور میں بھی شامل ہو گئے۔ اور ان میں اختلاف شروع ہو گیا۔ بیکاری میں آہستہ آہستہ لاہوری جماعت کے افراد بھی کسی قدر مختلف ہو رہے تھے۔ جب ہمیں اس حقیقت کا پتہ چلا تو انکے پرانے نظام کے احیاء کرنے کی کوشش شروع کی اور ایک نوجوان عبدالباری جماعت کا صدر مقرر ہوا۔ وہی مولانا سندھی اور ان نوجوانوں کے درمیان واسطہ بنا۔ اس عرصہ میں دیوبند سے مولانا محمد منصور انصاری اور دہلی سے مولانا سیف الرحمن بھی یاغستان کی راہ سے کابل پہنچ گئے۔ ۵۶

اس جماعت میں کم سے کم دس افراد ایسے تھے جو تین سال سے زائد کالج میں تعلیم پا چکے تھے انہیں علیحدہ کر لیا گیا اور کسی قدر مذہبی اور عام سیاسی اصول پر ان سے مذاکرات ہونے لگے۔ محمد علی قصوری، شیخ محمد ابراہیم، مولانا منصور انصاری اور مولانا سیف الرحمن بھی مذاکرات میں شریک ہوتے۔ ان لوگوں نے آپسی مشورہ سے ایک جماعت بنالی جسے جنود اللہ کا نام دیا گیا۔ اس میں عسکریت تھی تو اسقدر جتنی سالویشن آرمی میں موجود ہے۔ اسی اثناء میں جب حاجی ترنگ زئی کے وکلاء سرحد سے

کابل آئے تو وہ بھی جنود اللہ میں شامل ہو گئے۔ ۵۷

اس تنظیم کا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیڈروں اور کارکنوں کو کرپین سالویشن آرمی کی طرح ایک نیم فوجی نظام میں منسلک کر کے عالم اسلام کی بہودی کے لئے اعزازی طور پر اور بلا تنخواہ کام کرنے والے رضا کاروں کی حیثیت سے کام پر لگادیا جائے۔ ۵۸

کالج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو الگ الگ عہدے دئے گئے تھے۔ مولانا سندھی ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ ہدایات دیتے اور نصیحت کیا کرتے تھے کہ ہر ایک کو آئندہ اسلامی ممالک کی اقتصادیات اور مالی حالت کو درست کرنے کے لئے کس طرح اور کہاں کام کرنا ہے۔ ان منصوبوں کا تعلق ایران، ترکی اور عرب سے تھا۔ ۵۹

ظفر حسن ایبک اور محمد یعقوب کو وہ اس کام کے لئے تیار کر رہے تھے کہ وہ حجاز جا کر آہستہ آہستہ تجارتی خطوط پر ایک آرگنائزیشن بنائیں جو حج کے موقع پر ذبح شدہ بھیڑ، بکریوں اور اونٹوں کی کھالوں کو جمع کر کے ان سے مختلف قسم کے چمڑے بنائے اور ان کو اسلامی ممالک کو برآمد کرے۔ اور اس کے لئے حجاز میں ایک بین الاسلامی کمپنی قائم کی جائے۔ اور اس کام کے لئے مالی ذرائع بہم پہونچانے والے ایک بین الاسلامی بینک کی بنیاد ڈالی جائے جو ان کاموں کے لئے سرمایہ بہم پہونچائے۔ اس کام کی ابتداء حجاز میں حج کے دوران حاجیوں سے مل کر اور ان کو یہ منصوبہ سمجھا کر اور اس کا تعاون حاصل کر کے انجام دیا جانا تھا۔ ظفر حسن ایبک کے بیان کے مطابق یہ پروگرام اتنا عظیم الشان تھا اور اس کے لئے اتنی ہمت اور جانفشانی کی ضرورت تھی کہ وہ اور محمد یعقوب اپنے کو اس بار کو اٹھانے کے لئے کافی تنومند نہ سمجھتے تھے۔ لیکن مولانا سندھی کی تلقینات اور ہدایات نے ان میں ایسی جرأت پیدا کر دی تھی کہ اگر افغان حکومت اجازت دیتی تو افغانستان سے خشکی کے راستے حجاز کو روانہ ہو جاتے تاکہ اس کا رخیر کو شروع کرنے کے لئے مالدار مسلمانوں کو آمادہ کریں۔ ان کے دوسرے ساتھیوں کو بھی ایسے ہی دوسرے منصوبے بتائے گئے تھے۔ ۶۰

خلیفۃ المسلمین ترکی، سلطان احمد شاہ ایران اور امیر حبیب اللہ خاں جنود رہانیہ کے مربی اور مولانا محمود حسن اس کے جنرل تھے۔ دوسرے عہدیداران میں نائب سالار پشیمان جٹ جنرل، معین

سالار یا میجر جنرل، لیفٹیننٹ کرنل اور میجر وغیرہ تھے جس میں بہت سے سیاستداں، علماء فوجی اور حکومتی عہدیداران شامل تھے۔ اس فوج کے ہیڈ کوارٹر مقامی جرنلوں کے تحت قسطنطنیہ، تہران اور کابل میں قائم ہونے والے تھے۔^{۱۱}

جرمن مشن کے اراکین جس مقصد کے لئے افغانستان آئے تھے اس میں ناکامی کے بعد ۱۹۱۴ء میں واپس چلے گئے مگر ہندوستانی اراکین وہیں رہے۔^{۱۲} مولانا سندھی کا خیال ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں کیونکہ مشن کے ممبران کے خیالات آپس میں ایک دوسرے سے پوری طرح نہیں ملتے تھے اس سے خود انہیں دربار میں جلدی بڑھنے کا موقع مل گیا۔ افغانی حکومت نے مشن کے ممبران کو آخری جواب دینے سے قبل مولانا سندھی کو مشن کے ممبران سے ملنے کا موقعہ دیا۔ اعلیٰ حضرت سے مشن کے ممبران کی جو گفتگو ہوتی وہ دربار میں موجود مخبروں کے ذریعہ حرف بحرف حکومت ہند تک پہنچا دی جاتی تھی اس کے معاوضہ میں انگریزوں نے امیر حبیب اللہ کو کافی روپیہ بھیجا اور انکی سالانہ گرانٹ میں اضافہ کر دیا۔ البتہ سردار نائب السلطنت کی صدارت میں جو باتیں ہوتیں وہ محفوظ رہتیں۔ اور ان سے افغان حکومت اپنے ترقی کے راستے سوچتی۔ اس قسم کے کاموں میں سے ایک حکومت موقتہ ہند کا قیام تھا۔^{۱۳} محمد علی قصوری کا بیان ہے کہ جرمن مشن نے اس بات پر زور دیا تھا کہ افغانستان کے ہندوستان پر حملہ کرنے سے قبل ہندوستان کی ایک عارضی حکومت قائم کر دی جائے۔^{۱۴}

۲۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو جناب عبدالرزاق قاضی القضاۃ کے مکان پر راجہ مہندر پرتاب اور مولانا برکت اللہ نے ملکر حکومت موقتہ ہند (عارضی حکومت ہند) قائم کی جس کے راجہ صاحب حیاتی صدر تھے مولانا برکت اللہ وزیر اعظم اور مولانا سندھی کو وزیر داخلہ بنایا گیا۔^{۱۵} اس حکومت کا مقصد یہ تھا کہ مختلف حکومتوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کر کے ان کو انگریزوں کے خلاف اپنا اتحادی بنایا جائے۔^{۱۶}

مولانا سندھی کا بیان ہے کہ ”اس حکومت نے ایک دفعہ روسی حکومت کے پاس بھیجنے کا فیصلہ

کیا۔ سردار نائب السلطنت نے اسے منظور کر لیا۔ اس پروگرام پر کام کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی ہندوستانی نہیں تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی نوجوان مقیم کابل ان کے ساتھ کام کریں مگر یہ نوجوان ہماری تنظیم سے جڑے ہوئے تھے۔ ان نوجوانوں کے علاوہ ہمارے ساتھ دو سکھ بھی تھے جو پہلے غدر پارٹی کے ممبر تھے اور ہندوستان سے فرار ہو کر بلا پاپورٹ افغانستان میں داخل ہو گئے تھے اور ہماری کوششوں سے آزاد ہو کر ہمارے ساتھ رہنے لگے تھے۔ راجہ مہندر پرتاپ کی خواہش تھی کہ ان میں سے ڈاکٹر متھرا سنگھ کو بھیجا جائے مگر کیونکہ ڈاکٹر متھرا سنگھ کی عام سیاسی واقفیت بس واجبی تھی اس لئے مولانا سندھی کی تحریک پر خوشی محمد کو بھی وفد میں شامل کر لیا گیا۔ اور اس کا نام مرزا محمد علی تجویز کیا گیا۔ راجہ مہندر پرتاپ نے صرف متھرا سنگھ کا خرچ دیا۔ خوشی محمد کا خرچ مولانا نے محمد علی قصوری سے لیا جنہوں نے مدرسہ حبیبیہ سے اپنی دو ماہ کی تنخواہ پیشگی وصول کر کے یہ رقم فراہم کی۔^{۶۸} اس

مشن کا مقصد یہ تھا کہ زار روس کی حکومت سے گفتگو کرے اور اس سے سیاسی و تجارتی مراعات کا وعدہ کر کے اسے انگریزوں سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرے۔^{۶۹} تاکہ افغانستان اگر ماورائے سندھ

پر حملہ کرے تو روس پشت سے حملہ نہ کرے۔ دوسرے روس کی فوجی طاقت کا اندازہ لگانا بھی اس وفد کا مقصد تھا۔^{۷۰} یہ وفد کامیاب واپس آیا دیگر سفارتی ذرائع سے بھی معلوم ہو چکا تھا کہ روس

افغانستان پر حملہ نہیں کرے گا۔^{۷۱} افغان عوام کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کا مطالبہ ہوا۔ بزرگ

بلایا گیا جس نے متفقہ رائے ہو کر حملہ کا مطالبہ کیا۔ اہل شوریٰ کا اس نقطہ پر جمع کرنا سردار نصر اللہ خاں کی قوت کا مظاہرہ تھا۔ امیر حبیب اللہ حیران ہو گئے اور انہوں نے شاہانہ فیصلہ سے اس کو رد کر دیا۔ صرف ان کا بڑا بیٹا عنایت اللہ خاں ان کا ہم خیال تھا کیونکہ انگریزوں نے اس کو اسی شرط پر ولی عہد قبول کیا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف کسی کارروائی میں حصہ نہیں لے گا۔^{۷۲} امیر حبیب اللہ خاں

سے بھی اسی قبیل کا ایک معاہدہ ہو چکا تھا اس کے لئے انگریزوں نے امیر حبیب اللہ کو کافی روپیہ یاغستان میں تقسیم کرنے اور اپنی سلطنت کے نام پر افغانی قبائل سے بیعت کرنے کے لئے دیا۔^{۷۳}

سرحدی افغانی قبائل میں یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ انگریزوں کے خلاف جو جنگ لڑی جائے گی وہ جہاد شمار نہیں ہوگی اور اس جنگ میں لڑنے والے شہید کا درجہ حاصل نہ کر سکیں گے۔^{۷۴} ان سے کہا

جاتا کہ امیر کابل جہاد کرے تو اس وقت بے شک جہاد میں شریک ہو جاؤ۔ لیکن بغیر بادشاہ کے جہاد نا جائز ہے۔ اس لئے عام بد نظمی سے بچو۔ ۵ کے اس طرح مجاہدین سرحد کا کام بھی رک گیا اور افغانی اور ہندوستانی مجاہدین کے کارندے امیر کابل پر بیعت حاصل کرنے میں لگ گئے۔ یہ انگریزی روپیہ یا غستان میں انہی مجاہدین کے ذریعہ تقسیم ہوا۔ ۶ کے

کیونکہ امیر حبیب اللہ خاں سے معاہدہ ہو چکا تھا اسلئے انگریز مطمئن تھے کہ افغان ہرگز انگریزوں کے خلاف جنگ جہاد میں شریک نہ ہوں گے۔ ۷ کے

اکثر وہ لوگ جو ہندوستان سے ہجرت کر کے افغانستان پہنچتے انہیں انگریزوں کے اشارہ پر قید و بند اور سخت نظر بندی میں ڈالا جاتا۔ اکثر کے حواس مختل ہو گئے سردار عنایت خاں ولی عہد کا کہنا تھا کہ ”ہمارے ملک میں مہمان کو میزبان کا گدھا سمجھا جاتا ہے وہ اسکو جس طرف چاہے ہانکے“ ۸ کے

روس کے پہلے مشن کی کامیابی کے نتیجے میں حکومت موقتہ ہند کے پریسڈنٹ راجہ مہندر پرتاپ نے مزید دو مشن بھیجنا طے کئے۔ استنبول مشن مولانا سندھی کی تحریک پر بھیجا گیا جو جنود ربانیہ میں ان کے دور فیقوں عبدالباری اور ڈاکٹر شجاع اللہ خاں پر مشتمل تھا اس وفد کو ایران کے راستے ترکی جانا تھا۔ دوسرے وفد کی تجویز مولانا برکت اللہ کی تھی اس میں شیخ عبدالقادر اور ڈاکٹر متھرا سنگھ کو براہ روس جاپان جانا تھا۔ ۹ کے روس نے اس دوسرے مشن کو جب وہ ان کی سرحد عبور کر چکا تھا گرفتار کر لیا اور

انگریزوں کے حوالہ کر دیا استنبول مشن کو ایران میں انگریزوں نے خود گرفتار کر لیا۔ چاروں ممبران کو لاہور لایا گیا۔ ڈاکٹر متھرا سنگھ کیونکہ ایک بم کیس کا مفروضہ ملزم تھا اس لئے اسے پھانسی پر لٹکایا گیا۔ باقی تین ممبران نظر بند کرے گئے۔ عبدالباری جو مولانا کے قریبی ساتھیوں میں تھے سر محمد شفیع کے رشتہ دار تھے جن کی سفارش پر انہیں مشروط رہائی ملی۔ انہوں نے حکومت موقتہ ہند، جنود اللہ اور جماعت مجاہدین کے تمام حالات لکھ کر دے دئے۔ باقی دو ممبران نے اس پر دستخط کر دئے۔ حکومت ہند روسی مشن کے زمانہ سے واقعات کی تحقیق کے لئے پریشان تھی۔ اب اسے مفصل حالات کی اطلاع مل گئی۔ ۱۰ کے

حکومت ہند ان اطلاعات کے بعد ان عناصر کا کابل میں وجود کس طرح برداشت کر سکتی تھی اس نے حکومت افغانستان سے پرزور احتجاج کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ محمد ابراہیم اور محمد علی قصوری حبیبیہ اسکول سے معزول کر دئے گئے اور مولانا کا بھتیجا عزیز احمد جو حبیبیہ اسکول کا طالب علم تھا خارج کر دیا گیا۔ شیخ محمد ابراہیم اور محمد علی یاغستان چلے گئے۔ محمد علی قصوری کچھ دنوں یاغستان میں رہے اور پھر کسی طرح سر عبدالقیوم کی معرفت معافی لیکر ہندوستان پہنچ گئے۔ شیخ محمد ابراہیم نے کچھ عرصہ بعد روس پہنچنے کی کوشش کی۔ مگر راستہ میں افغانستان کے ایک گاؤں میں فوت ہو گئے۔ مولانا سندھی نے اس امر کا شبہ ظاہر کیا ہے کہ وہ کسی انگریز کارندے کے ہاتھوں شہید ہوئے ہوں گے۔^{۸۱} مولانا

سندھی اپنے حالات سے شیخ الہند کو مطلع کرتے رہتے تھے۔^{۸۲} ایک خط میں انہوں نے کابل میں ہندوستانی مشن کی آمد۔ اس کے مقصد۔ ہندوستان کی پروڈیٹل حکومت کے قیام اور اس کی طرف سے مختلف ممالک کے لئے سفارتوں کی روانگی کی تفصیلات تحریر کرتے ہوئے پروڈیٹل گورنمنٹ میں اپنی شرکت کی مصلحت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں جنودر بانیہ کا منصوبہ اور منصب داراں جنودر بانیہ کی فہرست بھی تھی۔^{۸۳} یہ خطوط شیخ عبدالرحیم سندھی کے پاس اس ہدایات کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔ کہ وہ یہ امانت مدینہ طیبہ میں حضرت شیخ الہند کی خدمت میں کسی معتمد حاجی کی معرفت پہنچادیں اور یہ ایسا کام ہے کہ اس کے لئے مستقل سفر کرنا نقصان دہ نہیں۔ اور اگر آدمی معتبر ہو تو یہ زبانی بھی کہہ دیں کہ حضرت مولانا یہاں آنے کی کوشش نہ کریں۔“ اگر خدا نخواستہ کوئی معتمد حاجی نہ ملے اور آپ خود بھی نہ جاسکیں تو مولوی احمد اللہ ساکن پانی پتی سے اس معاملے میں مدد لیں۔ یہ ضروری ہے کہ اس حج کے موقعہ پر یہ اطلاعات حضرت مولانا تک پہنچ جائیں۔“^{۸۴}

اسی کے ساتھ مولانا محمد میاں منصور انصاری نے کابل کی سرگرمیوں پر ایک رپورٹ تیار کی تھی یہ رپورٹ ریشمی کپڑے پر کمال ہنرمندی سے اس طرح لکھی گئی تھی کہ بادی النظر میں نہ پڑھی جاسکتی تھی۔ ان پیغامات کو لے جانے کے لئے ایک قابل اعتماد ساتھی شیخ عبدالحق۔^{۸۵} کو دیا گیا۔ مگر نامہ بر غیر معتبر نکلا اور شیخ عبدالرحیم کو سندھ پہنچانے کی بجائے یہ خطوط خاں بہادر حق نواز کے ہاتھوں میں پہنچ گئے جنہوں نے یہ خطوط پنجاب کے گورنر سر مائیکل اڈوائر کے حوالے کر دئے۔ عبدالحق کو

پولیس نے گرفتار کر کے وعدہ معاف گواہ بنالیا۔ ہندوستان میں گرفتاریاں شروع ہو گئیں اور کچھ دنوں بعد شیخ الہند کو مع رفقاء مکہ میں گرفتار کر لیا گیا۔^{۵۶}

ان چھٹیوں کا ذکر رسیڈنشن کمیٹی^{۵۷} کی رپورٹ میں جو ۱۹۱۸ء میں کلکتہ سے سپرنٹنڈنٹ گورنمنٹ پرنٹنگ پریس سے شائع ہوئی صفحہ ۱۷ پر مذکور ہے جس میں اسکوریشی خطوط کی سازش سے موسوم کیا گیا ہے۔ ظفر حسن کا بیان ہے کہ یہ بات ابھی تک صاف نہیں ہوئی کہ عبدالحق شروع ہی سے ایک انگریز جاسوس کے طور پر ہمارے ساتھ تھا۔ یا اسکورب نواز نے ہندوستان آنے پر ڈرا دھمکا کر یا لالچ دے کر ورغلا یا تھا۔^{۵۸}

انگریزوں کے ایماء پر مولانا سندھی کو یکم رمضان ۱۳۳۵ھ کو معہ ان کے بچپس ہمراہیوں کے ایک تنگ مکان میں جو کسی بھی طرح دس افراد کے قیام کی گنجائش نہ رکھتا تھا قید کر دیا گیا۔ ان کی نگرانی سپہ سالار سردار محمد نادر خاں کے ذمہ تھی۔ جب انہیں اس مسئلہ کی طرف توجہ دلائی گئی تو مولانا سندھی اور ان کے ساتھیوں کے لئے ایک باغ میں خیمے لگوا دیئے گئے اور عید الفطر کے موقع پر وہ ان لوگوں سے ملنے کے لئے بھی آئے۔ کچھ مدت کے بعد ان کی نگرانی مستوفی ممالک کے سپرد کر دی گئی جہاں مولانا سیف الرحمن کی مدد ان کو حاصل تھی۔ مگر ان کے ساتھی کو تو ال کی نگرانی میں رہے اسی اثنا میں ان کا ایک رفیق رحمت علی زکریا اس نظر بندی سے نکل بھاگا اور انقلاب کے بعد روس پہنچ گیا۔ مولانا سندھی نے اس خدشہ کے پیش نظر کہ اس کے فرار کا الزام ان پر عائد نہ ہو مولانا سیف الرحمن کے توسط سے ان لوگوں سے علیحدگی اختیار کر لی۔ مستوفی الممالک انہیں جلال آباد لے گئے۔^{۵۹}

۲۰ فروری ۱۹۱۹ء کو جلال آباد کے قریب امیر حبیب اللہ کو قتل کر دیا گیا۔ مرنے سے ایک ہفتہ قبل ہی اس نے جمعہ کے خطبہ میں خود کو امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کہلوا یا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ ترکی کی خلافت کے خاتمہ کا منتظر ہوتا کہ اپنے خلیفۃ المسلمین بننے کا اعلان کر دے۔ ملک میں بد امنی پھیلنے کا شدید اندیشہ تھا۔ مگر کچھ سیاسی اتھل پتھل کے بعد امیر امان اللہ خاں بغیر کسی خونریزی کے تحت افغانستان پر متمکن ہو گئے۔ ۹۰ جب امیر امان اللہ خاں کابل میں منتقل ہو گئے تو انہوں نے مولانا سندھی اور ان کے رفقاء کو جلال آباد سے طلب کیا۔ جب وہ دربار میں حاضر ہوئے تو مسکرا کر

کہا ”من ہموہستم“ یعنی میں وہی ہوں مولانا کا بیان ہے کہ اس میں ایک خاص ملاقات کی طرف اشارہ تھا۔ ۹۱

ظفر حسن کے مطابق اس میں مولانا اور میر حبیب اللہ کی اس ملاقات کی طرف اشارہ تھا۔ جس میں مولانا نے اپنی یہ اسکیم پیش کی تھی کہ اگر افغانستان ہندوستان پر فوج کشی کر کے ہندوستان کو برٹش استعمار سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائے تو ہندوستان کی تخت پر آئینی طور پر ایک افغان شہزادہ کو تخت نشین کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں مولانا نے امیر امان اللہ کا نام پیش کیا تھا جسکی حبیب اللہ خاں نے منظوری دے دی تھی۔ ۹۲

ظفر حسن ایک کا بیان ہے کہ نظر بندی کے اس عرصہ میں مولانا سندھی نے ان کی اور خوشی محمد کی مدد سے برطانیہ کے دستور اور پارلیمانی نظام کا مطالعہ کیا۔ کیونکہ مولانا سندھی کے خیال میں جب حکومت موقتہ ہند کی تجویز کے مطابق افغانستان کی مدد سے ہندوستان آزاد ہو جائے اور دہلی میں ایک افغانی شہزادہ قانونی اور آئینی بادشاہ کے طور پر حکمراں ہو اور اس کی حکومت انگریزی حکومت کی طرز پر ایک آئینی حکومت ہو تو یہ معلومات دستور سازی میں ان کی معاون ہوں گی۔ ۹۳

امیر امان اللہ خاں نے برسر اقتدار آ کر مولانا سندھی کو حکومت موقتہ ہند کا نمائندہ مان کر تمام سرکاری معاملات صلح و حرب میں شریک کر لیا۔ ۹۴ مولانا سندھی کا بیان ہے کہ ”امیر امان اللہ کی سلطنت میں چند روز ہم نے اپنی حکومت کی زراسی جھلک دیکھ لی۔ جس قدر وہ اپنے وزراء کی پہلی صف پر اعتماد کرتے تھے ہمارے ساتھ ان کا معاملہ اسی کے قریب قریب تھا۔ ہم ان کی پرائیوٹ مجلسوں میں شامل ہوتے تو جیسے وہ اپنے خاندان اور قومی بزرگوں کا احترام کرتے ہم سے ان کا برتاؤ اسی طرح کا ہوتا۔ ہم نے کوئی مشورہ عرض نہیں کیا جو قبول نہ فرمایا ہو ہم نے کوئی سفارش نہیں کی جو رد کر دی گئی ہو۔ ایسی حالت میں ہم سے جو کچھ ہو سکتا تھا کیا۔ ہم نے سلطنت افغانستان کے مستقبل کو مستحکم بنانے میں کوئی دریغ نہیں کیا۔“ ۹۵

حضرت شیخ الہند کی وفات پر امیر امان اللہ خاں نے جو مجلس فاتحہ خوانی کی وہ یادگار تقریب تھی۔ اس موقع پر امان اللہ خاں نے جو تقریر کی اس میں کہا ”محمود الحسن یک کار را شروع کردند۔ من

اور اپورامی کیم‘۔ ۹۶۔ امیر افغانستان امان اللہ خاں نے برسرِ اقتدار آ کر قوم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انگریزوں سے افغانستان کا استقلال حاصل کر لیں گے۔ ۹۷۔ مولانا عبداللہ لغاری نے لکھا ہے کہ جب انگریزوں نے امان اللہ خاں کو امیر افغانستان بننے کی مبارکباد دی اور انکو ہر بائسن کہہ کر مخاطب کیا۔ تو امان اللہ خاں نے مولانا سندھی کو بلوایا اور اپنے اگلے قدم کے سلسلہ میں ان سے مشورہ کے طالب ہوئے۔ یہ مجلس پرائیویٹ تھی اور اس میں ہردو کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ امیر نے مولانا سے کہا کہ قوم مجھ سے تقاضہ کر رہی ہے کہ انگریزوں سے لڑو۔ مولانا نے کہا کہ اللہ پر توکل رکھو اور بلا اعلان جنگ شروع کر دو۔ ۹۸۔

امیر امان اللہ خاں نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کا فیصلہ کیا اور جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس وقت ہندوستان میں بد امنی تھی۔ پنجاب میں جلیانوالہ باغ کی وجہ سے ہل چل مچی ہوئی تھی۔ جنگ عظیم اگرچہ ختم ہو چکی تھی لیکن انگریزی فوج مختلف محاذ پر پھیلی ہوئی تھی۔ ہندوستان میں فوجیں جو بہت کم تعداد میں تھیں اندروں ملک امن و امان قائم کرنے میں مشغول تھیں۔ ہندوستانیوں نے نہ ہتھے ہونے کے باوجود ہتھیار بند انگریزی فوجوں کے مقابلہ میں سینہ سپر کیا ہوا تھا اور سلسلہ رسل و رسائل خراب کر کے فوجوں کی ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل و حرکت مشکل بنا دی تھی۔ ۹۹۔

افغانستان کے لئے اپنا استقلال حاصل کرنے کیلئے اس سے بہتر موقعہ نہیں مل سکتا تھا اس نے حکومت موقتہ ہند سے معاہدہ کر لیا جس سے اس کو اپنی تیاریوں میں بہت فائدہ ہوا۔ مولانا سندھی نے حکومت موقتہ ہند کے وزیر داخلہ کی حیثیت سے ہندوستانیوں کے نام ایک اپیل جاری کی۔ جس میں کہا گیا تھا کہ اب انگریزی استعمار سے ملک کو آزاد کرانے کا وقت قریب آچکا ہے۔ انگریزوں کے خلاف ہر ممکنہ سبوتاژ کاروائیاں کی جائیں جس سے حملہ آور نجات دہندہ فوج کو اپنے فوجی اقدامات میں تقویت مل سکے۔ ان اعلانات میں افغانستان کا نام قصداً نہیں لکھا گیا تھا۔ کیونکہ اس وقت تک افغانستان نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ نہیں کیا تھا۔ مولانا سندھی اور حکومت افغانستان کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ افغانی فوجیں سرحدوں پر مورچہ بندی کریں اور اس عرصہ میں حکومت موقتہ ہند کا اعلان ہندوستان کے مسلمان لیڈروں کے پاس اس ہدایات کے ساتھ جائے کہ کوئی ہندوستانی ان فوجوں سے مقابلہ نہ کرے۔ یہ اعلانات محمد علی اور اللہ نواز کے ذریعہ ہندوستان کے

مسلم لیڈروں کو بھجوا دئے گئے۔ ۱۰۰ مولانا سندھی اس زمانہ میں ہندوستان کے سیاسی حالات اور انقلابیوں کی سرگرمیوں کا بغور جائزہ لیتے اور انہیں جب کسی بھی ہندوستانی انقلابی کے انگریز پر حملہ کی خبریں ملتی وہ اس پر خوشی کا اظہار کرتے اور اس کے لئے دعا کرتے۔ ۱۰۱

حکومت موقتہ ہند کی طرف سے ہندوستانی عوام کے نام جاری کردہ اپیل کا متن

”عارضی حکومت ہند کی خبر رولٹ سڈیشن کمیٹی کی رپورٹ میں پڑھ چکے ہو گے۔ یہ حکومت اس لئے بنائی گئی ہے کہ ہند میں موجود غاصب غدار ظالم حکومت کے عوض بہترین حکومت قائم ہو۔ تمہاری عارضی حکومت چار سال سے مسلسل جدوجہد کر رہی ہے۔ اس وقت جب تم نے ظالمانہ قانون کے نہ ماننے کا پکا ارادہ کر لیا۔ عین اس زمانہ میں حکومت موقتہ ہند بھی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔” حملہ آور فوج سے حکومت موقتہ ہند نے معاہدہ کر لیا ہے۔ اس لئے اس سے مقابلہ کر کے اپنے حقیقی فوائد ضائع نہ کریں بلکہ انگریزوں کو ہر ممکن طریقہ پر قتل کریں۔ انہیں آدمی اور روپیہ کی مدد نہ دیں۔ ریل تار خراب کرتے رہیں۔ حملہ آور فوج سے امن حاصل کریں۔ ان کو رسد اور سامان سے مدد دیکر اعزازی سندیں حاصل کریں۔ حملہ آور فوج ہر ہندوستانی کو بلا تفریق نسل و مذہب امن دیتی ہے۔ ہر ایک ہندوستانی کی جان و مال عزت محفوظ رہے گی۔ فقط وہی مارا جائے گا یا بے عزت ہوگا جو مقابلہ میں کھڑا ہوگا۔ خدا ہمارے بھائیوں کو سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق دے۔“ ۱۰۲

ظفر حسن

عبداللہ

سیکرٹری حکومت موقتہ ہند

وزیر موقتہ ہند

مگر مشرقی کمان کے کمانڈر صالح محمد خاں کی وجہ سے جنگ وقت مقررہ سے پہلے چھڑ گئی۔ یہ محاذ کابل سے مشرق میں جلال آباد سے آگے درہ خیبر کے مقابل بنایا گیا تھا۔ تاکہ یہاں سے لنڈی

کوئل اور جرود کے قلعوں اور پشاوڑ کی چھاوڑی پر حملہ کیا جاسکے۔ بہترین افغانی پلٹن جس کی بند و قیں نئی اور توپیں سرلیج آتش (Quik Firinig) تھیں اسی محاذ پر مقرر کی گئی تھیں۔ صالح محمد خاں نے کابل سے اعلان جنگ کئے جانے سے پہلے ہی تو رخم کے مقام پر ایک متنازعہ چشمہ پر قبضہ کر کے ۲ مئی ۱۹۱۹ء کو لڑائی چھیڑ دی۔ انگریزوں نے ایک جہاز بھیج کر فوج پر بمباری کر دی۔ محمد صالح اس محاذ سے ہٹ کر ڈاکہ کی طرف پسپا ہوا۔ فوج کمانڈر کو غائب پا کر میدان جنگ سے پیچھے ہٹی۔ انگریزی رسالہ نے پیش قدمی کر کے ڈاکہ پر قبضہ کر لیا۔ جلال آباد کے لوگوں نے اس شکست کو حکومت کے خاتمہ پر محمول کیا اور شہر جلال آباد کو لوٹ لیا۔ ۱۰۳

جلال آباد کے محاذ پر اس قدر افراتفری پیدا ہو گئی کہ مولانا سندھی اور ان کے رفیق خوشی محمد جو سپہ سالار صالح محمد کے ہمراہ بطور سیاسی مشیر بھیجے گئے تھے ہندوستانی مجاہدین کے مرکز چمرکنڈ میں پناہ لینے کو مجبور ہوئے۔ ظفر حسن نے لکھا ہے کہ میں نے سردار محمود بیگ طرزی سے جو اس وقت افغانستان کے وزیر خارجہ تھے درخواست کی کہ مولانا کو چمرکنڈ سے کابل بلا کر ان سے اس صورت حال پر تبادلہ خیال کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے امیر سے حکم بھیج دیا کہ مولانا سندھی کو ان کے ساتھیوں کے ہمراہ سرکاری مہمان بنا کر یاغستان سے جلال آباد اور وہاں سے کابل روانہ کر دیا جائے۔ ۱۰۴

ظفر حسن کے مطابق اس سانحہ کے فوراً بعد محمد نادر خاں نے ٹھل کی طرف پیش قدمی کی۔ ٹھل شہر پر قبضہ ہو گیا۔ مگر قلعہ پر قبضہ نہ ہوا تھا اور جب انگریزی فوج کو مزید کمک مل گئی تو مسلح افغان سپاہی مورچے چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ یہاں تک کہ بعض افغان سپاہیوں نے مال برداری کے خچر پر سوار ہو کر افغانستان کا راستہ لیا۔ اور سامان جنگ اور اسلحہ جو ان خچروں پر لدنے والا تھا پیچھے چھوڑ دیا۔ ۱۰۵

اسی دوران وائرلیس کے ذریعہ روس، برطانیہ، فرانس و جاپان وغیرہ کو خبر کر دی گئی کہ انگریزوں نے اعلان جنگ کے بغیر حملہ کر دیا ہے اور افغانستان کو ناچار اس انگریزی حملہ کا جواب دینا پڑا ہے۔ اتحادیوں نے برطانیہ پر جنگ بندی کے لئے زور ڈالا۔ لہذا برطانیہ نے مجبور ہو کر التوائے جنگ اور صلح کی خواہش کی۔ ۱۰۶ انگریزوں کو یہ ڈر تھا کہ انڈو افغان جنگ نے اگر طول پکڑا تو ہندوستان میں سیاسی شورش تیز ہو سکتی ہے۔ موپلا بغاوت، تحریک موالات اور دوسری انقلابی تحریکیں پورے زور شور سے چل رہی تھیں یہ یقینی تھا کہ یہ جنگ اگر جاری رہتی تو چند ہی دنوں میں افغان فوج

کی ہوا اکھڑ جاتی اور امیر امان اللہ کو بہت جھک کر صلح کرنی پڑتی۔ ۱۰۷

صلح کی شرائط طے کرنے کے لئے ایک افغانی وفد وزیر خارجہ سردار محمود بیگ طرزی کی قیادت میں منصوری بھیجا گیا مگر یہ وفد منصوری کی صلح کانفرنس میں افغانی استقلال کی تصدیق کے سوا کوئی دوسری اچھی شرط حاصل نہ کر سکا۔ مولانا سندھی کو امید تھی کہ شاید یہ وفد ہندوستان کو کچھ اختیارات دلانے اور ہوم رول قائم کرانے میں ضرور مدد دے گا۔ اور اس طرح اس ہندوستانی معاونت کا معاوضہ ادا کر سکے گا جس کی وجہ سے انگریز ہندوستان میں بد امنی کے خدشہ کے پیش نظر اپنی فوجوں کو افغانستان کے خلاف استعمال نہ کر سکے اور جلال آباد سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ۱۰۸

اس وفد کے دوران قیام وہاں ہندوستان کے مسلم لیڈروں کی گرفتاریاں ہوئیں اور ان پر حکومت نے غداری اور اجنبی حکومت سے مل کر انگریزوں کے خلاف سازش کا الزام لگایا۔ ۱۰۹ وفد کے سربراہ محمود طرزی نے گفتگو کیلئے ہندوستان روانہ ہونے سے قبل مولانا سندھی سے ہندوستان میں ان کے دوستوں کے نام جن میں مولانا محمد علی اور ڈاکٹر مختار انصاری شامل تھے ایک خط مانگا تھا تا کہ اگر انگریز افغانی مطالبات منظور نہ کریں یا افغانستان کی آزادی کی تصدیق میں لیت و لعل برتیں تو یہ خط ہندوستان کے مسلم لیڈروں کو دے کر ان کے ذریعہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کرانے کی کوشش کی جائے یہ خط نہ تو ہندوستان کے مسلم لیڈروں کو دیا گیا نہ وفد کی واپسی پر مولانا کو واپس کیا گیا۔ گمان یہی ہے کہ یہ خط افغانی وفد نے خود انگریزوں کو دے دیا تھا۔ ۱۱۰

انہی دنوں مولانا عبید اللہ نے کابل میں ایک ہندوستانی یونیورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ بنایا اور اپنی تمام طاقت حکومت سے اس یونیورسٹی کے چارٹر حاصل کرنے میں صرف کردی۔ سردار محمد نادر خاں کے عطا کردہ قلعہ علی آباد میں انہوں نے ایک اسکول قائم کیا تھا جہاں اردو بھی پڑھائی جاتی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے اس کے اخراجات کے متکفل مولانا سندھی تھے۔ ظفر حسن اسکول کا انتظام دیکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ اسکول مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گیا۔ مولانا نے اس کا نظام نامہ بھی بنالیا تھا۔ وزیر خارجہ سردار محمود طرزی نے وعدہ کیا تھا کہ حکومت افغانستان اور امیر سے اس کی منظوری لے لیں گے۔ ۱۱۱

افغانوں میں بعض ایسے صاحب رسوخ اشخاص موجود تھے جو بظاہر قوم پرستی کا دم بھرتے تھے۔ لیکن اصل میں انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے قومی جذبہ کی تسکین لیکن اصل میں انگریزوں کے اشارہ پر خفیہ سازشیں شروع کر دیں کہ علی آباد کا یہ اسکول جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے ایک روز ہندوستانی یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لے گا اور اس طرح ہندوستانی کلچر غلبہ حاصل کر کے افغانی قومیت کو بالکل نیست و نابود کر دے گا اور افغانستان ایک روز علمی لحاظ سے ہندوستان کا بالکل محکوم بن جائے گا۔ ان انگریز پرست افغانیوں نے عبدالنبی ہیڈ ماسٹر علی آباد اسکول کو ورغلا یا اور اسنے اس اسکول کے لڑکوں کے قومی جذبات کو ہندوستانی معلمین اور اردو زبان کے خلاف ابھارا۔ اس پر لڑکوں نے اردو پڑھائے جانے کے خلاف پروٹسٹ کیا اور اسٹرائیک کر کے سب کے سب مکتب سے اپنے گھروں کو چلے گئے اور اسکول کچھ دنوں کے لئے پہلے عارضی طور پر اور پھر مستقل بند ہو گیا۔^{۱۱۲}

کچھ دنوں کے بعد مولانا مرحوم نے سردار محمود بیگ طرزی کو جب جب ان کا وعدہ یاد دلایا تو وہ لیت و لعل کرنے لگے۔ جب انگریزوں سے کئے گئے ان کے معاہدہ کی تصدیق ۲۲ نومبر ۱۹۲۱ء کو ہو گئی تو ان کے طرز عمل کا مطلب اچھی طرح واضح ہو گیا۔^{۱۱۳}

کابل کے دوران قیام مولانا سندھی نے اپنے کچھ ساتھی نوجوانوں کو تفسیر قرآن کی تعلیم دینی شروع کی۔ ان سورتوں کے انتخاب میں وہ وقت کے حالات اور نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے رجحانات کو پیش نظر رکھتے تھے مگر دو سال جاری رہ کر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔^{۱۱۴}

جب افغانستان کی آزادی تسلیم کر لی گئی اور انگریزوں نے افغانستان کے غیر جانبدار رہنے کی قیمت ۳ کروڑ پونڈ اس شرط پر ادا کرنا طے کی کہ وہ افغانستان کی سرزمین کو ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف استعمال ہونے کی اجازت نہیں دے گا۔ اور جو پڑوسی حکومتیں انگریزوں سے متعارض ہوں انکے مقابلہ میں انگریزوں کی مدد کرے گا۔ تو اب حکومت افغانستان کو ہندوستانیوں کا وجود بوجھ معلوم ہونے لگا۔^{۱۱۵}

مولانا سندھی کی سرگرمیوں پر پابندی لگ گئی۔ امان اللہ خاں کے خیالات بدلنے لگے اور

انہوں نے حکومت موقتہ کا کام بند کر دیا اور کابل کانگریس کمیٹی کے کام پر نگرانی کرنے لگے۔^{۱۱۶}

کابل کانگریس کمیٹی کی تشکیل اس وقت ہوئی تھی جب حکومت موقتہ ہند کا کام افغانی حکومت نے بند کر دیا تھا۔ ڈاکٹر نور محمد اس کے روح رواں تھے۔ مولانا سندھی اس کمیٹی کے صدر اور نور محمد سیکریٹری تھے۔ ان کے باقی ساتھی کمیٹی کے ممبر بن گئے تھے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی کوششوں سے آل انڈیا کانگریس کے گیا اجلاس میں کابل کمیٹی کا الحاق انڈین نیشنل کانگریس سے ہو گیا تھا۔ کابل کانگریس کمیٹی ہندوستان اور برٹش ایمپائر سے باہر قائم ہونے والی پہلی کانگریس کمیٹی تھی۔ اس کمیٹی کے بننے کے بعد مولانا سندھی کی سیاسی اہمیت افغانوں، ترکوں اور روسیوں کے درمیان بہت بڑھ گئی تھی۔^{۱۱۷}

محمد حسین سابق رئیس تدریسات عمومی افغانستان نے لکھا ہے کہ بادشاہ کی سیاست میں بزدلانہ کوتاہی سرایت کر گئی تھی۔ انگریزوں نے جب امان اللہ خاں سے معاہدہ کر لیا تو پہلے آفریدیوں سے پھر وزیر یوں سے اس امداد کی اعانت کا انتقام لیا جو انہوں نے انگریزوں کے خلاف امان اللہ کو دی تھی آخر میں امیر کو تدبیر و تنویر سے آمادہ کیا گیا کہ مہاجروں کو بھی خارج البلد کر دے۔^{۱۱۸} ایسا لگتا ہے کہ امان اللہ خاں نے وقتاً فوقتاً ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت میں جو

بیان دئے تھے اور ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا تو اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ انگریزوں سے کچھ اور مراعات لے سکیں۔ ہجرت کے فتوے پر سادہ لوح ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے گھر اور اثاثے ادنے پونے بچ دئے۔ اس سے یہ بات صاف ہو گئی کہ افغانستان نے انگریزوں سے صلح کر کے ہندوستانی قوم پرستوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ مسوری میں صلح کی شرائط کے دوران انگریزوں نے افغانی حکومت سے یہ وعدہ لے لیا ہو کہ مولانا سندھی کو افغانستان میں عملی یا سیاسی کام کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔^{۱۱۹}

اب مولانا سندھی کے سامنے دو راستے رہ گئے تھے۔ اول۔ افغانستان میں بالکل خاموش بیٹھ جائیں اور عملی سیاست سے کنارہ کش ہو کر بالکل بیکار زندگی گزار دیں۔ یہ طریقہ ان کی سیاسی موت کے مترادف تھا۔ دوم۔ افغانستان چھوڑ کر کسی اور ملک میں رہیں اور وہاں سے انگریزوں کے

خلاف اپنا کام کریں مولانا نے کامل ایک برس غور کیا آخر روس کے راستے ترک کی جانے کے لئے افغانستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔^{۱۲۰} انہوں نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے افغانی حکومت سے راہ دری (پاسپورٹ) مانگا۔ مگر حکومت نے ظفر حسن اور ڈاکٹر نور محمد کو افغانستان میں روکنا چاہا۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔^{۱۲۱} سردار نادر خاں سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ انہیں ان کے رفیقوں سے علیحدہ کرنے کی تجویز ہو رہی ہے جو کوئی اچھی صورت حال نہ تھی۔ کیونکہ بقول مولانا سندھی ”اگر ہمارے ساتھی جدا ہو گئے تو ان کی زندگی برباد ہو جائے گی اور ہم بھی ان ہمراہیوں کے بغیر خوش نہ رہیں گے۔ اس لئے ہم نے امیر سے افغانستان سے جانے کی اجازت طلب کی۔ ہمیں اجازت دینے کے لئے امیر امان اللہ نے ایک شرط لگائی کہ اگر روس سے ایک کروڑ پونڈ مل جائیں تو اس سے افغانستان کی معیشت سدھر سکتی ہے۔ کیونکہ انگریزوں نے حسب وعدہ اپنی رقم ادا نہیں کی ہے اور آپ روس جا کر کوشش کریں کہ وہ ہم کو اس قدر رقم دے دیں تو ہم ہمیشہ روس کے خیر خواہ رہیں گے۔“^{۱۲۲}

کابل چھوڑنے سے قبل مولانا نے اپنے تمام کاغذات اللہ نواز کی تحویل میں دے دئے تھے۔ مگر مولانا سندھی کا خیال ہے کہ اس نے کاغذات برٹش حکومت کے حوالے کر دئے۔ کیونکہ ماسکو میں انہیں جب انگریزی اخبارات ملے تو ان کے اندراجات سے گمان ہوتا تھا کہ یہ تمام دستاویزات برٹش حکومت کو مل گئی تھیں۔^{۱۲۳}

مولانا عبید اللہ سندھی ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو روس کے لئے روانہ ہوئے۔ ان کے ہمراہیوں میں ظفر حسن، خوشی محمد، اقبال شیدائی، عمر ظفر مسعود، عبدالرشید، عبدالعزیز اور سیوانا تھہ بزرگی شامل تھے۔^{۱۲۴} اس سفر کا راستہ حکومت افغانستان نے متعین کیا تھا۔ اور ان کے لیے کابل سے مزار شریف کے سیدھے اور عام راستہ کی بجائے ایک غیر معروف راستہ مقرر کیا تھا جو انتہائی شمالی ضلع سے گذرتا تھا۔ اس راستہ سے ان کے قافلہ سے پہلے کبھی کوئی قافلہ جس میں گھوڑے اور بار برداری کے خچر اور ٹٹو موجود ہوں نہ گزرا تھا۔ صرف پیدل چلنے والے یا اکادکا مسافر یہاں سے کوہ ہندوکش پار کر کے ترکستان جایا کرتے تھے۔^{۱۲۵} ظفر حسن ایک نے لکھا ہے کہ ان کے ذہن میں ایک خیال یہ تھا کہ

راستہ بہت خطرناک ہے اور اس کا امکان ہے کہ ڈاکوہم پر حملہ نہ کر دیں اور ہمیں بے چارگی کے عالم میں پھر افغانستان واپس جانے اور وہاں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑے۔ روس پہونچنے کے بعد انہیں جو ہندوستانی اخبارات ملے ان میں یہ خبر درج تھی کہ مزار شریف کے راستہ میں ان کے قافلہ پر حملہ ہوا اور سامان لوٹ لیا گیا۔ خبر گرچہ صحیح نہ تھی مگر اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ کابل میں لوگوں کے دلوں میں اس کا احتمال تھا اور بعض لوگ تو اس کو یقینی سمجھتے ہوں گے اور انہوں نے ہی یہ خبر ہندوستان پہنچائی ہوگی۔ ۱۲۶؎ دوسرا خیال یہ تھا کہ اس راستہ کو مقرر کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ سپہ سالار محمد نادر خاں سے ان کی ملاقات نہ ہو سکے۔ روس جا کر اس کی تصدیق ہوئی کہ سالار موصوف نے اپنے ایک اردلی کو ہم سے ملنے اور اپنے ہمراہ ان تک لے جانے کے لئے بھیجا تھا۔ مگر کیونکہ وہ اس عام راستہ سے سفر نہیں کر رہے تھے۔ اس لئے ملاقات نہ ہو سکی۔ ۱۲۷؎

مآخذ و حواشی

- ۱۔ عبید اللہ سندھی۔ کابل میں ۷ سال۔ ص ۲۶
- ۲۔ حکیم محمد یعقوب قادری۔ رسالہ الرحیم ستمبر ۱۹۶۴ء۔ ص ۱۔ ۲
- ۳۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۹۳
- ۴۔ عبد اللہ لغاری۔ مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشت کابل۔ ص ۳۰
- ۵۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ تاریخ۔ کانفرنس کا ۱۹۱۵ کا انیس واں سالانہ اجلاس جسٹس عبد الرحیم۔ جج مدراس ہائیکورٹ کی صدارت میں پونہ میں ہوا تھا۔ یہ اجلاس

عموماً موسم سرما کی تعطیلات میں ہوتے تھے۔

- ۶۔ عبداللہ لغاری۔ سرگزشت کابل۔ ص ۲۲-۲۳
- ۷۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ ص ۳۱
- ۸۔ عبداللہ لغاری۔ مولانا سندھی کی سرگزشت کابل۔ ص ۳۲
- ۹۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۴۹
- ۱۰۔ ایضاً ایضاً ص ۵۰
- ۱۱۔ مولانا محمد میاں۔ تحریک شیخ الہند۔ ص ۱۷۰
- ۱۲۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۲۷
- ۱۳۔ حسین احمد مدنی۔ نقش حیات جلد دوم۔ ص ۱۴۲
- ۱۴۔ ایضاً ایضاً ص ۱۴۶
- ۱۵۔ محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل و یاغستان رسالہ سیاست و تاریخ۔ جولائی ۱۹۵۱ء۔ ص ۶۳
- ۱۶۔ برطانوی اور افغانی معاہدات۔ جامعہ جولائی ۱۹۳۳ء۔ ص ۶۴-۶۶
- ۱۷۔ حسن احمد مدنی۔ نقش حیات جلد دوم۔ ص ۱۴۹
- ۱۸۔ سید محمد حسین اغلب موہانی۔ نیرنگ افغانستان یعنی قومی و ملی افغانستان
- ۱۹۔ محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل و یاغستان، رسالہ تاریخ و سیاست جولائی ۱۹۵۱ء۔ ص ۵۹
- ۲۰۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۶۱
- ۲۱۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۵۴
- ۲۲۔ محمد علی قصوری۔ رسالہ تاریخ و سیاست جولائی ۱۹۵۱ء۔ ص ۶۹
- ۲۳۔ محمد علی قصوری۔ رسالہ تاریخ و سیاست اپریل ۱۹۵۱ء۔ ص ۶۶

- ۲۴۔ محمد محبوب رضوی۔ تاریخ دیوبند۔ ص ۱۴۸
- ۲۵۔ محمد علی قصوری۔ رسالہ تاریخ سیاست۔ جولائی ۱۹۵۱ء۔ ص ۷۶
- ۲۶۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۵۹
- ۲۷۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۶۰
- ۲۸۔ ایضاً ایضاً ص ۶۰
- ۲۹۔ ایضاً ایضاً ص ۶۱
- ۳۰۔ ایضاً ایضاً ص ۶۲
- ۳۱۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۱۱
- ۳۲۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۶۲-۶۳
- ۳۳۔ محمد سرور۔ کابل میں ۷ سال۔ ص ۴۰
- ۳۴۔ میم کمال اوکے۔ تحریک خلافت۔ ص ۳۲
- ۳۵۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۷۴
- ۳۶۔ شوکت عثمانی۔ میرا سفر روس۔ ص ۱۴
- ۳۷۔ ایضاً ایضاً ص ۷
- ۳۸۔ محمد ظفر حسن ایبک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۹۸
- ۳۹۔ عبید اللہ سندھی۔ کابل میں ۷ سال۔ ص ۴۳
- ۴۰۔ ایضاً ایضاً ص ۴۴
- ۴۱۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۶۳
- ۴۲۔ سید عابد علی وجدی الحسینی۔ برکت اللہ بھوپالی۔ ص ۱۵۶

- ۴۳۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۶۳
- ۴۴۔ سید عابد علی وجدی الحسینی۔ برکت اللہ بھوپالی۔ ص ۱۵۷
- ۴۵۔ وی بی کارنگ۔ ایم این رائے۔ ص ۱۴
- ۴۶۔ ایضاً ایضاً ص ۱۸-۱۹
- ۴۷۔ سید عابد علی وجدی الحسینی۔ برکت اللہ بھوپالی۔ ص ۱۵۸
- ۴۸۔ ایضاً ایضاً ص ۱۵۹
- ۴۹۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۱۲
- ۵۰۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۹۲
- ۵۱۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۶۴
- ۵۲۔ ایضاً ایضاً ص ۷۲
- ۵۳۔ ایضاً ایضاً ص ۷۲
- ۵۴۔ ایضاً ایضاً ص ۷۶
- ۵۵۔ محمد علی قصوری۔ تاریخ و سیاست جولائی ۱۹۵۱ء۔ ص ۹۶
- ۵۶۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۷۴-۷۵
- ۵۷۔ ایضاً ایضاً ص ۷۶
- ۵۸۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۱۱۰
- ۵۹۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۱۱۰
- ۶۰۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۱۱۱
- ۶۱۔ عبید اللہ سندھی۔ مکتب مولانا سندھی۔ ص ۲۵-۲۶

- ۶۲۔ حسین احمد مدنی۔ نقش حیات جلد اول۔ ص ۱۶۸
- ۶۳۔ محمد سرور۔ کابل میں ۷ سال۔ ص ۶۱
- ۶۴۔ محمد علی قصوری۔ مشاہدات کابل و یاغستان رسالہ تاریخ و سیاست، جولائی ۱۹۵۱ء ص ۶۴
- ۶۵۔ عبد الوحید خاں۔ برکت اللہ بھوپالی۔ سہ ماہی رسالہ فکر و تحقیق۔ جولائی ۱۹۹۸ء۔ ص ۳۰۵
- ۶۶۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول ص ۱۰۱
- ۶۷۔ غدر پارٹی
- ۶۸۔ عبید اللہ سندھی۔ کابل میں ۷ سال۔ ص ۶۵
- ۶۹۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۱۱۰
- ۷۰۔ عبد اللہ لغاری۔ مولانا سندھی کی سرگزشت کابل۔ ص ۱۲۳
- ۷۱۔ حسین احمد مدنی۔ نقش حیات جلد دوم۔ ص ۱۷۲
- ۷۲۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۹۳
- ۷۳۔ حسین احمد مدنی۔ نقش حیات جلد دوم۔ ص ۱۷۲
- ۷۴۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۹۹
- ۷۵۔ حسین احمد مدنی۔ نقش حیات جلد دوم۔ ص ۱۸۶
- ۷۶۔ ایضاً ایضاً ص ۱۸۶
- ۷۷۔ ایضاً ایضاً ص ۱۸۶
- ۷۸۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۱۱۹
- ۷۹۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۸۶
- ۸۰۔ حسین احمد مدنی۔ نقش حیات جلد دوم۔ ص ۱۶۹

- ۸۱۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۸۸-۸۷
- ۸۲۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۸۹
- ۸۳۔ مکتیب مولانا عبید اللہ سندھی۔ مرتبہ ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ ص ۲۳
- ۸۴۔ مکتوب مولانا سندھی بنام شیخ عبدالرحیم سندھی۔ مکتیب مولانا سندھی۔ ص ۲۲
- ۸۵۔ شیخ عبدالحق:- انکا نام جیون داس تھا۔ شاہ پور کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد تعلیم ختم کر دی۔ ۱۹۱۲ میں اسلام قبول کیا۔ خان بہادر رب نواز کے لڑکوں کے اتالیق رہے اور انہی کے ہمراہ ۱۹۱۵ میں افغانستان کو ہجرت کی۔
- ۸۶۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۸۹
- ۸۷۔ سیڈیشن کمیشن ہندوستانی مجاہدین آزادی کی سرگرمیوں کی تفتیش اور ان کی باغیانہ سرگرمیوں کے سد باب کرنے کے طریقوں پر اپنی رائے دینے کے لئے حکومت ہند نے دسمبر ۱۹۱۷ء میں بمبئی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر سیل اسکات کی سربراہی میں پانچ رکنی کمیٹی بنائی تھی۔ جس کو تمام حاصل دستاویزات کی روشنی میں انہیں رپورٹ دینی تھی۔
- ۸۸۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۱۱۳
- ۸۹۔ ایضاً ایضاً ص ۹۱
- ۹۰۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۱۳۰
- ۹۱۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۹۶-۹۷
- ۹۲۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۹۶
- ۹۳۔ ایضاً ایضاً ص ۱۳۴
- ۹۴۔ حسین احمد مدنی۔ نقش حیات جلد دوم۔ ص ۱۴۴
- ۹۵۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۹۸

- ۹۶۔ ایضاً ایضاً ص ۹۸
- ۹۷۔ عبید اللہ سندھی۔ کابل میں ۷ سال۔ ص ۶۷
- ۹۸۔ عبد اللہ لغاری۔ عبید اللہ سندھی کی سرگزشت کابل۔ ص ۱۸۹
- ۹۹۔ حسین احمد مدنی۔ نقش حیات حصہ دوم۔ ص ۱۳۸
- ۱۰۰۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۱۴۲
- ۱۰۱۔ میاں اکبر شاہ۔ آزادی کی کہانی۔ ص ۷۳
- ۱۰۲۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۱۱۰
- ۱۰۳۔ عبید اللہ سندھی۔ کابل میں ۷ سال۔ ص ۷۷
- ۱۰۴۔ ایضاً ایضاً ص ۷۹
- ۱۰۵۔ عبید اللہ سندھی۔ کابل میں ۷ سال۔ ص ۷۶
- ۱۰۶۔ عبد اللہ لغاری۔ عبید اللہ سندھی کی سرگزشت کابل۔ ص ۱۹۱
- ۱۰۷۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۲۰۲
- ۱۰۸۔ ایضاً ایضاً ص ۲۰۲
- ۱۰۹۔ ایضاً ایضاً ص ۲۰۲
- ۱۱۰۔ ایضاً ایضاً ص ۲۰۳
- ۱۱۱۔ ایضاً ایضاً ص ۲۳۶
- ۱۱۲۔ ایضاً ایضاً ص ۲۲۸-۲۲۹
- ۱۱۳۔ ایضاً ایضاً ص ۲۲۹
- ۱۱۴۔ ایضاً ایضاً ص ۱۰۴

- ۱۱۵۔ عبداللہ لغاری۔ عبید اللہ سندھی کی سرگزشت کابل۔ ص ۲۰۶
- ۱۱۶۔ ایضاً ایضاً ص ۲۰۷
- ۱۱۷۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی جلد اول۔ ص ۲۳۳
- ۱۱۸۔ محمد حسن۔ مولانا سندھی کابل میں۔ الرحیم مارچ ۱۹۶۵ء
- ۱۱۹۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۲۵۰
- ۱۲۰۔ عبید اللہ سندھی۔ کابل میں ۷ سال۔ ص ۱۳۴-۱۳۵
- ۱۲۱۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی۔ ص ۲۵۶
- ۱۲۲۔ عبداللہ لغاری۔ مولانا سندھی کی سرگزشت کابل۔ ص ۲۱۷
- ۱۲۳۔ ایضاً ایضاً ص ۲۱۱
- ۱۲۴۔ ڈاکٹر ہاجن شیخ۔ عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۲۰
- ۱۲۵۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۲۵۸
- ۱۲۶۔ ایضاً ایضاً ص ۲۵۹
- ۱۲۷۔ ایضاً ایضاً ص ۲۵۹

باب ششم

اشتراکی روس کی طرف سفر

انگریزوں کے دباؤ کے تحت مولانا کو افغانستان چھوڑنا پڑ رہا تھا۔ مگر وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان اور افغانستان کی قسمت مستقبل میں ایک دوسرے سے وابستہ رہے گی۔ اور جو سیاسی و سماجی تبدیلیاں ایک ملک میں آئیں گی دیر یا سویر وہ دوسرے ملک میں بھی آکر رہیں گیں۔ مولانا کا خیال تھا کہ اگر ترکی میں سازگار حالات بہم ہو گئے تو وہ دوبارہ افغانستان واپس آجائیں گے اور وہاں سے ہندوستان کی آزادی کا کام شروع کر دیں گے۔

ادھر روس کے لئے بھی افغانستان کی بہت اہمیت تھی۔ کیونکہ ایم ان رائے جو تاشقند کو مرکز

بنا کر مشرق میں انقلاب کی فضا ہموار کرنے کے کام کا آغاز کر چکے تھے اس خیال کے حامی تھے کہ افغانستان کے تعاون کے بغیر روس کی ہندوستان تک رسائی شمالی مغربی راستہ سے نہیں ہو سکتی تھی۔

کابل میں سویت سفارتخانے کے سربراہ ایف ایف رینکو نے ۵ مئی ۱۹۲۲ء کو اپنی حکومت کو مولانا سندھی کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہوئے کہا تھا کہ ”وہ کانگریس میں بائیں بازو کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا یقین ہے کہ پختون قبائل کی مدد سے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں خارجی طور پر بہت کام لیا جاسکتا ہے۔“ اسی اثناء میں احمد حسن اور محمد شفیق نے جو باقاعدہ

کیونست پارٹی میں شامل ہو چکے تھے اور ماسکو میں مقیم تھے کابل آ کر مولانا سندھی سے رابطہ قائم کیا اور انہیں ماسکو کا یہ پیغام دیا کہ انہیں اپنی اسکیم کے لئے جس مالی امداد کی ضرورت ہو وہ کابل کے روسی سفارتخانہ سے حاصل کر لیں۔^۵

روس سے مولانا سندھی کا رابطہ حکومت موقتہ الہند کے سفارتی مشن کے ذریعہ ہو چکا تھا مگر کیونست انقلاب سے قبل بھیجا گیا یہ مشن اس وقت اپنا سیاسی ہدف حاصل نہ کر سکا تھا بلکہ زار کی حکومت نے اس کی بنیاد پر خود برطانوی حکومت سے کچھ مراعات حاصل کر لی تھیں۔^۶

امیر امان اللہ کے زمانے میں افغان حکومت نے غلام محمد ولی خاں کی سرکردگی میں ایک وفد بھیج کر بالشویک حکومت کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی اس وفد کے ہمراہ مولانا سندھی کے بھتیجے عزیز احمد بھی گئے تھے۔ بکے تیسری مرتبہ مولانا نے ایم این رائے کی خواہش پر خوشی محمد کو ۱۹۲۱ء کے اوائل میں تاشقند بھیجا۔ ان کی خواہش تھی کہ بالشویک حکومت انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں ان کی مدد کرے۔ تاشقند میں روسی حکومت نے مشرق میں انقلاب کے کام کا آغاز کرنے کے لئے ایک یونیورسٹی قائم کی تھی۔ جس کے دائرہ کار میں ہندوستان، روس کا ایشیائی علاقہ اور وسط ایشیاء کا وہ وسیع علاقہ بھی شامل تھا جو ترکی سے افغانستان تک پھیلا ہوا تھا۔ اس زمانے میں یہ تمام علاقے بڑے انتشار کے عالم میں تھے۔ ایک بڑے رقبہ میں رہنے والے عوام نہایت پست حالت میں رہ رہے تھے۔ اس یونیورسٹی میں علاقہ کے عوام اور ہندوستانی مہاجرین کو فوجی اور سیاسی تعلیم دی جاتی تھی۔^۷ ایم این رائے سے مل کر خوشی محمد ماسکو گئے۔ جہاں انہوں نے کومنترن

(کیونست انٹرنیشنل) کے کچھ رہنماؤں سے رابطہ استوار کیا۔ خوشی محمد کیونست لٹریچر اور تحریک سے متاثر ہو کر کیونست پارٹی کے رکن بن چکے تھے اور ماسکو سے کابل اس ہدایت کے ساتھ واپس لوٹے تھے کہ کابل میں مولانا سندھی کو جب بھی اپنی اسکیم کے لئے مالی امداد کی ضرورت ہو وہ کابل کے روسی سفارتخانے سے حاصل کر لیں۔^۹

سات سال کابل میں قیام کے بعد مولانا سندھی اکتوبر ۱۹۲۲ء کو روس کے لئے روانہ ہو گئے

ان کے ہمراہیوں میں ظفر حسن، خوشی محمد، اقبال شیدائی، ڈاکٹر نور محمد، عمر ظفر مسعود، عبدالرشید، عبدالعزیز، سیوانا تھ بینرجی شامل تھے۔^{۱۰} افغان ارباب اقتدار نے اپنی مخصوص مصلحتوں کی بنا پر ان کیلئے سوویٹ سرحد تک پہنچنے کے جس راستہ کا تعین کیا تھا وہ ایک غیر معروف اور انتہائی دشوار گزار اور پرخطر راستہ تھا۔^{۱۱}

افغان عہدیداران یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ مزار شریف میں ان کی جزل نادر خاں سے ملاقات ہو سکے جو وہاں ان دنوں مالیہ وصول کرنے کے لئے اس کے اطراف میں قیام پذیر تھے۔ ظفر حسن نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ ”افغانی حکومت نے ہم سے جو روکھا پھیکا برتاؤ کیا تھا اس سے یہ احتمال پیدا ہوتا تھا کہ شاید افغانی حکومت خود ہم پر چھاپہ ڈالکر ہمارا سامان لٹوا دے گی اور یہ مشہور کر دے گی کہ پہاڑوں میں بعض ڈاکوؤں نے قافلہ پر حملہ کر کے اس کو لوٹ لیا مگر راستہ کی پریشانیوں سے قطع نظر ہمارا یہ گمان بے جا اور وہم پر مبنی تھا“۔^{۱۲}

کابل چھوڑنے سے قبل مولانا سندھی نے اپنے تمام کاغذات اللہ نواز کی تحویل میں دے دیئے تھے بعد میں اس کا کہنا تھا کہ بچہ سقہ کے دور رفتہ میں وہ تمام کاغذات ضائع ہو گئے۔ مگر مولانا سندھی کا گمان تھا کہ اس نے یہ کاغذات انگریزوں کے حوالے کر دیئے تھے۔ کیونکہ ماسکو میں انہیں جو انگریزی اخبارات ملے ان کے مندرجات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام دستاویزات برٹش سرکار کو مل گئی تھیں۔^{۱۳} مولانا سندھی کو ایک شکایت ہمیشہ رہی جو ان کے لئے سوہان روح تھی کہ پیامبر ہی رقیب بن جاتے تھے۔^{۱۴}

سات دن کے دشوار گزار سفر کے بعد یہ قافلہ مزار شریف پہنچا جو افغانستان اور ترکستان کی سرحد پر آخری افغان شہر تھا۔ اور اگلے روز ۲۳ اکتوبر کو دریائے آموکو بذریعہ کشتی عبور کر کے پٹاکیسر (جس کا قدیم تاریخی نام ترمذ ہے) پہنچے جو روسی علاقہ میں ان کا پہلا پڑاؤ تھا۔ ان کو امید تھی کہ پٹاکیسر سے بذریعہ ریل بخارا اور تاشقند ہوتے ہوئے ماسکو پہنچ جائیں گے۔ لیکن پٹاکیسر پہنچ کر معلوم ہوا کہ پٹاکیسر میں ریل نہیں ہے کیونکہ کمیونسٹ مخالف ترکستانی چھاپہ مار مزارحتی دستوں نے

جو باصحاچی کہلاتے تھے ریلوے لائن تہیں نہیں کر دی تھی۔ اب ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ پناکیسر سے کرکی یا کرشی (قرشی) جائیں جو وہاں سے تین چار روز کی راہ پر تھا۔ یہ سفر بھی انہیں کشتی کے ذریعہ کرنا تھا کیونکہ خشکی کے راستہ باصحاچیوں سے مڈبھیڑ کا امکان تھا۔ گوکشی کا سفر بھی اس قسم کے خطرے سے خالی نہیں سمجھا جاتا تھا۔^{۱۵} ترکستان میں نئی جمہوریہ قائم ہو چکی تھی

لیکن عوام پر اس کی گرفت کمزور تھی۔ انقلاب پسندوں کے غیر مسلم یا غیر مذہبی کردار کو نئی جمہوریہ کے خلاف استعمال کی بنیاد بنا دیا گیا تھا۔^{۱۶} چارونا چار چاردن کے خوردونوش کا سامان لیکر وہ

قرشی کے لئے روانہ ہوئے۔ مگر کشتی جس سست رفتاری سے چل رہی تھی اسکو دیکھتے ہوئے اندازہ تھا کہ یہ سفر چھ دن سے بھی طویل ہو سکتا تھا۔ اس خدشہ کے پیش نظر انہوں نے راستہ میں پڑاؤ کر کے مزید سامان کا انتظام کیا اور ساتویں دن قرشی پہونچے۔ گھاٹ سے ایک گدھا گاڑی پر سامان لدھوا کر قرشی ریلوے اسٹیشن پہونچے جہاں سے سرکاری مہمان کی حیثیت سے ان کے لئے ٹرین کے دوسرے درجہ میں سفر کا انتظام کیا گیا تھا۔^{۱۷}

روسی ٹرینوں میں سکیئنڈ کلاس ڈبوں میں چار چار آدمی سوار ہوتے تھے۔ ظفر حسن، ڈاکٹر نور محمد، عزیز احمد اور مولانا سندھی ایک ہی ڈبے میں سوار ہوئے اور باقی لوگ دوسرے ڈبوں میں یہ قافلہ ایک دن اور دو رات کے سفر کے بعد بخارا پہونچا جہاں انہیں بخارا گورنمنٹ کے مہمان کے طور پر ایک کوٹھی میں جو ایک بڑے باغ کے اندر تھی ٹھہرایا گیا۔ یہاں وہ دو روز رہے کیونکہ ماسکو جانے والی ٹرین میں جگہ ملنا مشکل تھا۔ دن کی وقت انہوں نے شہر کا چکر لگایا۔ دوکانوں میں سامان بالکل نہ تھا۔ کچھ دیہاتی ترکان اشیاء خوردونوش کی کچھ چیزیں لے آئے تھے جن پر خلقت ٹوٹی پڑی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے لوگ اپنی ضروریات کی چیزیں انہی لوگوں سے پوری کرتے تھے۔ ہر طرف افراط فری کا عالم تھا صفائی کا کوئی انتظام نہ تھا۔^{۱۸}

بالشویک انقلاب کے بعد روسیوں نے لوگوں کی جائیدادوں، گھروں، دکانوں، کارخانوں پر جبریہ قبضہ کر لیا تھا کیونکہ کمیونسٹ اصول ذاتی ملکیت کی اجازت نہیں دیتے۔ اس لئے ہر شخص مزدور کے درجہ پر گر کر اپنی قوت لایموت کیلئے حکومت کا محتاج ہو گیا تھا۔ گھروں کی اتنی کمی ہو گئی تھی کہ سارا

خاندان صرف ایک کمرے میں رہنے پر مجبور تھا۔ انقلاب کو پانچ سال گزر چکے تھے ہر طرف زراچ کا عالم تھا۔ صرف وہ لوگ جنکو سرکار کی طرف سے مزدوری اور کام مل جاتا تھا روٹی کما سکتے تھے جو شخص کوئی کام نہ کرے اس کا بھوکا رہنا ضروری تھا۔ بوڑھے، کمزور اور بیمار ایسی ناداری کی حالت میں تھے کہ انسان کو ان پر رحم ہی آتا تھا۔ بخارا جو ایک زمانہ میں اسلامی تہذیب اور علم کا مرکز تھا بالکل ایک ویران ساقصبہ تھا۔ پرانے مدرسے اور مسجدیں خراب حالت میں پڑی ہوئی تھیں۔^{۱۹}

پیٹر اعظم (۱۶۸۲-۱۷۲۵ء) نے اپنی قوم کو ہدایت کی تھی کہ روس کو جنوب کی طرف لازماً خلیج تک توسیع دینی چاہیے۔ اور روسیوں کی اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ زار کے عہد میں کریمیا سے لے کر قزاقستان اور بخارا کے ترک علاقے روسی سلطنت کا حصہ بن گئے تھے۔^{۲۰}

پندرہویں صدی کے اواخر اور سولہویں صدی کے اوائل میں پورے وسط ایشیاء پر خانہ بدوش قبائل کا قبضہ رہا۔ ایرانیوں نے شکست دیکر ان علاقوں پر اپنی بالادستی ضرور قائم کر لی۔ لیکن وقت گزرنے کی ساتھ ساتھ مستقل سکونت رکھنے والے نئے اور پرانے قبائل ایک دوسرے میں بڑی تیزی سے خلط ملط ہو گئے اور نئی قوم ازبک نام سے مشہور ہو گئی۔^{۲۱}

جوں جوں جاگیرداری نظام میں ترقی ہوتی گئی علاقہ میں نئی نئی حکومتیں بنتی گئیں جو ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتیں۔ اٹھارہویں صدی کی پانچویں دہائی میں یہ علاقہ ایران کے تحت آ گیا۔ ۱۷۵۳ء میں محمد رحیم کو بخارا کے خانوں کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اور اسی کو پہلے امیر بخارا کا خطاب دیا گیا۔ اس نے منغیت خاندان کی بنا ڈالی جو ۱۹۲۰ء تک یہاں حکومت کرتا رہا۔^{۲۲}

انیسویں صدی کے آخر میں وسطی ایشیاء روس اور برطانیہ کے درمیان رقابتوں کا اکھاڑہ بن گیا۔ روس میں زار کی حکومت کی خواہش تھی کہ روس کی صنعتی ترقی کے لئے وسط ایشیاء میں خام مال کے ذخائر پر قبضہ کیا جائے اور انگریزوں کو آگے بڑھنے سے روکا جائے۔ ۱۸۶۰ء میں روسی فوجوں نے وسط ایشیاء کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور رفتہ رفتہ ۱۸۷۶ء تک یہ تمام علاقے روسی حکومت کا حصہ بن گئے۔ ان علاقوں میں زار کی اقتصادی پالیسیوں کا واحد مقصد یہ تھا کہ کپاس کی فصل کو ترقی

دی جائے اور جلد ہی یہ علاقہ روسی صنعتوں کو خام مال مہیا کرنے والا اہم حصہ بن گیا۔ ۱۹۱۰ء میں ایک قانون پاس کر کے ترکستان کی مقامی آبادی سے نہ صرف زمین کی ملکیت کا حق چھین لیا گیا بلکہ ہر طرح کے ظلم و تشدد کا بازار بھی گرم رکھا گیا۔ روس کے دوسرے حصوں میں حکومت کے خلاف جو تحریکیں چل رہی تھیں اس کے اثرات ان علاقوں پر بھی پڑ رہے تھے۔ جو ۱۹۱۶ء میں وسط ایشیاء میں بغاوت کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ ان کا مقصد نوآبادیاتی غلامی سے چھٹکارہ پا کر قومی آزادی کا حصول تھا۔ گوکہ بغاوت کچل دی گئی مگر زار کے خلاف عوامی جدوجہد جاری رہی۔ ۲۳

بخارا اگرچہ اپنی گذشتہ عظمت و بزرگی کھو چکا تھا مگر پھر بھی وسط ایشیاء میں علمی و مذہبی مرکز کی حیثیت سے خاص شہرت و امتیاز کا مالک تھا۔ اور ہر طرح کے دباؤ کے باوجود اس نے اپنی آزادی برقرار رکھی تھی۔ ۲۴

زار روس کے خاتمہ کے بعد روسی سلطنت میں بسنے والی مختلف اقوام کو اپنی قومی آرزوں کے کھلے بندوں اظہار کا اس عہد میں سب سے زیادہ موقع ملا۔ روسی واقعات سے جبری ہو کر امیر بخارا کی مخالفت میں بخاری نوجوانوں کی نئی تنظیم ظاہر ہوئی جسکو سختی سے کچل دیا گیا۔ مگر مکمل روسی حملہ کے پیش نظر تمام ریل کی پٹریوں کو توڑ ڈالا گیا تھا اس دور میں بشکیر یا اور آذربائیجان کی آزاد مسلم حکومتیں قائم ہو گئیں۔ تاتاری مسلمانوں میں پاک اسلام ازم کی تحریک اٹھی مگر وہ جلد ہی آپس کے اختلافات کے سبب بالٹکون کے سامنے دم توڑ گئی۔ ۲۵ بالآخر نومبر ۱۹۱۷ء تا مارچ ۱۹۱۸ء کے عرصے میں سوویت

اقتدار اس پورے حصہ میں پھیل گیا جو کبھی ترکستان کا حصہ تھا۔ مولانا سندھی کے ہمراہیوں میں سے عبدالرشید نے بخارا میں بس جانے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ بخارا میں روس کے دوسرے حصوں کے مقابلہ میں زیادہ مسلمان آباد تھے۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بخارا میں گزارا نہیں کر سکا اور ایران کے راستہ ہندوستان واپس چلا گیا۔ ۲۶

بخارا سے وہ تاشقند پہنچے اور ماسکو جانے والی گاڑی کے انتظار میں انہیں ایک دن تاشقند میں ٹھہرنا پڑا۔ شہر گھومنے پر انہوں نے دیکھا کہ شہر کے پرانے حصہ میں ترکستانی اور نئے حصہ میں روسی آباد تھے۔ وسط ایشیاء کے سارے بڑے شہروں میں یہی حال تھا زار کے زمانے میں یہاں

روسی خاندان لاکر بسائے گئے تھے تاکہ مقامی لوگ روسی تہذیب اور روسی طرز معاشرت کے دلدادہ بن کر بالکل روسی ہو جائیں۔ زار روس کی اسی پالیسی کو بالشونک حکومت نے بھی بہت شد و مد سے جاری رکھا تھا۔ بخارا کی طرح یہاں بھی مذہبی مدارس بند کر دئے گئے تھے۔ مساجد میں نماز کی ادائیگی ممنوع تھی۔ ۲۷

تاشقند میں اس وقت کمیونزم کی تعلیم کے لئے ایک مشرقی یونیورسٹی قائم تھی۔ طالب علموں میں ہندوستان سے ہجرت کر کے افغانستان آئے ہوئے اور پھر وہاں کے حالات سے بد دل ہو کر روس پہنچے ہوئے بعض مسلمان نوجوان بھی تھے۔ جن کو ہندوستان میں کمیونسٹ انقلاب برپا کرنے کے لئے تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ اسکول انگریزی حکومت کے شدید دباؤ کے تحت نہ چل سکا اور چند ماہ (اکتوبر ۱۹۲۰ء تا مئی ۱۹۲۱ء) میں اس کو بند کرنا پڑا مگر ہندوستان میں کمیونزم کی تحریک کے فروغ کے اعتبار سے یہ اسکول بہت اہم تھا۔ جہاں سے اس تحریک کو فعال کام کرنے والے ملے جن میں نمایاں نام شوکت عثمانی، رفیق احمد، اکبر شاہ، فضل الہی قربان، عبد المجید اور فیروز الدین منصور کے ہیں۔ ان میں سے بیشتر پشاور، کانپور اور میرٹھ سازش کیس میں شریک ہوئے۔ ۲۸

تاشقند میں ایک روزہ قیام کے بعد وہ ماسکو کے لئے روانہ ہوئے اور تقریباً ایک ہفتہ بعد ۱۰ نومبر ۱۹۲۳ء کو ماسکو پہنچے۔ کابل سے ماسکو تک کا سفر انہوں نے ۲۶ دن میں طے کیا۔ وہ لکس ہوٹل میں ٹھہرائے گئے کیونکہ جائیدادوں کے سرکاری ملکیت میں چلے جانے کے بعد ماسکو میں کرائے کے مکان کا حصول مشکل مرحلہ تھا۔ لکس ہوٹل غیر ملکی کمیونسٹوں اور حکومت کے غیر ملکی مہمانوں کیلئے مخصوص تھا۔ اس لئے حکومت اور کمیونسٹ پارٹی کے اعلیٰ عہدیدار بھی وہاں مستقلاً مقیم تھے۔ مولانا اور ان کے ہمراہیوں کو ایک بڑا کمرہ مل گیا۔ یہاں ان کی کابل کے دو پرانے ساتھیوں رحمت علی ذکر یا اور عبدالحامد سے ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں تاشقند کی مشرقی یونیورسٹی میں داخلہ لینے افغانستان سے چلے گئے تھے اور تاشقند یونیورسٹی کے بند ہو جانے کی وجہ سے ماسکو آ گئے تھے۔ ۲۹

کانگریس کمیٹی کابل کے صدر اور حکومت موقتہ ہند کے وزیر داخلہ کی حیثیت سے یہاں حکومت نے مولانا سندھی کا استقبال کیا۔ اپنی ملکی قومی تحریک کے مفاد میں روس جیسی مذہب دشمن حکومت بھی مولانا سندھی جیسی مذہبی شخصیت کو امداد دینے کو تیار تھی۔ ۳۰

اپنے اس سفر میں انہوں نے روس میں نئی بنیادوں پر ایک نئے عالم کو تعمیر ہوتے ہوئے دیکھا۔ نیا روس بالکل لادینی تھا۔ اور وہ پکے دیندار۔ لیکن مولانا کی دینداری نے انقلابیوں کی اس لادینی میں بھی صحیح دینی جذبہ کو سرگرم پایا۔ انہیں اسلام روسی انقلاب کی ان ساری بلندیوں سے بھی بلند نظر آیا۔ ۳۱

بالشویک حکومت مولانا کا بہت زیادہ احترام کرتی تھی۔ اور ان کے افکار و خیالات سے استفادہ کرتی تھی۔ مشہور روسی عالم موسیٰ جاراللہ کا کہنا ہے کہ حکومت نے مولانا کے بعض ارشادات انگریزی زبان میں طبع کرائے۔ جن کا ایک فارسی نسخہ جاراللہ کے پاس تھا۔ ۳۲

ظفر حسن نے لکھا ہے کہ انہی ایام میں مولانا سندھی نے انہیں ماسکو کی مشرقی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی ہدایت کی تاکہ ان کے ذریعہ کمیونسٹوں کے اصول تعلیم اور کمیونزم کے بنیادی عقائد کا پتہ لگائیں تاکہ آزاد ہندوستان میں ایسا نظام قائم ہو سکے جو کمیونزم کا توڑ ہو اور ہندوستانی عوام اس نظام کو اپنا کر کمیونزم کے پیچھے نہ دوڑیں اور کمیونزم جو مذہب دشمن ہے اس سے ہندوستان میں اپنے مذہب کو بچانے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں۔ ۳۳ یونیورسٹی میں داخلہ کے بعد ظفر حسن

روز آ نہ شام کیوقت یونیورسٹی کے لکچر ختم ہونے کے بعد ان اسباق کا خلاصہ مولانا کو سنایا کرتے تھے جس سے مولانا سندھی کو کمیونسٹ نظریوں، کمیونسٹ اصول حکومت کے بارے میں آہستہ آہستہ معتد بہ معلومات حاصل ہو گئیں ظفر حسن کا کہنا ہے کہ کمیونسٹ تعلیم کے وہ پہلو جو اسلامی احکام و عقائد کے خلاف تھے اور جن کی بنیاد پر ان کے ساتھیوں کے دل میں جو شک و شبہات اور ذہنی تشویش پیدا ہوتی تھی اس کو وہ مولانا سندھی کی خدمت میں عرض کر کے اطمینان بخش اور شافی جواب دریافت کر لیا کرتے تھے۔ ۳۴

یونیورسٹی کے اساتذہ کا اسلام پر بڑا اعتراض حقوق ملکیت پر تھا۔ اور جب ظفر حسن نے یہ مسئلہ مولانا سندھی کے سامنے رکھا تو انہوں نے فرمایا کہ قرآن شریف میں اللہ فرماتا ہے 'ان اللہ اشتری من المؤمنین اموالہم و انفسہم بان لہم جنة' یعنی اللہ نے مومنوں کے مال اور ان کی جانوں کو ان سے جنت کے بدلے خرید لیا ہے۔ اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ضرورت کیوقت

مسلمانوں کو اپنی جان اور ذاتی مال سے دست بردار ہونا پڑ سکتا ہے۔ اور ان کو خداوند کریم آخرت میں اس کے عوض جنت دے گا۔ یعنی اسلام میں ذاتی ملکیت کا اصول ضرورت کیوقت بالکل اٹھایا جاسکتا ہے۔ ۳۵

مولانا سندھی نے مزید کہا کہ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایک ایسا مذہب نہیں جس میں ذاتی ملکیت کا اصول ہمیشہ قائم رکھنا ضروری ہو۔ اگر ضرورت پیش آئے اور زمانے کا حال ایسا ہو جائے کہ اس میں ذاتی ملکیت قائم رکھنے کی وجہ سے مسلمان اپنے مذہب اور ایمان کو خطرے میں دیکھیں تو ذاتی ملکیت کے اصول سے دست بردار ہو سکتے ہیں اور اس اصول کو بدل سکتے ہیں۔ لہذا اسلام ایک قدامت پسند مذہب نہیں جو مالداروں کو غریبوں کے استحصال کی اجازت دے یا اس کا موقع دے۔ ۳۶

ظفر حسن کا بیان ہے کہ حکومت کا کہنا تھا کہ تمام مذاہب رجعت پسند ہیں کیونکہ ملکیت زمین کو مشترکہ ملکیت کے ذرائع کیونکہ بنانے کے لئے وہ کوئی واضح ہدایت نہیں دیتے۔ کیا اسلام بھی زمین کی ملکیت منفرد اشخاص کو دینا چاہتا ہے۔ مولانا کا جواب نفی میں تھا۔ اسکا ثبوت انہوں نے یہ پیش کیا کہ فتح ایران کے بعد عرب فاتحین نے ایران کی زمینوں کو اپنی ذاتی ملکیت بنا کر ان پر اس بنا پر قبضہ کرنا چاہا کہ یہ زمین انہوں نے اپنی قوت بازو سے حاصل کی تھی تو حضرت عمرؓ نے انکو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ ساری زمین کو بیت المال کی ملکیت قرار دیا اور فاتحین کو صرف ان زمینوں پر کاشت کا حق عطا فرمایا۔ ۳۷

مولانا کے اسلامی طور طریقے نماز روزہ وغیرہ پر کسی طرح کی کوئی پابندی نہ تھی۔ حکومت کے اکثر حکام سے مولانا اسلام کے متعلق آزادانہ گفتگو کرتے تھے۔ وزارت خارجہ روس برطانوی حکومت کے ان احتجاجی مراسلات کا جواب دینے میں اکثر ان سے مدد لیتی تھی جو آزاد قبائل میں ہونے والی فوجی جھڑپوں کے سلسلہ میں اسے موصول ہوتے تھے۔ ۳۸

اپریل ۱۹۲۳ء میں پڑنے والا رمضان انہوں نے سینٹ پیٹرز برگ میں روس کے مشہور عالم دین

موسیٰ جارا اللہ کی دعوت پر ان کے گھر گذارا۔ اس موقع پر ظفر حسن اور ان کی کلاس کے دوسرے طلباء کو بھی سینٹ پیٹرز برگ جانے کی اجازت دی گئی تھی۔ مولانا سندھی کو بھی عزیز احمد کے ساتھ ان طلباء کے ہمراہ جانے کی اجازت دی گئی۔ دو ہفتہ کے قیام کے دوران روس کے بہت سے علماء مولانا سندھی سے ملنے اور تبادلہ خیال کرنے آئے۔ ۳۹

سینٹ پیٹرز برگ میں دن طویل اور رات مختصر ہوتی تھی۔ ظفر حسن کے مطابق ۲۱ گھنٹہ کا روزہ ہو جاتا تھا۔ افطار کر کے آرام کی نوبت بھی نہ آتی تھی۔ عشاء کی نماز اور تراویح پڑھنے کے کوئی دو گھنٹہ بعد (یعنی غروب آفتاب کے ۳ گھنٹہ بعد) صبح صادق کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔ ایک روز موسیٰ جارا اللہ نے ایسے ملکوں میں روزہ رکھنے کا مسئلہ مولانا سندھی سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ایسے ملکوں میں بارہ گھنٹے کا روزہ رکھنا اور ۱۲ گھنٹے آزادی سے کھانا پینا چاہئے۔ اور نماز پنج وقتہ بھی اسی اصول پر ادا کی جانی چاہئے۔ اسلامی احکام جو ساری دنیا کے لئے ہیں وہ دنیا کے انہی حصوں کے لوگوں پر جاری ہو سکتے ہیں جو ایسی جگہوں پر آباد ہیں جہاں قوانین فطرت اوسط درجہ پر چلتے ہیں۔ بحر محمد شمالی اور بحر محمد جنوبی کے ملکوں میں جہاں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات ہوتی ہے وہاں صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزہ رکھنا ممکن ہے۔ ۴۰

موسیٰ جارا اللہ کے بیان کے مطابق مولانا اور ان کے ساتھیوں نے بعد از سفر روزے قضا نہیں کئے۔ ان کی رفیقہ حیات معزز مہمانوں کے واسطے چاء، دوپہر اور رات کا کھانا افطاری اور سحری تیار رکھتی تھیں اس دوران انہوں نے کبھی روزہ قضا نہیں کیا۔ ۴۱

مولانا سندھی اور ان کے رفقاء نے لینن گراڈ (سینٹ پیٹرز برگ) کی خوب سیر کی اور ہر وہ چیز دیکھی جو شوقین سیاحوں کا مطمح نظر ہو سکتی تھی۔ علاوہ ازیں آپ نے بہت سی ایسی چیزیں بھی دیکھیں جن کو کم ہی لوگ دیکھتے ہیں۔ ۴۲

سینٹ پیٹرز برگ روانہ ہونے سے قبل مولانا نے حکومت موقتہ ہند سے متعلق بہت سی دستاویزات جو وہ کابل سے چلتے وقت اپنے ساتھ لے آئے تھے رحمت علی ذکر کیا کی تحویل میں دے دی تھیں۔ واپسی پر رحمت علی نے مولانا کو بتایا کہ کس ہوٹل کے کمرے میں رکھے صندوق سے

کاغذات پر اسرار طریقہ سے غائب ہو گئے ہیں۔ مولانا کو یقیناً اس خبر سے بہت صدمہ ہوا۔ یہ تمام کاغذات بہت اہم اور تاریخی اہمیت کے تھے۔ مولانا کو یقین تھا کہ یہ بالشویک حکومت کے کارندوں کا کام تھا اور اسکا خدشہ تھا کہ اس طرح روسی حکومت کا بل میں ان کی تمام سرگرمیوں سے واقف ہو جائے گی۔^{۴۳}

وزارت خارجہ سے متعلق ہر افسر کے لئے روسی اور ایک یورپین زبان کے علاوہ مزید ایک غیر ملکی زبان سیکھنا ضروری تھا۔ اور یہ اہلکار عموماً مشرقی یونیورسٹی کے غیر ملکی طلباء سے یہ خدمت لیتے تھے۔ ظفر حسن رائے کو اردو پڑھانے لگے۔ رائے سے وہ ان دنوں سے آشنا تھے جب وہ افغانستان کے روسی سفارتخانے میں فرسٹ سیکریٹری تھا۔ ظفر حسن اس کو اردو کا سبق دینے کے لئے ہفتہ میں دو دفعہ رات کو اس کے گھر جاتے تھے۔ اس خدمت کا وہ کوئی محنت نہ نہیں لیتے تھے۔ لیکن اس سے یہ فائدہ ہوا کہ رفتہ رفتہ رائے سے ان کی قربت بڑھ گئی۔^{۴۴}

ظفر حسن کا بیان ہے کہ ”ایک دن میں نے اسے بتایا کہ روس میں ایک ہندوستانی لیڈر مدت سے آیا ہوا ہے جس کا رسوخ نہ صرف اپنے ہموطنوں میں بہت زیادہ ہے بلکہ جس نے افغانستان کو انگریزوں سے لڑا دیا تھا اور جس کے افغانستان میں جزل نادر خاں جیسے بڑے بڑے سردار دوست ہیں۔ جو آل انڈیا کانگریس کی کابل کمیٹی کا پریسڈینٹ اور حکومت موقتہ ہند کا وزیر رہ چکا ہے۔ ایم این رائے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر ہے۔ لیکن آج تک ہندوستان میں کوئی انقلابی تحریک نہیں پیدا کر سکا۔ مولانا صاحب ہندوستان کے صف اول کے لیڈروں کے ذاتی دوست ہیں وہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بہت کام کر سکتے ہیں بشرطیکہ روسی حکومت انہیں مدد دینے کو تیار ہو۔“^{۴۵}

رائے ان دلائل سے متاثر ہوا اور اپنے افسران بالا کو قائل کر کے روسی وزیر خارجہ چجرن سے مولانا کی ملاقات کا اہتمام کیا۔ پہلی ملاقات جون ۱۹۲۳ء کے پہلے ہفتہ میں وزارت خارجہ

کے دفتر میں ہوئی۔ مولانا نے پریسڈنٹ کانگریس کمیٹی کا بل کی حیثیت سے خود کو متعارف کرا کر گفتگو کا آغاز کیا۔ ۴۶

مولانا نے چچرن پر یہ بات بالکل واضح کر دی کہ وہ ہندوستان سے انگریزی حکومت کا قلع قمع کرنے کے لئے روسی حکومت سے تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن یہ تعاون روسی کمیونسٹ پارٹی سے نہیں ہو سکتا۔ روسی گورنمنٹ ہی سے اس بارے میں گفتگو کی جاسکتی ہے۔ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا روسی گورنمنٹ کے مفاد کا باعث ہے تو روسی گورنمنٹ کو انڈین نیشنل کانگریس سے سمجھوتہ کرنا چاہئے۔ ۴۷

چچرن اس تجویز کو روسی کمیونسٹ میں پیش کرنے کو تیار ہو گیا۔ اور جواب دینے کے لئے ایک ہفتہ کا وقت مانگا۔ مولانا نے اس ملاقات کو اپنے ساتھیوں سے پوشیدہ رکھا۔ وہ اس بات چیت کے مثبت نتائج کے سلسلہ میں مشکوک تھے۔ کیونکہ مولانا کے مطابق ایسی تجویز جس میں کمیونسٹ پارٹی کا کوئی دخل نہ ہو اسے کیا حکومت تسلیم کرے گی۔ ۴۸

ایک ہفتہ کے بعد ہونے والی دوسری ملاقات میں چچرن نے مولانا سندھی کو بتایا کہ روسی گورنمنٹ ہندوستانی قومی تحریک میں مدد دینے کو تیار ہے مگر یہ وضاحت چاہتی ہے کہ یہ مدد مالی ہوگی یا ہتھیاروں کی شکل میں اور اس کو ہندوستان کس طرح پہنچایا جائے گا۔ ۴۹

مولانا سندھی نے اس کے جواب میں کہا کہ ”انڈین نیشنل کانگریس کا اصول پر امن عدم تعاون ہے اس لئے ہتھیاروں کی مدد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مدد صرف روپیہ کی صورت میں ہونی چاہئے اور فی الحال انڈین نیشنل کانگریس کو ایک کڑور روپیہ دیا جانا چاہئے جسکو ہندوستان قرض سمجھے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ضروری ہے کہ افغانستان بھی روس کے ساتھ ملکر کام کرے۔ کیونکہ روس کے لئے ہندوستان سے تعلق پیدا کرنے اور اس تعلق کو برقرار رکھنے کا سب سے زیادہ محفوظ راستہ افغانستان ہی ہے۔ اور افغانستان کو جو اس وقت ایک نئی حکومت قائم کرنے میں لگا ہے ایک کڑور روپیہ ہندوستان سے تعلق بنانے اور اسکو قائم رکھنے کے لئے اور روس کو راستہ دینے کے لئے ادا کرنا چاہئے۔ ۵۰

عبداللہ لغاری کا بیان ہے کہ اپنی ملکی قومی تحریک کے مفاد میں روس جیسی لامذہب حکومت مولانا سندھی جیسی مذہبی شخصیت کو امداد دینے کو تیار تھی۔ چچرن نے انہیں سمرقند کا حاکم بنانے کی بھی دعوت دی کہ جس طرح شاہ ولی اللہ کا سوشلزم آپ بیان کرتے ہیں اس کے مطابق وہاں حکومت قائم کرو۔ مولانا نے آزادانہ کام کرنے کی شرط رکھی مگر بات اس پر ختم ہو گئی کہ صدر ریاست روسی ہو گا یہ تجویز گفتگو سے آگے نہ بڑھی۔ ۵۱

تیسری ملاقات میں چچرن نے مولانا کو بتایا کہ سوویت گورنمنٹ نے ان کی شرطیں تسلیم کر لی ہیں اور وہ ہندوستان کو اس کی قومی تحریک کے سلسلہ میں مدد دینے کو تیار ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مدد کس طرح پہنچائی جائے۔ مولانا نے کہا کہ ”ضروری ہو گا کہ میں اور میرے ساتھ کام کرنے والے اشخاص جتکو میرے ساتھ ۱۹۲۲ء میں افغانستان چھوڑنا پڑا تھا پھر کابل واپس جائیں۔ اور میں ترکی جا کر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کروں اگر ترکی میں رہ کر رابطہ نہ ہو سکا تو ضروری ہو گا کہ میں حجاز جاؤں اور وہاں حج پر آنے والے اپنے دوستوں سے ملکر یہ پیغام ہندوستان بھیجوں اور افغانستان کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کروں۔“ ۵۲

چچرن کو یہ رائے پسند آگئی مگر اس نے یہ شرط لگائی کہ کام چھ ماہ میں ہو جانا چاہئے اگر اس عرصہ میں کانگریس نے مدد طلب کی تو ہم رقم پہنچا دیں گے۔ چچرن نے کہا کہ وہ ترکی جا کر ان تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا کام شروع کریں اور ان کو اس رابطہ کے لئے جس امداد کی ضرورت ہو گی وہ استانبول کے روسی قونصل خانہ کے ذریعہ مہیا کی جائیگی۔ ۵۳

مولانا کے ہمراہیوں میں سے اقبال شیدائی اور ظفر حسن روس میں اپنے حالات سے غیر مطمئن تھے وہ کمیونزم کے نظریہ کو اپنانا نہیں چاہتے تھے اور ترکی جانے کے خواہشمند تھے جو ہندوستان سے ہجرت کرتے وقت ان کی ذہنی منزل مقصود تھی۔ اقبال شیدائی ایک دن روس میں ترکی سفیر احمد مختار سے ملنے گئے۔ جو ترکی میں انجمن اتحاد اور ترقی کے فعال رکن رہ چکے تھے اور ہندوستانی مسلمانوں نے ترکی کے لئے جو مادی و اخلاقی امداد فراہم کی تھی اس سے بخوبی واقف تھے۔ جب اقبال شیدائی کی زبانی انہوں نے مولانا سندھی کے حالات، قربانی اور جدوجہد کے حالات سنے تو ان

سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ مگر مولانا سندھی نے ترکی سفیر کے پاس خود جانا بہتر جانا۔ اس ملاقات کے دوران اقبال شیدائی اور ترکی سفیر کے برادر خور و تحسین بیگ بھی موجود تھے جنہوں نے ترجمانی کے فرائض انجام دیئے۔ اس ملاقات کے نتیجہ میں مولانا کے ترکی جانے کی راہ ہموار ہو گئی اور مولانا کے ساتھ ساتھ اقبال شیدائی اور ظفر حسن کو بھی ترکی کا ویزا مل گیا۔^{۲۵}

مآخذ و حواشی

- ۱۔ عبید اللہ سندھی۔ کابل میں ۷ سال۔ ص ۱۳۵
- ۲۔ ایم این راے (منادیندر ناتھ) ۱۸۸۷ء میں کلکتہ کے قریب ضلع چوہیس پر گنہ کے ایک گاؤں اربیلیا میں پچاریوں کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام زیندر ناتھ تھا۔ گذشتہ صدی کی پہلی دہائیوں میں ملک میں جو مسلح جدوجہد ہوئی اس میں انہوں نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ بعد کے سالوں میں میکسیکو اور چین میں ہونے والی انقلابی جدوجہد میں بھی حصہ لیا۔ وہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کی مرکزی کمیٹی کے رکن رہے تھے۔ ہندوستان واپس آ کر یہاں کی سیاست میں حصہ لیا مگر سیاسی صفوں میں کوئی جگہ نہ بنا سکے۔ ان کا انتقال ۲۵ جنوری ۱۹۵۲ء کو ہوا۔
- ۳۔ وی بی کارنگ۔ ایم این راے ص ۴۴
- ۴۔ ایم اے پرسٹس۔ ہندوستان انقلابی سوویٹ روس میں (انگریزی)۔ ص ۲۲۹
- ۵۔ ایضاً۔ ایضاً۔ ص ۲۲۹

- ۶۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ عبید اللہ سندھی (انگریزی)۔ ص ۱۱۸
- ۷۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۱۹
- ۸۔ وی بی کارنگ۔ ایم این رائے۔ ص ۴۱
- ۹۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۲۰۵
- ۱۰۔ ڈاکٹر ہاجن شیخ۔ عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۲۰
- ۱۱۔ عبید اللہ سندھی۔ کابل میں ۷ سال۔ ص ۱۳۵
- ۱۲۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص ۲۵۹
- ۱۳۔ مولانا عبداللہ لغاری۔ مولانا سندھی کی سرگزشت کابل۔ ص ۲۱۱
- ۱۴۔ عبید اللہ سندھی کے سیاسی مکتوبات۔ محمد اسلم۔ ص ۷۴
- ۱۵۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۱
- ۱۶۔ وی بی کارنگ۔ ایم این رائے۔ ص ۴۱
- ۱۷۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ اول ص ۲۰۱
- ۱۸۔ ایضاً ایضاً ص ۶
- ۱۹۔ ایضاً ایضاً ص ۶-۷
- ۲۰۔ محمد حسین ہیکل۔ آیت اللہ کی واپسی۔ جہارت ہکم اگست ۱۹۸۱ء۔
- ۲۱۔ دویندر کوشک۔ سوویٹ وسط ایشیاء۔ ص ۳۴-۳۵
- ۲۲۔ دویندر کوشک۔ سوویٹ وسط ایشیاء۔ ص ۱۷
- ۲۳۔ جے اے زکومسکی۔ روس میں ترکی ازم اور اسلام۔ الرحیم ستمبر ۱۹۶۲ء۔ ص ۵۷
- ۲۴۔ اے راوسن۔ ناشاد بخارا۔ مترجمہ نجیب اشرف ندوی۔ معارف ستمبر ۱۹۲۲ء۔ ص ۲۰۹

- ۲۵۔ جے اے زکونسکی روس میں ترکی ازم اور اسلام۔ الرحیم اگست ۱۸۶۳ء۔ ص ۶۵
- ۲۶۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۱۰
- ۲۷۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۱۰
- ۲۸۔ وی بی کارنگ۔ ایم این رائے۔ ص ۴۳
- ۲۹۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۱۵۔
- ۳۰۔ ایضاً ایضاً ص ۲۹-۳۰
- ۳۱۔ محمد سرور۔ عبید اللہ سندھی۔ ص ۲۳
- ۳۲۔ موسیٰ جار اللہ۔ رسالہ جامعہ دسمبر ۱۹۴۴ء۔ ص ۲۵
- ۳۳۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۲۰
- ۳۴۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۲۰
- ۳۵۔ ایضاً ایضاً ص ۳۲
- ۳۶۔ ایضاً ایضاً ص ۳۲
- ۳۷۔ ایضاً ایضاً ص ۳۳
- ۳۸۔ عزیز الرحمن جامعی لدھیانوی۔ ہندوستان کے مسلم مجاہدین آزادی ص ۵۳
- ۳۹۔ موسیٰ جار اللہ۔ عبید اللہ ابن الاسلام جامعہ۔ دسمبر ۱۹۴۴ء۔ ص ۲۶-۴۴
- ۴۰۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۴۲
- ۴۱۔ موسیٰ جار اللہ۔ امام عبید اللہ ابن الاسلام۔ رسالہ جامعہ۔ دسمبر ۱۹۴۴ء۔ ص ۲۶
- ۴۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۲۶
- ۴۳۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۴۸

- ۴۴۔ ایضاً ایضاً ص ۴۸-۴۹
- ۴۵۔ ایضاً ایضاً ص ۴۹
- ۴۶۔ ایضاً ایضاً ص ۵۱
- ۴۷۔ ایضاً ایضاً ص ۵۲
- ۴۸۔ ایضاً ایضاً ص ۵۲
- ۴۹۔ ایضاً ایضاً ص ۵۴
- ۵۰۔ ایضاً ایضاً ص ۵۴
- ۵۱۔ عبداللہ لغاری۔ مولانا سندھی کی سرگزشت کابل۔ ص ۲۱۹
- ۵۲۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۵۵-۵۶
- ۵۳۔ مولانا عبداللہ لغاری۔ مولانا سندھی کی سرگزشت کابل۔ ص ۲۱۸
- ۵۴۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۸۳

باب ہفتم

ترکی میں اجنبی

مولانا سندھی جولائی ۱۹۲۲ء میں ماسکو سے ترکی کے لئے روانہ ہو گئے۔ کیونکہ اس وقت انگریزی فوجیں سابق خلیفہ عبدالحمید کی حفاظت کے بہانے استنبول میں موجود تھیں اس لئے وہ بحر اسود کی بندرگاہ ایمنہ بولی پر اتر کر انقرہ پہنچ گئے۔ ان کے اس سفر کا اہتمام اور راستہ کا تعین ترکی سفیر متعین ماسکو اور روسی وزیر خارجہ نے اس طرح کیا تھا کہ برطانوی خفیہ ایجنسیوں کو اسکی بھنگ بھی نہ ملی اور جب ترکی فوجوں نے ۲۳ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو استنبول پر قبضہ کر لیا تو وہ اس کے تین ماہ بعد وہاں پہنچ گئے۔^۱

استنبول میں وہ محلہ آق سرائے کی ہندوستانی خانقاہ میں پہلی منزل پر رہتے تھے۔ خانقاہ کی اوپری منزل میں خانقاہ کا متولی جو ایک سن رسیدہ افغان تھا اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ مقبرہ سلطان ٹیپو مرحوم کے ایک کمانڈر محمد امام سردار کا تھا جو سلطان ٹیپو کے اس خیر سگالی وفد کے ہمراہ استنبول آیا تھا جو سلطان شہید نے سید غلام علی کی سرکردگی میں سلطان عبدالحمید (جو ۱۷۷۷ء سے لے کر ۱۷۸۹ء تک سریر آرائے سلطنت رہے) کی خدمت میں بھیجا تھا۔ بعد میں اس خانقاہ کا متولی ایک ہندوستانی محمد ریاض ہو گیا تھا جو ازہر کا فاضل تھا اور بہار کا رہنے والا تھا اس کے تعلقات مولانا سے بہت خوشگوار تھے۔^۲

مولانا سندھی جس وقت ترکی پہنچے اس وقت ترکی ایک عبوری دور سے گذر رہا تھا۔ اور

مصطفیٰ کمال کی رہنمائی میں ترکی کی نشاۃ الثانیہ ہو رہی تھی خالص قومی اور ترقی پذیر نظام کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا مگر کمالی اصلاحات ابھی تک ترکی کی زمین میں جڑ نہیں پکڑ سکی تھیں اور ان میں اور ترکی کی اسلامی روایات میں آویزش جاری تھی۔ خلافت ختم ہو کر سوئزر لینڈ کا قانون نافذ ہو چکا تھا۔ اوقاف ختم کر دئے گئے تھے۔ عربی مدارس بند ہو چکے تھے اور ترکی زبان کا عربی رسم الخط رومن میں تبدیل ہو چکا تھا۔

ترکی کے حصے بخرے کرنے اور بلاد اسلامیہ اور جزیرۃ العرب پر اپنا سیاسی اثر و نفوذ قائم کرنے سے زیادہ خطرناک وہ دور رس انقلاب انگیز اور منحوس فیصلے اور تبدیلیاں تھیں جو برطانیہ نے ترکی کی نئی قائم ہونے والی سلطنت سے کرائیں اور جنہوں نے مقامات مقدسہ کے امین و محافظ ایک پر جوش جانثار حامی اسلام ترکی کو مقامات مقدسہ کے متولی اور خادم بننے کی بجائے ایک لادینی، آزاد اور مغربی طرز کی سیکولر سلطنت میں تبدیل کر دیا یہ فیصلہ مغربی طاقتوں بالخصوص برطانیہ کے اشارہ پر عمل میں آیا تھا۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے ترک تھے جنہوں نے عہد حاضر میں اپنی انفرادی، اجتماعی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کو نئے تقاضوں سے ہموا کرنے اور نئے قالبوں میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ ممکن ہے کہ اس میں ان سے کوتاہیاں بھی ہوئی ہوں اور ان میں سے بعض غلط راستوں پر بھی پڑ گئے ہوں مگر یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی میں جو سیاسی و معاشرتی انقلاب برائے کار آیا دوسری جنگ عظیم کے بعد کم و بیش انہی خطوط پر دوسرے مسلمان ملکوں میں وہی تبدیلیاں آئیں۔ ۳

اسلامی ممالک پر مغربی اقتدار کی وجہ سے عالم اسلام جس ذہنی شکست و ریخت سے گزرا اس کے نتیجہ میں مختلف قوتیں ظہور پذیر ہوئیں اٹھارہویں صدی میں عثمانی ترکوں کو روس کے مقابلہ میں ذلت آمیز شرائط قبول کرتے ہوئے اپنے بہت سے علاقوں سے دستبردار ہونا پڑا۔ نیپولین نے مصر فتح کر لیا۔ مغربی طاقتوں کے ہاتھوں مسلسل شکستوں کا ترکی پر یہ رد عمل ہوا کہ اس نے تعلیمی و فوجی اصلاحات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ تاکہ اپنے سیاسی و سماجی نظام کو بحال کر سکے۔ یہ ایام ترکی تاریخ کے نازک ترین اور غیر مستحکم دور میں شمار کئے جاتے ہیں۔

ترک اپنے زوال اور یورپ کے عروج کے اسباب پر غور و فکر کے لئے مجبور ہوئے۔ ایک گروہ یہ سوچنے لگا کہ یورپ کی برتری فوجی نظام کی وجہ سے ہے اس لئے انہیں فوجی نظام میں اصلاحات کرنا چاہئے اور یورپ کی طرح اپنی فوجوں کو منظم کرنا چاہئے۔ یہ عام طور پر حکمران طبقہ کی سوچ تھی۔ عثمانی سلطنت میں سلطان سلیم ثالث نے اسی تصور کے تحت فوجی اصلاحات کیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ان اصلاحات کی وجہ سے اپنے سے سابقہ حکمرانوں کے مقابلہ میں مغرب کی دراز دستیوں کا کامیابی سے مقابلہ کر سکا۔

عام ترک مسلمان بھی اس مسئلہ پر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ ہمارے زوال کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اسلام سے دور چلے گئے ہیں اس لئے بدبختی کے یہ دن دیکھ رہے ہیں ہماری نجات دراصل اسلام کی طرف واپسی میں ہے۔ علماء اور مصلحین نے ترقی اور زوال کے علمی، سماجی اور سیاسی اسباب کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا اور یورپ کی ترقی کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش نہ کی۔ یہ ویسے بھی ترکی میں علماء کوئی بڑی عوامی طاقت کبھی نہیں رہے۔

ترکوں میں عرصہ تک یہ بحث چلی کہ ترکوں کو مغربی تمدن کس طرح اپنانا چاہئے۔ تاکہ وہ ترکی کی دو تاریخی روایات یعنی ترکیت اور اسلام سے خود کو ہم آہنگ کر سکیں اور ترک بحیثیت قوم اور اسلام بحیثیت مذہب کو جدید تمدن کے ماحول میں کس طرح تطبیق کریں۔

یوسف اکورا کی پان توراتی تحریک کا اثر نو جوان ترکوں میں نفوذ کر گیا تھا۔ نامق کمال جیسے تخیل پرست اور اسلام پسند، توفیق پاشا جیسے مغرب پرست، انسان دوست اور صوفی کے زیر اثر انجمن اتحاد و ترقی سے وابستہ ذہین نو جوانوں کا ایک طبقہ نئی زندگی کا مشتاق اور عقلی و اخلاقی انتشار سے نجات حاصل کرنے کا خواہشمند تھا۔^۵

مدحت پاشا کی قومی تحریک نے خاص حالات میں ترکی قومیت کو جنم دیا۔ ان کی تحریک تھی کہ ترکی کے قومی پرچم میں ہلال کے ساتھ صلیب بھی ہو۔ کیونکہ ترکی میں ایک بڑی تعداد عیسائیوں کی بھی ہے۔ اس لئے ان کی نمائندگی ہونی چاہئے انجمن اتحاد و ترقی مدحت پاشا کی تحریک کا بڑا شاہکار تھی۔^۶

ترکی کے دانشور ترکی کی تعمیر نو چاہتے تھے۔ ایک طرح کی شدید حب الوطنی جو غیر مسلم اور غیر ترک جماعتوں کی قوم پرست تحریکوں کا رد عمل تھی۔ جو لوگ قدامت پسند تھے انقلاب کے بعد انھوں نے جرأت کے ساتھ شریعت اسلامی کی طرف رجوع کرنے پر زور دیا دوسرا طبقہ آزاد خیالوں کا تھا جو مغربی تہذیب و تمدن کو جوں کا توں اپنانے پر تلے تھے۔ ترکیت کے علمبردار ترکوں کے نسلی اتحاد کا نعرہ لگا رہے تھے اور ترکوں کی اسلامی دور کی تاریخ سے قبل کے زمانے کی طرف لوٹ جانے کی تبلیغ کر رہے تھے وہ پوری طرح رومانیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ۷

انجمن اتحاد و ترقی کی روش عربوں میں مقبول نہ ہو سکی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ترکی زبان عربوں پر لادنا چاہتے تھے اور اس کے رد عمل کے نتیجہ میں عرب ترکی حکومت سے ہی نہیں بلکہ ترک خلافت سے بھی بیزار ہو گئے تھے۔ ۸

جنگ کے ختم ہوتے ہی اس قسم کی آوازیں اٹھنے لگیں کہ عرب پیغمبر اسلام کا مولد ہے اور وہاں کی قوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم ہے۔ اس بنا پر نسل پرست عربوں میں یہ جذبہ پیدا ہونا ناگزیر تھا کہ رسول کی نیابت و خلافت بھی انہیں کی نسل و قوم کا حق ہے۔ ۹

نوجوان ترک جو خود خالص ترک قومیت کے عقیدہ کے حامل تھے عربوں میں بڑھتے ہوئے قومیت کے احساس کو ہڈت سے ناپسند کرتے تھے۔ ملک کی آبادی میں آرمینین، یونانی اور یہودیوں کی اکثریت تھی اور ان کے ترکوں سے ایسے معاہدات تھے جن کی وجہ سے ترک اپنے ہی ملک میں اختیار کلی نہ رکھتے تھے۔ ۱۰

برصغیر کے مسلمانوں نے خلافت اور سلطنت عثمانیہ کو ہمیشہ اس نظر سے دیکھا کہ ایک طرف وہ اسلام کی پاسبان، مسلمانوں کی عزت و عظمت کا نشان، حجاز مقدس، جزیرۃ العرب اور مقامات مقدسہ کا امین۔ ان کی حفاظت کا حصار اور مسلمانوں کی سیاسی طاقت، وحدت، خود اعتمادی، خود شناسی کی ضامن اور محافظ ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں کی گذشتہ سو سال کی سیاسی و معاشرتی، علمی اور دینی تاریخ ترکوں سے

بہت زیادہ متاثر رہی ہے اور انکی قومی دلی جدوجہد میں ترک دوستی کا جذبہ ایک مشعل ہدایت بھی تھا اور ایک مہمیز اور محرک کا کام بھی کر رہا تھا۔ اقبال نے ہندی مسلمانوں کے اسی جذبہ کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا:

یہ نکتہ سرگذشت ملت بیضا سے ہے پیدا

کہ اقوام زمین ایشیاء کا پاسباں ہے تو

اصل زندگی میں جذبات اور حقائق میں بہت فرق ہوتا ہے حقیقت یہ تھی کہ ترکی کی بیرونی عظمت تو اس کے فوجی انحطاط کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔ مغربی اقوام سے ترکوں کے معاہدات ان کو بے بس کر چکے تھے۔ ریلیں، جہاز راں کپنیاں، تار اور ڈاک خانہ جات کا انتظام غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھا۔ ان حالات میں اگر ترکی بچا ہوا تھا تو صرف انگریز، جرمن اور روس کے سیاسی اختلافات کی وجہ سے۔^{۱۱}

عالم اسلام میں ترکی کی تحریک آزادی کی حمایت میں ایک بین الاقوامی مہم شروع کرنے اور مسلمانوں میں یکجہتی کا جذبہ تیز کرنے کے لحاظ سے اسلامی عنصر نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ ترکی کے حصے بخرے کرنے والی بڑی طاقتوں کا کسی استثنیٰ کے بغیر عیسائی ہونا اور ان کے سامراجی عزائم کا ہدف بننے والوں کا مسلمان ہونا ایسی حقیقتیں تھیں جن کی وجہ سے ان طاقتوں کی غلامی کا طوق پہنے پر مجبور ہونے والی مسلمان اقوام میں اپنے آقاؤں کے خلاف شدید نفرت اور ان کے مقابلے میں ترکوں کے بارے میں ہمدردی و محبت کے جذبات پیدا ہوئے۔ سلطان عبدالحمید کے دور میں خلافت کے منصب کو بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کی ہمدردی و حمایت حاصل کرنے کے لئے بھی اسلامی لائحہ عمل ہی کا جامہ پہنایا گیا۔^{۱۲}

مصطفیٰ کمال نے جب ۱۹ مئی ۱۹۱۹ء کو سمون کی بندرگاہ سے اناطولیہ میں داخل ہو کر جنگ آزادی کا آغاز کیا تو اس میں مذہبی اور اسلامی رنگ نظر آتا تھا۔ اس قومی لشکر نے جنگ آزادی میں مرکزی کردار ادا کیا۔ دولت عثمانیہ میں معاشرت کا ڈھانچہ قومیت کے وسیع تر مفہوم کی بنیاد پر رکھا گیا تھا اور قومیت کی بنیاد نسل نہیں بلکہ مذہب تھا۔ اس سلسلہ میں مختلف نسلوں اور علاقوں کے علاوہ مختلف

مذہبوں کے لوگ موجود تھے۔ ان کی گردہ بندی ان کے مذہبی عقائد کی بنا پر کی جاتی تھی۔ کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور یہودی اعتقاد کے لوگوں کو الگ الگ قومیتوں کا درجہ دیا گیا تھا۔ حالانکہ قومیت کی جدید اصلاح کے مطابق یہ سب ایک ہی قوم کے عناصر تھے۔ یورپ میں قومیت کا نیا تصور فروغ پاتے ہی ان عناصر نے اپنی نسلی حیثیت اور تفریق کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دینی شروع کی۔ جہاں تک ملت اسلامیہ میں شامل ترکوں کا تعلق ہے ان میں قومی شعور تیزی سے نہیں پھیلا۔ اور اناطولیہ میں اس کی گونج نہیں پہونچی تھی۔ اس لحاظ سے مصطفیٰ کمال کا ترک قوم کے درمیان اتحاد و یکجہتی کو برقرار رکھنے کے لئے اسلام کا سہارا لینا بالکل قدرتی بات تھی۔ مصطفیٰ کمال نے حکمرانی بلا شرط عوام کی ہے کے نعرے کے ساتھ انقرہ میں جو قومی اسمبلی قائم کی اس کا ایک بھی رکن غیر مسلم نہیں تھا۔ اس اسمبلی کا افتتاح کرتے ہوئے اس نے جو تاریخی تقریر کی اس میں کہا کہ یہ اسمبلی دراصل مظلومین اسلام کی امنگوں اور جذبات کی ترجمان ہے۔ اسکو اچھی طرح اندازہ تھا کہ ترک اور اسلام لازم و ملزوم ہیں اور دونوں کا رشتہ اٹوٹ ہے لیکن ٹھیک انہی دنوں میں بادشاہ اور استنبول کے دوسرے اعلیٰ حکام نے قومی تحریک آزادی کو مذہبی لحاظ سے غیر قانونی قرار دیکر علماء سے مصطفیٰ کمال اور لشکر قومی آزادی کے زعماء کے قتل کا فتویٰ حاصل کر لیا۔^{۱۳}

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ”ترکوں پر دول یورپ کی یلغار خلافت کی وجہ سے ہے۔ خلافت کی وجہ سے ترکوں کی حکومت تمام عیسائی حکومتوں کی آنکھوں میں خور تھی وہ خلافت کو پین اسلام ازم کا کارگر حربہ سمجھتے تھے اور اس لئے ہر طرح اس کے درپہ آزار تھے، اور گزشتہ جنگ عظیم میں خلافت کی حمایت کے لئے عالم اسلام کے مسلمانوں کی حمایت کا تصور سراسر نقش بر آب ثابت ہوا اور اعلان جہاد پر بھی مسلمانوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ آخر ہمیں شکست ہوئی۔ ہم مسلمانوں کی حمایت کے بل پر ہی خلافت کی حمایت کے لئے زک پر زک اٹھائے جا رہے تھے۔ جب خلافت کا عقدہ کھلا تو پتہ چلا کہ یہ تو تاریک بخت سے بھی زیادہ کنزور ہے۔“^{۱۴}

ملک کے اس سیاسی پس منظر میں انقرہ میں مولانا سندھی کی ملاقات عصمت پاشا وزیراعظم

ترکی سے ہوئی۔ مگر یہ ملاقات چند ان کامیاب نہیں کہلائی جاسکتی۔ کیونکہ مولانا اور ان کے ساتھی عزیز احمد انگریزی نہیں بول سکتے تھے۔ اور انقرہ میں اس وقت کوئی اردو داں ترک نہیں تھا۔ مولانا نے عصمت پاشا سے صرف ایک عربی داں ترجمان کی وساطت سے گفتگو کی جس کی عربی زبان پر دسترس کچھ بہتر نہیں تھی اور خود مولانا اس زمانے میں عربی بولنے پر اس قدر قادر نہ تھے۔ اس لئے وہ اپنے ترکی آنے کے مقصد کو عصمت پاشا پر اچھی طرح واضح نہیں کر سکے اور نہ ہی اس ملاقات میں کوئی سیاسی مسائل زیر بحث آئے۔ مگر اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ترکی حکومت نے قبلہ مولانا کو ترکی میں قیام کی اجازت دے دی۔ مگر کوئی مالی امداد نہیں دی۔^{۱۵} ترکی میں رہتے ہوئے وہ ظفر حسن کے ترکی ہونچنے تک اسی روپیہ سے گزارہ کرتے رہے جو روس میں ان کے پاس تھا۔^{۱۶} کچھ عرصہ بعد عبدالرٹمن پشاور کی کھلکی وساطت سے اسعد فواد بک نے اپنی بیوی کی مصری جائداد کی آمدنی سے جو علمی خدمات اور عالموں کی خدمت کے لئے مختص تھی مولانا سندھی کو ۵۰ سیرے (سوروپہ) دینے شروع کر دئے ظفر حسن کا بیان ہے کہ اس وقت یہ مالی معاونت ان کے لئے درگاہ الہی سے آئی ہوئی ایک غیبی مدد ثابت ہوئی ورنہ شاید فاقہ کشی کی نوبت آ جاتی۔^{۱۸}

اسی زمانے میں مشہور آریہ سماجی لیڈر لالہ لاجپت رائے استنبول آئے۔ لالہ جی سے ملاقات کے دوران مولانا سندھی نے روسی وزیر خارجہ پچرن سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا اور بتایا کہ آئندہ ہندوستان کی آزادی کے لئے افغانستان کے ذریعہ انڈین نیشنل کانگریس کو روسی امداد پہنچائی جائے گی۔ لالہ جی اس تجویز سے چنداں خوش نہیں ہوئے بعد میں مولانا نے ظفر حسن سے اپنے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ لالہ لاجپت رائے کی وساطت سے یہ خبر ہندوستان کے فرقہ پرست ہندو لیڈروں تک پہنچی تھی کیونکہ ۱۹۲۳ء میں ہی ہندو مسلم تعلقات خراب ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مولانا کا خیال تھا کہ لالہ لاجپت رائے اور دوسرے ہندو رہنما ہندوستان کی تحریک آزادی میں کسی اسلامی ملک اور خاص کر افغانستان کا دخل اور تعاون برداشت نہیں کر سکتے تھے۔^{۱۹}

انہی ایام میں عبدالرٹمن صدیقی استنبول آئے۔ مولانا نے ان سے اپنی روس کی کاروائیوں اور پچرن سے اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ تحریک آزادی ہند کے سلسلہ میں

پنچرن سے معاہدہ ہو گیا ہے۔ مولانا سندھی نے عبدالرحمن صدیقی سے درخواست کی کہ ہندوستان پہنچ کر وہ یہ تمام باتیں ڈاکٹر مختار انصاری کے علم میں لے آئیں۔ مولانا نے مسٹر صدیقی کو بطور سفر خرچ ۱۰۰ پونڈ بھی دئے۔ جو انہوں نے عزیز احمد کی معرفت روسی قونصل خانہ سے حاصل کئے تھے۔ ظفر حسن کا کہنا ہے کہ مولانا نے ذاتی ضروریات کے لئے کبھی روسیوں سے مالی مدد نہیں لی مگر سیاسی کاموں کے لئے دو ایک بار ایسا موقعہ ضرور آیا لیکن ظفر حسن نے اس پر افسوس ظاہر کیا کہ عبدالرحمن صدیقی نے ڈاکٹر انصاری کو مولانا کا پیغام نہیں پہنچایا۔^{۲۰}

اگست ۱۹۲۳ء میں ڈاکٹر انصاری خلافت کمیٹی کے نمائندے کی حیثیت سے استنبول آئے وہ جمیعتہ ہلال احمر کے مہمان ہو کر آئے تھے۔ ان کی ترکی آمد کا مقصد ترکی کے ارباب حکومت سے ملکر خلافت اسلامیہ کو کسی بھی دوسری شکل میں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کا جائزہ لینا تھا وہ ترکی وزیر اعظم عصمت انونو سے انقرہ جا کر ملے۔ مگر انکو اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔^{۲۱} ترکی کے لئے ہندوستانی مسلمانوں نے جو تحریک خلافت شروع کر رکھی تھی وہاں اس کے چرچے بالکل نہ تھے۔ ترک اپنے نظام حکومت کو بدل چکے تھے اور اپنے داخلی اور دول یورپ کے دباؤ کے تحت خلافت کا ادارہ ختم کر چکے تھے مگر برخلاف اس کے ہندوستان میں خلافت تحریک والے اس نظام کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔^{۲۲}

مولانا سندھی نے ڈاکٹر انصاری سے اپنی سیاسی کاروائیوں اور روس کے ساتھ اپنے سمجھوتہ کی خبر جو انہوں نے عبدالرحمن صدیقی کی معرفت بھجوائی تھی کی بابت دریافت کیا۔ ڈاکٹر انصاری کا جواب انکار میں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اس تمام عرصہ میں عبدالرحمن صدیقی سے کبھی ملے ہی نہیں۔ مولانا کو اس خبر سے تعجب اور مایوسی ہوئی کہ عبدالرحمن صدیقی جیسا شخص اپنے وعدہ کو پورا کرنے سے قاصر رہا اور جو روپیہ ان کو اس کام کے لئے دیا گیا تھا وہ بھی انہوں نے ہضم کر لیا۔^{۲۳}

مولانا سندھی ترکی سے خلافت اسلامیہ کے مٹ جانے کے بعد اس کوشش میں لگ گئے کہ ترکی میں ایک بین المسلمین یونیورسٹی کی بنیاد ڈالنے کے لئے ترکی حکومت ان کو اجازت دے دے تاکہ وہ اس طرح پر اسلامی شیرازے کو ایک بار پھر قائم کر دیں۔ اس لئے انہوں نے جمہوریت پرور

پارٹی کے لیڈر رؤف بک سے ملنا چاہا اور عبدالرحمن پشاوری سے اس ملاقات کا انتظام کرنے کو کہا تاکہ رؤف بک استنبول میں ایک انٹرنیشنل مسلم یونیورسٹی کے قیام کو بھی اپنی پارٹی کے پروگرام میں شامل کر لیں۔ مگر لندن کے معاندہ صلح پر دستخط ہو جانے کے بعد ۱۹۲۴ء میں ترکی کی داخلی سیاست کا ایک نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ رؤف بک کی بجائے عصمت پاشا وزیراعظم بنے تھے اور رؤف بک نے جنرل کاظم قرہ پاشا کے ساتھ مل کر جمہوریت پر ور پارٹی بنائی تھی جو پرانی ترکی روایات کو قائم رکھنے کی طرفدار تھی۔ لیکن ان تمام اصلاحات کے خلاف تھی جو جمہوریت خلق پارٹی ملک میں ہر روز جاری کر رہی تھی۔ رؤف بک کا کہنا تھا کہ اگر انہوں نے ایسی تجویز اپنے پارٹی پروگرام میں شامل کی تو جمہوریت خلق پارٹی جو ان پر پہلے ہی قدامت پسندی، اتحاد اسلام اور پرانی روایتوں کے احیاء کرنے کی تہمت لگا رہی ہے اپنے لگائے الزامات میں اور شدت پیدا کر لے گی اور اس طرح ان کی پارٹی ترکی کے تعلیم یافتہ طبقہ کی نگاہ سے گر جائے گی۔^{۲۴}

ظفر حسن کا کہنا تھا کہ مولانا کو رؤف بک کی باتوں سے بہت صدمہ پہونچا اور اتنی مایوسی ہوئی کہ ظفر حسن نے جو مولانا کے ساتھ بحیثیت ترجمان گئے تھے مولانا سندھی کو عمر بھرتا مایوس نہیں دیکھا۔ مسلمانوں کو پھر ایک سلسلہ میں منسلک کرنے کی ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔^{۲۵}

ترکی کے دوران قیام ایک واقعہ آزادی وطن کے بارے میں مولانا سندھی کا وہ یادگار منصوبہ ہے جو ”کانگریس کمیٹی کابل کا سوراجی نظام اور مہا بھارت سروراجیہ پارٹی کا پروگرام“ کے عنوان سے ستمبر ۱۹۲۴ء میں استنبول سے شائع ہوا۔

مولانا سندھی جب ہندوستان سے نکلے تھے تو ملک کی آزادی کے پروگرام کے ساتھ ساتھ اتحاد عالم اسلامی اور احیاء اسلام کا نظریہ بھی ان کے سامنے تھا۔ لیکن کابل ماسکو اور ترکی پہونچ کر انہیں تجربہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی طرح کوئی بھی مسلمان ملک اپنے حالات و مفادات کو نظر انداز کر کے احیاء اسلام اور اتحاد عالم اسلامی کی تحریک سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ افغانستان اور ترکی وغیرہ کے سامنے اول و آخر ان کے ملکی اور قومی مفاد ہیں۔

ترکی کے دوران قیام انہوں نے انگریزی حکومت کو ختم کرنے کا ایک پروگرام بنایا۔ اور آزاد

حکومت کے قیام کے نتیجہ میں مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت والے صوبوں میں علیحدہ علیحدہ حکومت بنانے کی تجویز کی لیکن اس طرح کہ ملک کی وحدت قائم رہے۔ وہ کسی وحدانی یا مرکزی حکومت کی بجائے برصغیر کو مختلف آزاد ممالک میں تقسیم کرنا اور صرف سیاسی اتحاد کے ذریعہ اسے متحد رکھنا چاہتے تھے۔

مولانا نے ظفر حسن کے ساتھ باہم مشورہ کے بعد اپنا پروگرام پہلے اردو میں پھر انگریزی میں شائع کرایا اور مولانا سندھی بحیثیت صدر سورا جیہ کمیٹی اور سیکریٹری ظفر حسن کی جانب سے یہ پروگرام محمود بک کے مطبع استنبول میں ۱۹۲۴ء میں طبع ہوا۔ ۲۶

اس کے ابتدائی اٹھائیس صفحات میں اولاً ظفر حسن ایک کے قلم سے مختصر پیش لفظ ہے اور مولانا سندھی کے قلم سے تعارف ہے۔ اس پروگرام کا انگریزی ترجمہ ترکی کی وزارت خارجہ کو بھی بھیجا گیا تاکہ ترکی حکومت کو ان کے سیاسی اصول کا پتہ چل جائے اور انہیں یہ اطمینان ہو جائے کہ وہ ترکی کے داخلی معاملات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے بلکہ اپنے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ مولانا کے مطابق ترکی وزارت خارجہ نے دو مترجموں کی مدد سے اسکا ترجمہ کرا کر جب تک اسکو تمام وکمال نہ پڑھ لیا طباعت کی اجازت نہ دی۔ ۲۷

اس پروگرام کو خفیہ طور پر بذریعہ ڈاک ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا مگر یہ کاپیاں سنسر کے ہاتھ پڑ گئیں اور اس کے تراجم کا داخلہ بھی ہندوستان میں ممنوع ہو گیا۔ ۲۸ مگر بعد میں ۱۹۲۶ء میں کچھ تراجم کے ساتھ اس پروگرام کا انگریزی ترجمہ انھوں نے وقتاً فوقتاً ترکی آنے والے اپنے دوستوں کے ذریعہ ہندوستان بھیجنا شروع کیا۔ ۲۹

مولانا سندھی کا منصوبہ

ہندوستان کی آزادی اور آزاد ہندوستان کی حکومت کے لئے جو پروگرام مرتب کیا گیا تھا اس کے اہم نکات یہ تھے:-

۱۔ ہندوستان کیلئے کامل آزادی حاصل کرنا اور آزاد ہندوستان میں ایک وفاقی

(Federal) نظام قائم کرنا۔

۲۔ ہندوستان میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں اور اسلام کو محفوظ کرنا۔

۳۔ ہندوستان میں محنت کش طبقہ کی (یعنی کسان، مزدور اور دماغی کام کرنے والوں کی) اکثریت رکھنے والی حکومت قائم کرنا۔ زمینداری اور سرمایہ داری کو ملک سے ختم کر دینا تاکہ عوام کیونزم کے سبز باغ دیکھ کر دھوکہ نہ کھائیں۔

۴۔ سیکولرازم کا توڑ کرنے کے لئے ایشیاء تک فیڈریشن بنانا۔

ان مقاصد کو بروئے کار لانے والی پارٹی کا نام سروراجیہ پارٹی تجویز ہوا تھا۔ یعنی یہ پارٹی رنگ، نسل، مذہب اور مال دولت کے بغیر حکومت قائم کرے گی۔ سروراجیہ پارٹی کے ممبروں کے لئے لازم ہوگا کہ وہ اپنی طرز زندگی ملک کے کسانوں کے معیار زندگی سے بلند نہ کریں۔ اور اس سے زائد جہ آمدنی یا جائداد ہوگی اس کو پارٹی کے حوالہ کر دیں گے۔ مرکزی حکومت ہند کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اور نہ وہ ان مذاہب کے معاملات میں دخل اندازی کرے گی۔

مرکزی حکومت خارجی، جنگی اور غیر ملکی تجارت اپنے ہاتھ میں رکھے گی مختلف جمہوریتیں مرکزی حکومت میں اپنی آبادی کے تناسب، اقتصادی، تمدنی اور فوجی اہمیت کی بنا پر حق نمائندگی حاصل کریں گی۔

امپیریل ازم پر ضرب لگانے کے لئے ایشیاء میں درج بالا اصواوں کو بنیاد بنا کر ایشیائی ملکوں کی ایشیاء تک فیڈریشن بنائی جائے گی۔ اور اس میں روس کو بھی شامل کیا جائے گا۔

روس کو ایشیاء تک فیڈریشن میں شامل کرنے میں شاید ان کے مد نظر یہ مقصد تھا کہ اس سے انگریزی سامراجیت کے خلاف مدد لی جائے اور اس کو آزادی کے بعد محنت کشوں کی حمایت کے بہانے ہندوستان کے معاملات میں دخل کا موقع نہ ملے۔

پارٹی ہندوستان کو ایک ملک فرض نہ کرے گی اور نہ ہندوستان میں واحد قومیت پیدا کرنے کی کوشش کرے گی۔ بلکہ ملک میں نظام توافق (فیڈرل سسٹم) پر حکومت قائم کرے گی۔ جس کے لئے۔ درج ذیل طریقے اختیار کئے جائیں گے۔

ملک کو مختلف صوبوں میں اس طرح تقسیم کی کیا جائے گا کہ جہاں ایک ہی زبان بولی جاتی ہو اور جہاں ایک ہی رسم و رواج اور کلچر رکھنے والے لوگ بستے ہوں۔ ان صوبوں کو ملا کر ایک جمہوری ملک تشکیل دیا جائے گا جس میں مرکز کو خارجی، دفاعی، غیر ملکی تجارت پر اختیار حاصل ہوگا۔ باقی معاملات میں صوبے خود مختار ہوں گے۔

ان جمہوریتوں میں ہر عاقل بالغ مرد اور عورت کو حق رائے دہندگی دیا جائے گا۔ مگر جداگانہ طرز انتخاب کی بنیاد پر کسان، مزدور، محنت کش اور تعلیم یافتہ افراد آبادی میں اپنے تناسب کے لحاظ سے اپنے ہی طبقہ سے نمائندوں کا انتخاب کریں گے۔ اس طرح جمہوریتوں کی پارلیمنٹ میں محنت کشوں اور کسانوں کی اکثریت ہوگی اور یہ مجلس محنت کش طبقات کے مفاد کی حفاظت کرے گی۔

مفاد عامہ کے تمام ذرائع قومی ملک میں لئے جائیں گے۔ ذاتی ملکیت محدود کر دی جائے گی۔ نظام زمینداری منسوخ کر دیا جائے گا اور تمام زمینیں قومی ملکیت متصور ہوں گی۔ ان جمہوریتوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی پارٹی فاروق اعظم کے فیصلہ کے مطابق زمین کی ملکیت چھوڑنے پر اور امام ابو حنیفہ کے مطابق مزارعتہ چھوڑنے پر مجبور کرے گی۔ ہر کاشتکار خاندان کو اس قدر زمین ضرور دی جائے گی جس قدر کہ وہ خود کاشت کر سکے۔

سودی لین دین بالکل ختم کر دیا جائے گا۔ اور محنت کش طبقہ کے قرض معاف کر دئے جائیں گے۔ قومی ملکیت میں لئے ہوئے کارخانوں کو انجمنوں کے ذریعہ چلایا جائے گا۔ اور مزدوروں کو منافع سے حصہ دیا جائے گا۔ مزدوروں کے لئے ابتدائی اور ثانوی کلاسوں میں تعلیم لازمی اور مفت ہوگی۔ ۳۰

۱۹۲۶ء کے موسم بہار میں مولانا سندھی کو ہندوستان سے آنے والے اخبارات سے معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ میں اس سال ایام حج میں موتمر اسلامی ہونے والی ہے جس میں دنیائے اسلام کے رہنماؤں کے علاوہ ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی لیڈروں کی شرکت متوقع ہے۔ مولانا کو خیال ہوا کہ اگر وہ اس موقع پر حجاز پہنچ جائیں تو حج کے لئے ہندوستان سے آنے والے لوگوں سے ملکر ان کے ذریعہ اپنا پیغام ہندوستان بھیج سکیں گے۔ ۳۱

مگر جو حالات تھے ان میں انکا جاز جانا ناممکن لگتا تھا۔ اس زمانے میں ترکی سے کوئی جہاز استنبول سے براہ راست جاز نہیں جاتا تھا۔ استنبول سے جاز جانے والوں کو مصر میں اسکندریہ یا پورٹ سعید سے جہاز لینا پڑتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریز مصر پر پوری طرح قابض ہو چکے تھے۔ اس لئے مولانا کا مصر کی سرزمین پر قدم رکھنا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ وہ وہاں گرفتار ہو سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس باب میں اٹلی کی حکومت سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لئے انہوں نے اقبال شیدائی سے جو اس وقت اٹلی میں مقیم تھے اور حکومت کے اعلیٰ اراکین سے رسم و راہ رکھتے تھے رابطہ قائم کیا۔^{۳۲}

سفر خرچ کے لئے انہوں نے تیسری اور آخری مرتبہ عزیز احمد کے ذریعہ روسی قونصل خانہ سے روپیہ لیا اور ۵ جون ۱۹۲۶ء کو عزیز احمد کو ساتھ لیکر استنبول سے اٹلی کو روانہ ہو گئے۔ وہاں اپنے دوستوں کو بتایا کہ میں مکہ جانے والا ہوں۔ انہوں نے مزید سفر خرچ کا انتظام کیا اور ایک جہاز جو حبشہ جا رہا تھا اس میں سوار کرا دیا اور کپتان کو بتا دیا کہ یہ ایک انقلابی ہے انکو جہاز سے اترنے نہ دینا مبادا کہیں گرفتار نہ ہو جائے۔^{۳۳}

اٹلی میں اقبال شیدائی کے ذریعہ ان کی جواہر لال نہرو سے ملاقات ہوئی جو اس وقت یورپ سے ہندوستان لوٹتے ہوئے فاشزم کا مطالعہ کرنے کے لئے کچھ دنوں کے لئے اٹلی میں رک گئے تھے۔ دوران ملاقات مولانا نے پنڈت نہرو کو ہندوستان کی آزادی اور آئندہ کی آزاد ہندوستانی حکومت کے بارے میں اپنے خیالات بتائے۔^{۳۴}

جواہر لال نہرو نے اپنی خودنوشت میں مولانا سندھی سے اپنی ملاقات کا مختصر ذکر کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں ”مولانا عبید اللہ مجھے زیرک اور جہاندیدہ انسان لگے مگر نئے سیاسی رجحانات سے وہ کچھ زیادہ واقف نہ تھے۔ ان کی سوچ کا انداز قدیم طرز فکر پر مبنی تھا۔ اس ملاقات کے دوران انہوں نے مجھے اپنی اسکیم بھی بتائی یہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے کی ایک اچھی کوشش تھی۔ انہوں نے مجھ سے لالہ لاجپت رائے سے ہونے والی گفتگو بھی بتائی۔ لالہ جی اس اسکیم سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ ہندوستان واپس جا کر انہوں نے اکثر و بیشتر اس کا ذکر کیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ بعد کے سالوں میں ہندوستان میں کونسل کے انتخابات پر اس اسکیم کا خاصہ اثر پڑا تھا۔^{۳۵}

اٹلی میں انہیں معلوم ہوا کہ کوئی اطالوی جہاز براہ راست وہاں سے جدہ نہیں جاتا۔ اس لئے وہ مجبوراً افریقہ میں اٹلی کی کالونی ایرائییریا کی بندرگاہ مسودہ (Massawa) گئے اور وہاں سے پندرہ دن کے انتظار کے بعد جہاز سے جدہ پہنچے۔^{۳۶}

مآخذ و حواشی

- ۱۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۵۸-۵۶
- ۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۸۲
- ۳۔ شریف فاروقی۔ اتاترک کے دلیس میں۔ ادارہ ادبیات نو
- ۴۔ ثروت صولت۔ انیسویں صدی کا مصری مفکر طہطاوی۔ المعارف لاہور مارچ ۱۹۸۳ء۔ ص ۲۹
- ۵۔ نیازی برکیس۔ جامعہ جنوری ۱۹۲۹ء۔ ص ۱۹
- ۶۔ ابوالحسن علی ندوی۔ دو ہفتہ ترکی میں۔ ص ۶۷
- ۷۔ نیازی برکیس۔ جامعہ جنوری ۱۹۶۹ء۔ ص ۶۹
- ۸۔ ابوالحسن علی ندوی۔ دو ہفتہ ترکی میں۔ ص ۶۷
- ۹۔ خلافت اور عرب۔ معارف دسمبر ۱۹۷۱ء۔ ص ۴۶۶
- ۱۰۔ چودھری خلیق الزماں۔ شاہراہ پاکستان۔ ص ۲۷۰-۲۷۲

- ۱۱۔ ابوالحسن علی ندوی۔ دو ہفتہ ترکی میں۔ ص ۶۹
- ۱۲۔ میم کمال اد کے۔ تحریک خلافت۔ ص ۹۱
- ۱۳۔ ایضاً ایضاً ص ۹۰
- ۱۴۔ ڈاکٹر زبید احمد۔ ترکی کے چشم دید واقعات۔ معارف مئی ۱۹۳۱ء۔ ص ۳۶۹
- ۱۵۔ ظفر حسن۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۷۰
- ۱۶۔ ایضاً ایضاً ص ۸۶
- ۱۷۔ عبدالرحمن پشاوری۔ ۶ دسمبر ۱۸۸۶ء کو پشاور کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے گھر پر ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۰۶ء میں محمدن اینگلو اورینٹل کالج علیگزہ میں داخل ہوئے۔ ابتداء ہی سے انگریز دشمن تھے۔ کالج کی اسٹرائک کے سلسلہ میں ان کا کالج سے اخراج بھی عمل میں آیا تھا۔ جنگ بلقان کے زمانہ میں جب ترکی کے زخمیوں کے علاج کیلئے ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں ایک طبی وفد ترکی گیا تو اس کے ممبران میں وہ بھی شامل تھے۔ بعد میں وہ ترکی شہری ہو گئے تھے۔
- مئی ۱۹۲۶ء کی ایک شام ایک نجی مجلس میں مذہب اور سیاست پر ان کی گفتگو سخت رخ اختیار کر گئی۔ ترکی کی تاریخ میں یہ بہت خلفشار کا زمانہ تھا۔ ان کی گفتگو کا یہ رد عمل ہوا کہ کسی نے ان پر فائر کر دیا۔ ان کی کسی سے دشمنی نہ تھی نہ وہ ترکی کی سیاست میں حصہ لیتے تھے۔ وہ صرف اسلام اور ترکی کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ دو تین ہفتہ زندگی اور موت کی کشمکش جھیل کر وہ موت کی آغوش میں سو گئے۔
- ۱۸۔ ظفر حسن۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۱۲۱
- ۱۹۔ ایضاً ایضاً ص ۸۸
- ۲۰۔ ظفر حسن۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۸۹
- ۲۱۔ ایضاً ایضاً ص ۹۰

- ۲۲۔ ایضاً ایضاً ص ۹۱
- ۲۳۔ ظفر حسن۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۹۴
- ۲۴۔ ایضاً ایضاً ص ۹۴
- ۲۵۔ ایضاً ایضاً ص ۱۰۱
- ۲۶۔ رسالہ تاریخ و سیاست۔ ص ۴۲
- ۲۷۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۲۹
- ۲۸۔ زمیندار ۱۸ مئی ۱۹۲۵ء
- ۲۹۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۱۲۹
- ۳۰۔ رسالہ تاریخ و سیاست۔ ص ۲۲-۴۲
- ۳۱۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۳۰
- ۳۲۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۱۲۹
- ۳۳۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۱۳۰
- ۳۴۔ ایضاً ایضاً ص ۱۳۰
- ۳۵۔ جواہر لال نہرو۔ میری خودنوشت (انگریزی)۔ ص ۱۵۱
- ۳۶۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۱۳۰

باب ہشتم

زائر حرم

مولانا سندھی ۱۹۲۷ء میں اس وقت حجاز پہونچے جب موتمر کا اجلاس ختم ہو چکا تھا۔ مندوبین اور ہندوستانی حجاج کرام وطن واپس جا چکے تھے۔ اس لئے ان کی وساطت سے ہندوستان میں رابطہ ہونے کا کوئی سوال نہ اٹھتا تھا۔ لہٰذا وہ پہونچتے ہی وہ مدرسہ صولتیہ^۱ گئے جہاں کے مہتمم نے بہت گرم جوشی سے ان کا خیر مقدم کیا اور مدرسہ میں ان کے قیام کا اہتمام کیا۔ مگر مولانا سندھی محض اس امکان کے پیش نظر کہ ان کے قیام سے کہیں مدرسہ کو نقصان نہ پہونچ جائے جلد ہی بھوپال رباط میں منتقل ہو گئے۔ مگر رباط میں صفائی ستھرائی کا زیادہ اہتمام نہ تھا کیونکہ ان سے ملنے کے لئے اکثر اہم اور مقتدر حضرات اور علماء تشریف لاتے تھے اس لئے وہ محلہ مغائر میں منتقل ہو گئے۔^۲

حجاز میں انہوں نے اپنا تعارف سابق پریسڈنٹ کانگریس کمیٹی کا بل کے طور پر کرایا جس کی وجہ سے انہیں حجاز کے اس وقت کے حالات میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ لہٰذا مکہ مکرمہ آتے ہی انہوں نے سعودی حکومت کو یقین دلایا کہ ”میں یہاں اللہ کے گھر میں اللہ کی پناہ میں رہنا چاہتا ہوں میں کوئی سیاسی کام نہیں کروں گا صرف اپنے ہندوستانی حجاج کو یہ سمجھاؤں گا کہ میں نے کام کرنے کے دوران کہاں کہاں غلطی کی ہے تاکہ مستقبل میں میری قوم اس غلطی کا اعادہ نہ کرے اس کے علاوہ میرا کوئی مقصد نہیں ہے۔“^۳

مولانا سندھی کا بیان ہے کہ اس سے انہیں ایک گونہ سکون مل گیا۔ اس زمانے میں حکومت حجاز کے تعلق سے ہندوستانی مسلمان دو طبقات میں بٹے ہوئے تھے اور یہ بات سبکو معلوم تھی کہ ان کا تعلق کسی گروہ سے نہ تھا۔ اس لئے سعودی گورنمنٹ نے ان کے کسی کام سے تعارض نہیں کیا۔^۶ یہاں انہوں نے اپنی جلاوطنی کے گیارہ سال گزارے۔ ان کے پاس شام غربت کی سیاہی کے علاوہ کچھ نہ تھا مگر مکہ کے قیام کے دوران ان کا دماغ روشن رہا۔

گیارہ سال کے اس طویل ترین عرصہ میں انہوں نے خود کو صرف درس و تدریس تک محدود رکھا۔ محمد صدیق بھادلوپوری کے نام ایک خط میں انہوں نے ایک استفسار کے جواب میں تحریر کیا تھا۔ ”کہ اگر کوئی عالم دین اپنی علمی و ارشادی قوت سے عالم اسلام کو بیدار کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے حجاز سے بہتر کوئی مرکز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ہر زمانہ میں علماء دین ہجرت کر کے حجاز میں تبلیغ کرتے رہے۔ ہمارے اکابر ولی اللہی میں مولانا محمد اسحاق، مولانا محمد یعقوب اور حاجی امداد اللہ اسی ذیل میں شمار ہوتے ہیں۔“

بعض احادیث میں مذکور ہے کہ دین حجاز کی طرف اس طرح لوٹ آئے گا جیسے سانپ اپنے بل میں آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علمائے دین ہجرت کر کے دارالعلم کو مضبوط بناتے رہیں گے۔ غرض جہاد کیلئے ہجرت کی جائے تو حجاز اس کے لئے موزوں نہیں (یہ ہماری رائے ہے) البتہ کوئی خاص عالم دین اشاعت اسلام کیلئے ہجرت حکومت وقت سے مصالحت کر کے کرے تو مناسب ہے۔ عوام کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔ تو یہ فرض کفایہ یا مستحب شمار ہوگا۔“^۷

مدرسہ صولتیہ کے مہتمم نے انہیں طلباء کو پڑھانے کی ذمہ داری تفویض کرنی چاہی مگر پولیس کے افراد کی مسلسل نگرانی کی وجہ سے مولانا سندھی نے انکار کر دیا۔ مگر طلباء کی ایک محدود تعداد کو اپنی رہائش گاہ پر درس دیتے رہے۔ ان کی ڈاک البتہ مدرسہ صولتیہ کے پتہ پر ہی آتی تھی۔^۸

ان کے دوران قیام مکہ میں مقیم چار خاندانوں نے ان کی بہت علمی مدد کی۔ جن میں تین خاندانوں کا تعلق برصغیر سے تھا اور ایک عرب خاندان تھا۔ شیخ عبدالوہاب دہلوی اور ان کے صاحبزادہ شیخ عبدالسار کا تعلق دہلی کے ایک اعلیٰ خاندان سے تھا۔ تیسرا خاندان ابوالشرف مجہدی کا

تھان کے کتب خانوں سے انہوں استفادہ کیا۔ چوتھا عرب خاندان امام حرم شیخ الوصح عبدالطاہر کا تھا جن کے کتب خانہ سے انہوں نے فائدہ اٹھایا اس کے علاوہ مکہ کے شیخ الحدیث شیخ محمد بن عبدالرزاق بن حمزہ اور شیخ عبدالصمد کے کتب خانوں سے بھی انہوں نے استفادہ کیا۔^۹

اس زمانہ میں سردار محمد نادر خان امیر کابل نے اپنے سفیر کی معرفت انہیں ایک ہزار روپے بھجوائے جس سے انہوں نے موطا امام مالک اور اس کی شرح مستوی جو شاہ ولی اللہ کی تصنیف ہے طبع کرائی۔^{۱۰}

مولانا عبدالصمد صادم کا بیان ہے کہ مولانا ہمیشہ مطالعہ میں مصروف رہتے اور ان کا گھر کتابوں سے بھرا رہتا۔ ان کے ایک طرف تو مصر کی مطبوعہ عربی کتب ہوتیں تو دوسری طرف اردو کتب و رسائل جن میں شاہ ولی اللہ اور ان کے مکتبہ فکر کی کتابوں کی کثرت تھی۔^{۱۱}

مولانا بعد نماز عصر بیت اللہ کے ایک پرانے برآمدہ میں ہندوستان کے اعتبار سے قبلہ رخ بیٹھا کرتے تھے۔ سر پر پگڑی نہیں ہوتی تھی ننگے سر ہوتے۔ صرف بیت اللہ کو دیکھا کرتے اپنے پاس آنے والوں سے کہتے کہ میرے پاس نہ آیا کرو۔ تم مجھے دیکھتے ہو یا بیت اللہ کو۔ بیت اللہ کی طرف دیکھو۔ اس کو دیکھنے سے چھ ہزار نیکیاں ملتی ہیں۔^{۱۲}

عزیز الرحمن لدھیانوی کا بیان ہے کہ مولانا سندھی مسلسل ہندوستان اور سعودی عرب کی خفیہ پولیس کی نگرانی میں رہتے تھے۔ اسی لئے یہ اہتمام کرتے اور کسی کو اپنے پاس اسی لئے نہ آنے دیتے کہ مبادا وہ کسی پریشانی میں نہ پڑ جائے۔^{۱۳}

مولانا ہندوستان کے حالات سے کافی باخبر رہتے تھے۔ ہندوستان کے اخبارات انہیں پہونچتے رہتے تھے۔ اردو کی تازہ مطبوعات انہیں وہاں مل جاتی تھیں۔ ماہنامے خاص طور پر جامعہ، معارف اور ترجمان القرآن۔ ان کے زیر مطالعہ رہتے۔ اس کے علاوہ ہر سال ہندوستان سے جو قابل ذکر لوگ حج کے لئے جاتے وہ سب مولانا سندھی سے ملتے تھے اور ان کو ان ذرائع سے ہر طرح کی خبریں مل جاتی تھیں۔^{۱۴}

ہندوستان سے آنے والے زائرین جب ان سے ملتے تو وہ یہی کہتے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ کانگریس کو کسی حال میں نہ چھوڑیں۔ کانگریس کی طاقت کا اندازہ ہندوستان میں رہ کر اتنا نہیں ہوتا جتنا باہر رہ کر ہوتا ہے۔ مسلمانوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ کسی مشترک پلیٹ فارم پر بھی رہیں۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ مسلمانوں میں خدمتی ادارے کثرت سے قائم کئے جائیں۔ خدمت کرنے سے ایثار و خدمت کا جذبہ پیدا ہوگا اور یہ احساس ہوگا کہ جب ملک اپنے ہاتھوں میں ہوگا تو خدمت کے کتنے مواقع ہونگے۔^{۱۵}

مکہ میں سلطان عبدالعزیز آل سعود کی نوازشیں اطراف عالم سے آئے ہوئے علماء پر ہوتیں لیکن عبید اللہ اور شیخ شریف السنوسی ہی ایسی دو ہستیاں تھیں جنہوں نے ہر پیشکش کو ٹھکرا دیا اور عسرت میں رہ کر خودداری کی زندگی بسر کرتے رہے۔^{۱۶}

مکہ کے قیام کے دوران بھی حجۃ اللہ البالغہ ان کے مطالعہ اور فکر کا خاص محور تھی ان کا کہنا تھا۔ ”میں پچاس سال سے قرآن اور حجۃ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ شروع میں حجۃ کا کچھ حصہ سمجھا اور کچھ حصہ نہیں سمجھا تھا۔ لیکن جو چیزیں سمجھ گیا تھا وہ میرے لئے محقق تھیں اور جو چیزیں نہیں سمجھ سکا اسے میں نے چھوڑ دیا۔ جوں جوں میری استعداد ترقی کرتی گئی اور میرا مطالعہ بڑھتا گیا حجۃ کے جو مشکل مباحث تھے وہ صاف ہوتے گئے اور جب میں مکہ معظمہ پہونچا ہوں تو حجۃ اللہ البالغہ کے اصولوں پر سارے قرآن کو حل کر لیا تھا۔ میں نے امام ولی اللہ کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا۔ مکہ کے دوران قیام انہوں نے شاہ ولی اللہ کا فلسفہ یا قرآن پڑھانے کے سوا کوئی دوسرا تعلق نہیں رکھا۔^{۱۷}

مکہ کے ۱۴ سالہ قیام کے دوران۔ انہوں نے شاہ صاحب کی کتابوں بدوز البازغہ، تہیماۃ الہیہ، سطعات، لمعات، الطاف القدس وغیرہ کا بطور خاص مطالعہ کیا اور ان کتابوں کے لئے بطور مفتاح انہوں نے مولانا رفیع الدین دہلوی کی تکمیل الاذہان اور مولانا اسمعیل شہید کی عبقات اور مولانا محمد قاسم کی قاسم العلوم، تقریر و لہزیر اور آب حیات کو استعمال کیا۔^{۱۸}

ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ کا جٹکو مولانا سے شرف تلمذ حاصل ہے کہنا ہے کہ مولانا سندھی جب

مکہ پہونچے تو ان کے علم اور مشاہدہ میں بہت وسعت پیدا ہو چکی تھی۔ ان کی فکر بہت واضع اور مکثہ نظر بہت وسیع ہو گیا تھا۔^{۲۰}

ان کے دوست اور رفیق جو یورپ میں تھے ان کی ملاقات کیلئے آتے رہتے مگر وہ ان کی ملاقاتوں سے الگ تھلگ رہتے تھے کہ کسی کو شک نہ ہو جائے۔^{۲۱}

پان اسلامک گورنمنٹ کے پرجوش حامی اور وکیل امیر شکیب ارسلان اور شیخ عبدالقادر رشتی کی بھی ان سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں کے سلسلہ میں انہوں نے اقبال شیدائی کو تحریر کیا کہ عربی، ترکی مسئلہ پرجو عالم اسلام کی مرکزیت سے تعلق رکھتا ہے میں نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے ان دونوں قوموں کے لیڈروں سے نفرت ہے۔ انہوں نے اپنی جماعتوں سے اسلام کو غارت کر دیا۔^{۲۲}

مکہ کی مرکزی حیثیت کی وجہ سے وہاں عالم اسلام کے علماء کی مسلسل آمد رہتی تھی وہ مولانا سے ملتے۔ یہیں ان کی ملاقات علامہ طنطاوی جو ہری سے ہوئی جنہوں نے اپنی تفسیر القرآن انہیں نذر کی۔ اس ملاقات میں علامہ طنطاوی نے سورہ یوسف کے تعلق سے اپنے کچھ اشکال مولانا سندھی کی خدمت میں پیش کئے جنکے شافی جواب پا کر وہ بہت خوش ہوئے۔ اس تفسیر کے متعلق مولانا کا خیال تھا کہ ”یورپ میں ہونے والے انکشافات کی روشنی میں طنطاوی نے قرآن کی تفسیر کی ہے۔ اس سے قرآن کا مقصد پس پشت چلا گیا ہے ان کے خیال میں عام فہم انداز میں قرآن کو اس طرح پیش کیا جانا چاہئے تھا کہ ایک انمی بھی اس پر چل کر زندگی میں سر بلندی حاصل کر سکے اور اس سے صرف نظر کرے تو غار مزلت میں جا پڑے۔“^{۲۳}

مولانا کے دروس میں جامعہ ازہر کے فاضلین اور مغربی تعلیم یافتہ حضرات کی بڑی تعداد ہوتی تھی۔ جن عرب علماء نے ان سے اکتساب فیض کیا ان میں شیخ عبداللہ کلثی شفیع تھے۔ جنہوں نے قرآن مجید، حجتہ اللہ باللغہ اور موطا امام مالک کے اسباق لئے۔ حجتہ پر مولانا جو کچھ فرماتے وہ اس کے امالی مرتب کرتے رہے۔^{۲۴}

دوسرے عرب عالم سید علوی مالکی تھے جنہوں نے مولانا سے المسلمی شرح موطا کا درس لیا اور اجازت حاصل کی اور تبرکاً صحاح ستہ کی ابتدائی احادیث پڑھ کر ان کے طریقہ کی اجازت حاصل کی۔ مولانا اکثر عرب علماء کو دوسری کتب دیدیہ کا درس دینے کے علاوہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتاب منہاج السنۃ کا درس بھی دیتے تھے۔ مولانا کے دروس میں شریک ہونے والے دوسرے علماء میں شیخ عبدالرزاق آل حمزہ اور شیخ عبدالوہاب دہلوی تھے۔ انکے علاوہ انڈونیشیاء، ملیشیاء اور برصغیر ہند کے دوسرے علماء بھی اپنی تفسیری مشکلات میں مولانا سندھی سے رجوع کرتے تھے۔^{۲۵}

عبداللہ لغاری کا بیان ہے کہ انگریزی میں قرآن حکیم کے مترجم عبداللہ یوسف علی بھی جب ۱۳۵۳ھ میں حج کیلئے مکہ آئے تو انہوں نے بھی کچھ قرآنی آیات کی تفہیم کیلئے مولانا سے رجوع کیا تھا۔^{۲۶}

مولانا سے اکتساب فیض کرنے والوں میں مشہور روسی عالم موسیٰ جار اللہ بھی تھے۔ جواب جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ سینٹ پیٹرس برگ میں مولانا کے میزبان رہ چکے تھے مکہ کے قیام کے دوران انہوں نے مولانا سے تفسیری درس لئے اور ان کے امالی مرتب کئے۔ موسیٰ جار اللہ ہندوستان تشریف لائے تو انہوں نے ان کی ایک نقل بیت الحکمت کراچی کو عطا کی۔ بیت الحکمت کے کارکنان نے مولانا سندھی کے ایک مسترشد مولانا محمد نور کی کو اس تفسیر پر نظر ثانی کرنے اور جدید عربی میں دوبارہ تحریر کرنے کے لئے حجاز سے بلایا جنہوں نے ۲ سال کی محنت شاقہ کے بعد اس کو مکمل کیا یہ تفسیر الہام الرحمن فی تفسیر القرآن کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا ابو العلاء اسمعیل گودھری نے کیا۔ اس کا سندھی ترجمہ جو محمد دین وفائی کی وفات کی وجہ سے نامکمل رہ گیا تھا مولانا ابوسعید مصطفیٰ قاسمی نے مکمل کیا۔

مولانا سندھی نے اس کے علاوہ سندھی تفسیر مولانا محمد مدنی کو املا کرائی وہ تقریباً آٹھ دس برس سے مکہ مکرمہ و مدینہ میں رہ رہے تھے۔ حضرت سندھی سے انہوں نے قرآن پڑھا اور ان کے درس قرآن کے امالی کو مرتب کیا۔ وہ مسلسل چودہ ماہ تک یہ کام سرانجام دیتے رہے۔ انہوں نے ۱۳۵۴ھ محرم ۱۳۵۵ھ سے ۲ صفر ۱۳۵۵ھ تک تمام قرآن کی تفسیر مکمل کی۔ مولانا مدنی کا

بیان ہے کہ مولانا سندھی بالتزام صبح سے دوپہر تک املا کراتے تھے۔ تین جلدوں میں یہ تفسیر ۲۶۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔^{۲۷}

مولانا کے قیام کے دوران مولوی عبداللہ لغاری جو سفر کابل میں ان کے ہمراہ تھے مکہ پہونچ گئے۔ ان کو بھی مولانا نے اردو میں تفسیر القرآن املا کرائے۔

مکہ کے قیام کے آخری ایام میں مولانا کے طلبیدہ محمد سرور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے مکہ پہونچے اور تقریباً ایک ماہ مولانا کی خدمت میں رہے وہ صبح مولانا کی خدمت میں پہونچ جاتے اس عرصہ میں زیادہ تر مولانا گفتگو کرتے رہتے اور وہ سماعت کرتے۔ مولانا کے یہ ارشادات انہوں نے اپنی مرتبہ کتاب ”مولانا عبید اللہ سندھی حالات زندگی۔ تعلیمات و سیاسی افکار“ میں شائع کئے۔

سرور صاحب کا بیان ہے کہ ”مولانا میری استعداد کے مطابق کسی موضوع کا انتخاب فرما لیتے اور اس پر گفتگو کرتے۔ اگر کوئی بات واضح نہ ہوتی اور میں سوال کی جرأت کرتا۔ تو آپ نہایت شرح و بسط سے اس کا جواب دیتے۔ ایک ایک نکتہ کی پوری وضاحت فرماتے۔ بعض وقت یہ صحبت تمام دن جاری رہتی بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ مولانا بعد نماز مغرب جو بیٹھتے تو ساری رات تعلیم و ارشاد میں گزار دیتے۔ مجلس ختم ہوتی میں مستقر پر آکر مولانا کے ان ارشادات کو اپنی یادداشت سے قلم بند کر لیتا۔“^{۲۸}

مکہ میں مولانا کے قیام کے آخری ایام میں ظفر حسن بھی فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے وہاں پہونچے۔ ہندوستان سے ان کی والدہ بھی وہاں گئی تھیں اور ظفر حسن کی آمد کا مقصد بارہ سال بعد ماں سے ملنا بھی تھا۔ ظفر حسن کو مولانا سے وہ ارتباط تھا کہ والدہ سے ملنے سے قبل وہ مکہ پہونچ کر پہلے مولانا سے ملے۔^{۲۹}

ہندوستان میں مولانا کو وطن لانے کی تحریک گو کافی عرصہ سے چل رہی تھی مگر ۱۹۳۷ء کے انتخاب کے بعد جب کانگریس ملک کے کئی صوبوں میں جیت کر آئی تو اس تحریک میں جان پڑ گئی۔ کانگریس نے اس سلسلہ میں حکومت سے خط و کتابت کی۔ خود مولانا بھی اپنے مشاہدات، تجربات اور غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچ چکے تھے کہ ملک سے باہر رہنے کے مقابلہ میں ان کی ملک کے

اندر زیادہ ضرورت ہے۔ تو انہوں نے صاف لفظوں میں کہا کہ وہ عدم تشدد کی پالیسی کے کاربند رہیں گے اور ملک و بیرون ملک کی انتہا پسند قوتوں سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔

سندھ گورنمنٹ کے ایک سیکریٹری کا خط انہیں یکم نومبر ۱۹۲۸ء کو ملا جس میں انہیں مطلع کیا گیا تھا کہ انڈین گورنمنٹ کو ان کی واپسی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اپنے ایک خط میں انہوں نے امید ظاہر کی تھی کہ شاید دو ایک ماہ میں انہیں پاسپورٹ مل جائے۔^{۳۰} یہ پاسپورٹ انہیں ۲۱ فروری کو ملا۔^{۳۱}

کیونکہ حج کا زمانہ قریب تھا اس لئے مولانا سندھی نے مناسک حج کی ادائیگی کے بعد واپسی کا ارادہ کیا۔ اور سندھیا کمپنی کے جہاز المدینہ سے انکی روانگی ہوئی۔^{۳۲}

مآخذ و حواشی

- ۱۔ ظفر حسن۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۱۳۱
- ۲۔ مدرسہ صولتیہ کے بانی مولانا رحمت اللہ کیرانوی ۱۸۱۷ء میں کیرانہ ضلع مظفرنگر میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی۔ پھر دہلی میں اس زمانہ کے مشہور عالم محمد حیات سے تعلیم حاصل کی۔ پھر لکھنؤ میں مفتی سعید اللہ مراد آبادی سے معقولات کی تکمیل کی۔ اس زمانے میں مسیحی متادوں کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ انہوں نے جہاد بالقلم اور جہاد بالالسان دونوں ذرائع سے ان کا مقابلہ کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی حصہ لیا۔ ناکامی کے بعد گرفتاری سے بچنے کے لئے مکہ چلے گئے جہاں قیام کے دوران انہوں نے مدرسہ صولتیہ قائم کیا۔

- ۳۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۸۷
- ۴۔ اکمل قادری۔ سیدی وجدی۔ رسالہ خدام دین۔ ص ۲۲
- ۵۔ ظہیر الحق۔ رسالہ خدام دین۔ ص ۷۸
- ۶۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۸۶
- ۷۔ مکتوب مولانا سندھی بنام محمد صدیق بہاول پوری۔ مکتب مولانا سندھی۔ ص ۳۵
- ۸۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۸۷
- ۹۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۳۰
- ۱۰۔ عبداللہ لغاری۔ مولانا سندھی کی سرگزشت کابل۔ ص ۲۴۷
- ۱۱۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۸۶
- ۱۲۔ قاضی محمد زاہد الحسنی۔ مولانا عبید اللہ کی خدمت میں چند ایام سعادت۔ رسالہ الوی اگست ۱۹۹۴ء۔ ص ۸۹
- ۱۳۔ عزیز الرحمن جامعی۔ جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین آزادی۔ حصہ سوم۔ ص ۵۳
- ۱۴۔ محمد سرور۔ مولانا سندھی جامعہ میں۔ رسالہ جامعہ۔ ص ۱۹۷
- ۱۵۔ شاہ محمد عثمانی۔ ٹوٹے تارے۔ ص ۸۷
- ۱۶۔ عزیز الرحمن جامعی۔ جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین آزادی۔ حصہ سوم۔ ص ۵۴
- ۱۷۔ مکتوب مولانا سندھی۔ بنام ڈاکٹر چوتھ رام صدر کانگریس کمیٹی سندھ۔ مکتوبات مولانا سندھی۔ ص ۳۳
- ۱۸۔ مکتوب مولانا عبید اللہ سندھی۔ بنام ڈاکٹر چوتھ رام۔ مکتب مولانا سندھی۔ ص ۳۳
- ۱۹۔ عبید اللہ سندھی۔ ذاتی ڈائری۔ ص ۳۱

- ۲۰۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۹۲
- ۲۱۔ عبد اللہ لغاری۔ مولانا سندھی کی سرگذشت کا بل۔ ص ۲۴۸
- ۲۲۔ مکتوب مولانا سندھی بنام اقبال شیدائی۔ مکتوبات مولانا سندھی۔ ص ۱۲۳-۲۴
- ۲۳۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۸۸
- ۲۴۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۸۸
- ۲۵۔ غلام مصطفیٰ شاہ۔ میرا سفر حجاز۔ رسالہ الرحیم۔ جنوری ۱۹۲۴ء۔ ص ۲۶
- ۲۶۔ عبد اللہ لغاری۔ مولانا سندھی کی سرگذشت کا بل۔ ص ۶۷
- ۲۷۔ محمد امین کھوسو۔ ایک آدمی سونے جیسا۔ ص ۳۵
- ۲۸۔ محمد سرور۔ عبید اللہ سندھی۔ ص ۵
- ۲۹۔ ظفر حسن ایک۔ آپ بیتی حصہ دوم۔ ص ۱۴۰-۴۱
- ۳۰۔ مکتوب مولانا سندھی بنام غلام رسول مہر۔ مکتوبات مولانا سندھی۔ ص ۳۶
- ۳۱۔ مکتوب مولانا سندھی بنام محمد صادق۔ مکتوبات مولانا سندھی۔ ص ۵۲
- ۳۲۔ قاضی محمد زاہد الحسینی۔ عبید اللہ کی رفاقت میں چند ایام سعادت۔ رسالہ خدام دین۔ ص ۱۵۶

باب نہم

وطن واپسی

اک آبلہ پاوادی پر خار میں آوے

۲۵ سال کی جلاوطنی کے بعد مولانا سندھی ۷ مارچ ۱۹۳۹ء کو کراچی کے ساحل پر اترے۔ ساحل منوڑا پر اس وقت کے سندھ کے وزیراعظم اللہ بخش سومرو نے اپنی حکومت اور سندھ کے عوام کی طرف سے ان کا استقبال کیا۔ باوجود اس کے کہ اللہ بخش سومرو اور شیخ عبدالمجید کا اصرار تھا کہ مولانا ان کے یہاں قیام کریں مگر آپ نے فرمایا کہ ہم ہمیشہ مدرسہ مظہر العلوم میں ٹھہرتے ہیں اور اب بھی وہیں ٹھہریں گے۔^۱

مولانا سندھی اس شرط پر ہندوستان واپس آئے تھے کہ انگریزی حکومت کے خلاف کسی بیرونی طاقت سے کوئی ساز باز نہیں کریں گے اور حکومت وقت کو اللہ بخش سومرو کا مقصد نہیں ہوگا۔ خود مولانا بھی اپنے تجربات، مطالعہ اور غور و فکر کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ ملک سے باہر رہنے کے مقابلہ میں ان کی ملک کے اندر زیادہ ضرورت ہے۔^۲

برصغیر میں ۱۹۳۷ء کے عام انتخاب کے بعد صوبائی انتخاب جیت کر چند ایک کو چھوڑ کر بیشتر صوبوں میں کانگریس کی یا کانگریس کے تعاون سے حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ جس میں اللہ بخش سومرو کی حکومت بھی تھی جو انہوں نے کانگریس کے اشتراک سے بنائی تھی۔

ملک کی حریت پسند جماعتیں اور دوسرے بااثر افراد ایک مدت سے مولانا کے ہندوستان آنے پر لگی پابندی کے خلاف تحریک چلا رہے تھے۔ مگر مولانا کی واپسی اسی وقت ممکن ہو سکی جب سندھ کی حکومت

نے مولانا کی واپسی کے بعد ان کے قانون کے دائرے میں اور عدم تشدد کا پابند ہو کر سیاسی کام کرنے کی ضمانت دی۔ ایک انقلابی اور آزادی وطن کے لیے سب کچھ تہ تیغ کر دینے والے کی ضمانت کے لیے کوئی مسلم لیگی یا کانگریسی حکومت تیار نہ تھی۔^۳

اللہ بخش کی وزارت سے پہلے شیخ عبد المجید سندھی کے ایما و اصرار پر سندھ کے سابق وزیراعظم سر غلام حسین مرحوم نے بھی مولانا کے وطن آنے پر پابندی اٹھانے کا حکومت ہند سے مطالبہ کیا تھا، مگر وہ مرحوم کے متعلق کسی قسم کی ضمانت نہ دے سکے۔ اللہ بخش کی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا کو مولانا سندھی کی قانون کے دائرے میں اور عدم تشدد کا پابند ہو کر سیاسی کام کرنے کی ضمانت دی۔ اور ان کی سرگرمیوں کی ذمہ داری قبول کی۔^۴

مولانا کے وطن واپسی کے لیے جو کوششیں ہوئیں انہیں سر حاجی عبد اللہ ہارون، شیخ عبد المجید سندھی اور روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر جناب غلام رسول مہر کا خاص حصہ ہے۔ سر عبد اللہ ہارون نے مرکزی اسمبلی میں ان کی وطن واپسی کے متعلق کئی سوال کئے۔ انقلاب لاہور اور الوحید (کراچی) میں جو دین محمد وفائی کی ادارت میں نکلتا تھا مستقل ادارے اور مضامین شائع کیے گئے۔ سرکار کی طرف سے اسمبلی میں جو جوابات دئے گئے انہر نقد و تبصروں کے ذریعہ اس مسئلہ کی اہمیت کو اجاگر کیا جاتا رہا۔

انڈین نیشنل کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے کانگریس پارٹی کے ایک عہدیدار ڈاکٹر کنور محمد اشرف کو مولانا کی واپسی کی کوشش کرنے کی ہدایت کی اور جنگی تحریک پر جمعیۃ العلماء ہند اور علماء دارالعلوم دیوبند نے مولانا کی واپسی کی تجاویز منظور کیں۔

سندھ کانگریس کے صدر مسٹر چوتھ رام گڈوانی نے اس مسئلہ پر حکومت سے خط و کتابت کی اور اس کے نتیجہ میں معلوم ہوا کہ حکومت ان سے خوفزدہ ہے کہ وہ تشدد اور طاقت کے ذریعہ انقلاب پر یقین رکھتے ہیں تو انہوں نے مولانا سندھی سے خط و کتابت کی۔ مولانا سندھی نے ڈاکٹر چوتھ رام گڈوانی کے نام خط میں اس بات کا صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ وہ:

۱۔ آئندہ کانگریس میں شامل ہو کر اس کی عدم تشدد کی پالیسی کے پابند رہیں گے۔

۲۔ ملک اور ملک کی انتہا پسند طاقتوں سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔^۵

اس کے بعد حکومت کے لیے ان پر پابندی برقرار رکھنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ وہ مولانا مرحوم کو وطن آنے کی اجازت دینے پر مجبور ہو گئی۔ حکومت نے اپنے طور پر بھی اس کی تصدیق کر لی تھی۔ مکہ میں بھی برٹش حکومت کے کارندوں نے ان سے دریافت کیا تھا کہ وہ ہندوستان واپس جا کر کیا کریں گے۔ جواب میں مولانا نے انہیں بتا دیا کہ وہ کانگریس کی عدم تشدد کی پالیسی کے پابند رہیں گے۔ اگر حکومت ان کی گذشتہ زندگی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس پر اعتبار کر لے۔ وہ مزید کسی تحریری وعدہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔^۶

۳۔ جون ۱۹۳۹ء کو جمعیت العلماء بنگال کے جلسہ میں دئے گئے اپنے خطبہ صدارت میں مولانا نے بالخصوص ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے ان کی وطن واپسی میں اہم رول ادا کیا تھا۔

جلسہ کے پہلے دن مسلم لیگ کارکنان نے جلسہ نہیں ہونے دیا تھا۔ دوسرے دن جمیعی کارکنان نے ایک چھوٹے مقام پر جلسہ کیا۔ مکہ مولانا سندھی نے اپنے خطبہ میں کہا تھا کہ ”میرے سلسلہ میں سب سے پہلے میرے دوست چودھری غلام رسول مہر اور میرے قدیم ترین مہربان سر عبد اللہ ہارون نے میرے لیے کوشش شروع کی وہ تحریک اس وقت بعض عارضی وجوہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ دوسری دفعہ اس تحریک کو انڈین نیشنل کانگریس نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں چلایا۔ اور میرے دوستوں نے ہند کے گوشہ گوشہ سے اس کی تائید کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ ہند نے مجھے واپسی کی اجازت دی۔ اس تحریک کی تائید میں ہر ہندوستانی نے حصہ لیا۔ مسلک سیاسی کے اختلاف کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔“^۷

اس فیصلہ میں ہزار پیریل میجسٹری کے وزیر ہند کی منظوری ضرور حاصل کی گئی۔ اور اگر سندھ گورنمنٹ اپنی ضمانت نہ پیش کرتی تو شاید یہ معاملہ ظہور پذیر ہی نہ ہوتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سندھ گورنمنٹ کو اس ضمانت پر تیار کرنے کے لیے برطانوی وزارت مختار مقیم جدہ اور اسکے معاون انڈین وائس کنسل نے حصہ لیا ہو۔ اس لیے میں ہزار پیریل میجسٹری اور برٹش کیبنٹ، ہزار کیلینسی وائسرائے، انڈین گورنمنٹ، گورنر سندھ اور اس کی گورنمنٹ کے معزز اراکین مثلاً غلام حسین ہدایت اللہ اور اپنے محترم دوست سید لال شاہ انڈین وائس کنسل جدہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ کانگریس کے سرکردہ ممبروں کا عموماً اور اپنے معزز

دوست شری پت برج لال بیانی ممبر کونسل آف اسٹیٹ اور ڈاکٹر چوتھ رام سابق صدر سندھ کانگریس کمیٹی کا خصوصاً اور پھر عام مسلمانوں کی جماعتوں کا اور عام ہندوستانیوں کا شکریہ اسی قدر صمیم قلب سے ادا کرتا ہوں۔^۹

میرے استاد شیخ الہند کے قائم مقام یعنی شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی اگر میری واپسی کی خواہش ظاہر نہ کرتے تو میں بمشکل اس بات پر راضی ہوتا کہ گورنمنٹ ہند سے واپسی میں سہولت بہم پہنچانے کے لیے درخواست کروں۔^{۱۰}

کراچی کے شہریوں نے ۱۱ مارچ ۱۹۳۹ء کو کراچی میونسپل کارپوریشن کے تحت مولانا سندھی کو استقبالیہ دیا۔ کراچی کے میئر حاتم علوی نے سپانامہ میں مادر وطن کے لیے مولانا کی سرفروشانہ جدوجہد پر روشنی ڈالے ہوئے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے تجربات کی روشنی میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے راہ بھائیں۔ کراچی کے شہریوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مولانا نے امیر غریب کے درمیان دوری کو کم کرنے پر زور دیا انہوں نے کہا کہ امیروں کو چاہیے کہ دیہات میں بھی اپنا ایک مکان ضرور بنائیں اور وہاں رہ کر غریبوں کے لیے تعلیم اور طبی خدمات کی سہولیات فراہم کریں۔ ہندو مسلم مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوئے اور اپنے مطالعہ کی بنیاد پر سولہ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ اس طرح انہیں دونوں مذاہب کی تعلیم کے متعلق معلومات حاصل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ جلد ہی اپنے ہندو مسلم دوستوں کے اشتراک سے ایک جماعت تشکیل دیں گے۔^{۱۱}

مولانا سندھی کے نیاز حاصل کرنے اور ان سے مستفید ہونے کے لیے ہر طبقہ کے حضرات مدرسہ مظہر العلوم میں تشریف لاتے اور وہاں ہر وقت سربراہ آردہ افراد کا جھمگھٹا رہتا۔ برصغیر کے مسلمانوں میں اس وقت جو انتشار پھیلا ہوا تھا اس پر وہ مسلسل غور کرتے اور جو لوگ ان سے ملنے آتے ان سے اسی موضوع پر گفتگو کرتے۔^{۱۲}

انہیں اس بات کا احساس تھا کہ حکومت سندھ نے ان کی ضمانت دیکر بڑی ذمہ داری قبول کی ہے اور اس سلسلہ میں ان سے اپنے کاموں کو عدم تشدد کی پابندی کے ساتھ قانون کے دائرہ میں رکھنے کی کوئی

فرمائش نہیں کی۔ ۱۳

پروفیسر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کی موجودگی میں مفتی عتیق الرحمن نے مولانا سندھی سے دریافت کیا کہ حضرت ”تیس برس کی جلاوطنی میں آپ پر عیش و مسرت کے کچھ دن بھی آئے ہیں“ تو مولانا سندھی نے فرمایا ”یقین کیجئے کہ اس پوری مدت میں ایک شب بھی ایسی نہیں آئی جس میں آرام سے سو پایا ہوں۔ ہندوستان پہونچنے پر تیس برس کے بعد پہلی مرتبہ سکون کی نیند سوسکا ہوں“۔ ۱۴

یہ راہ انہوں نے حادثاتی طور پر نہیں اختیار کی تھی اور نہ غیر شعوری طور پر اس راہ پر چل پڑے تھے۔ بلکہ یہ راہ انہوں نے سوچ سمجھ کر راہ کے تمام نشیب و فراز سے کامل درجہ کی آگاہی اور پوری ذہنی و فکری تیاری کے بعد اختیار کی۔ اس کے لیے ملت کے عشق اور ملک کی آزادی و خدمت کی راہ میں انہیں رنج و مصیبت اور حوادث و خطرات کی صورت میں جو کچھ پیش آیا اسے خندہ پیشانی کیساتھ برداشت کیا اور کبھی حرفِ شکایت کو زبان پر لا کر اس راہ کی رسم و روایت کو سوانہ کیا۔ انقلابی افکار کا ایک آتش فشاں تھا۔ جوان کے سینہ میں موجزن تھا۔ جوش و شدت جذبات کا لاوا تھا جو احتیاط کی تمام دیواروں کو توڑ کر بہہ جانا چاہتا تھا۔

اپنے استقبال کے لیے کراچی کے ساص منوڑا پر آئے ہوئے مختلف مکتب خیال کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ”کہ وطن اور خاندان کی محبت اس عمر میں مجھے ہندوستان کھینچ کر نہیں لائی۔ مجھے اگر سکون اور آرام کی ضرورت ہوتی تو عمر کے یہ آخری دن حرم پاک ہی میں آرام سے گزارتا اور اسی مقدس زمین میں سپرد خاک ہونا پسند کرتا۔ باہر رہ کر جو کچھ بھی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کر سکتا تھا میں نے کی۔ میری آنکھوں نے زندگی کے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ میں نے انسانی نسلوں کو فنا ہوتے، بستیوں کو اجڑتے، تمدنوں کو مٹتے، مذہب اور اہل مذہب کو بڑی سفاکی سے کچلے جاتے دیکھا ہے۔ ۱۵

انہوں نے کہا مجھے یقین ہے اگر میرے وطن والے ان ہی راہوں پر چلتے رہے جن پر وہ اب تک چلتے رہے ہیں اور جس عالم بے خبری میں وہ اب تک پڑے ہوئے ہیں اسی عالم میں مست رہے تو نہ ان کا اسلام بچ سکے گا اور نہ ان کی قومی حمیت اور ملی حیثیت برقرار رہ سکے گی۔ جب مجھے اس حقیقت پر پورا یقین

ہو گیا۔ اور اس یقین نے کچھ کرنے اور فکر کو عمل میں لانے پر مجبور کر دیا تو میں نے وطن واپس آنے کا تہیہ کر لیا۔ ۱۶

دورانِ تقریر انہوں نے کہا ”میں ایک عالمگیر انقلاب کے سیلاب کو اپنی آنکھوں سے اٹھتا دیکھ آیا ہوں۔ انقلاب کے اس سیلاب نے کئی ایک ملکوں کو اپنی دار و گیر میں لے لیا ہے اور جو ملک اب تک بچے ہوئے ہیں وہ اس سیلاب کے ریلے سے زیادہ عرصہ محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں نہ تو ان طوفانوں کی خبر ہے اور نہ تم جانتے ہو کہ یہ طوفان اگر بہہ نکلا تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔ تمہارے علماء ہیں کہ ان کی نظریں محض پہلے کی لکھی ہوئی کتابوں میں پھنس کر رہ گئی ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور اگر دیکھتے ہیں تو بس کتابی نظر سے وہ دنیا سے کٹ چکے ہیں۔“ ۱۷

تمہارے سیاستداں بڑی بڑی اسکیمیں بناتے ہیں لیکن ان کی نظر خاص طبقوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ وہ قوم اور وطن کا نام لیتے ہیں مذہب اور کلچر پر زور دیتے ہیں لیکن ان کا قوم، وطن، مذہب اور کلچر کا تصور یا تو سرے سے موہوم ہے یا ان کا اطلاق ایک خاص طبقہ کے اغراض اور مصالح پر ہوتا ہے۔ انقلاب کو قیامت سے کم نہ سمجھو یہ حشر برپا ہو کر رہے گا تا کہ انسانیت کے لیے خدائے ذوالجلال کی طرف سے ایک نئے ”نشر“ کا سامان ہو سکے۔ یہ انقلاب جو میں برسرِ کار دیکھ آیا ہوں انسانیت کے پس ماندہ طبقوں کو لٹکا رہا ہے۔ اگر لادینی فلسفہ انقلاب کے علمبردار اپنے بلند و بانگ دعادی کے ساتھ پس ماندہ انسانیت کو نئی زندگی کی دعوت دیتے ہیں تو ساری انسانیت کو خدا کی ایک ہی مخلوق ماننے والے ایسا فکر کیوں نہیں پیش کرتے جس سے اس کی ساری مخلوق کی بھلائی ہو۔ کوئی بندہ اپنے رب کے دئے ہوئے رزق سے محروم نہ کیا جاسکے۔“ ۱۸

وہ ایسی مضطرب روح کو اپنے میں لیے پھرتے تھے کہ جس کی بصیرت دیکھ رہی تھی کہ ایک انقلاب آ رہا ہے اور قوم غفلت میں پڑی ہے وہ خود انقلاب کی دستک کو نہ سن رہی ہے۔ نہ وہ کسی صاحب بصیرت

کی پکار پر کان دھرتی ہے۔ اپنے استاد شیخ الہند کی صحبت کا ان پر اتنا گہرا اثر تھا کہ انہوں نے اپنی علمی اور سیاسی زندگی کا حقیقی سرچشمہ انہی کو قرار دیا تھا۔^{۱۹}

وطن واپس آ کر وہ مولانا صادق کے مکان پر قیام پزیر رہے اور ملکی سیاست کا جائزہ لیتے رہے۔ ان کا دماغ برابر اس فکر میں سرگرداں رہتا تھا کہ ملک کس طرح آزاد ہو۔ یہاں کے عوام کی حالت کسی طرح بہتر کی جائے۔ مسلمانوں کی موجودہ پسماندگی کس طرح دور ہو سکتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ برصغیر کے مسلمانوں میں اس وقت جو انتشار پھیلا ہوا ہے اس کا علاج کیا ہے۔ جو لوگ ان سے ملنے آتے ان سے بھی اکثر انہی امور پر گفتگو فرماتے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اسی غرض سے وطن لوٹے تھے کہ اہل وطن کو اپنی فکر سے متعارف کرائیں۔^{۲۰}

اپنی اسی فکری راہ کو عملی شکل دینے کے لیے وہ ضروری سمجھتے تھے کہ مسلمانوں میں قدیم اور جدید علوم میں بُعد اور اجنبیت کی جو خلیج واقع ہو گئی ہے اسے ختم کر کے دونوں علوم کے حاملوں کو ایک دوسرے سے قریب کیا جائے اور یہ دونوں ملکر اس ملت کی طاقت بنیں۔ نیا تعلیم یافتہ طبقہ اسلام، اس کے علوم اور اس کی حقیقی روح سے بیگانہ نہ رہے۔ اور پرانی تعلیم پائے ہوئے لوگ آج کے زمانے کی علمی و فکری ضرورتوں کو سمجھیں۔ وہ جمود کو چھوڑیں اپنی تنگ نظری اور قدامت پرستی کی زندگی سے باہر نکلیں۔ ملک میں جو نئے حالات پیش آرہے ہیں ان کو سمجھنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے دوسرے طبقوں سے تعاون کریں اور قوم کو جس فکری اور عملی قیادت کی ضرورت ہے اسے مہیا کریں۔^{۲۱}

کراچی میں تقریباً دو ہفتہ گزار کر ۲۳ مارچ ۱۹۳۹ء کو کراچی میل سے لاہور پہونچے۔ استقبال کے لیے اسٹیشن پر بھیڑ جمع تھی۔ جمیعت احرار اور خاکساروں کے والیئمیر دستے نے بینڈ باجوں کے نعموں سے ان کا استقبال کیا۔ انقلاب زندہ باد کے نعروں کے درمیان انہوں نے اپنے خطاب میں آزادی کیے لیے اپنی شاندار خدمات کے لیے کانگریس کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے کہا کہ یورپ میں مسلمان ہندو اور سکھ مل جل کر اس طرح آزادی کے لیے جدوجہد کرتے ہیں کہ ان کے درمیان ذات پات، عقیدہ اور مذہب کے تعلق سے کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ جلسہ

کے بعد وہ اپنے عزیز اور شاگرد مولانا احمد علی کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے، لاہور میں ان کے قیام کی مدت بہت مختصر تھی، ۲۴ مارچ کو وہ دیوبند کے لیے روانہ ہو گئے۔ ۲۲ روز نامہ انقلاب نے مولانا کی آمد کا خیر مقدم کرتے لکھا تھا:-

”جس مجلس سے اٹھ کر وہ بے تابانہ نکل گئے آج اس کے اکثر اکابر اپنے مالک حقیقی کے دربار میں جا چکے ہیں۔ آج حضرت شیخ الہند، مسیح الملک حکیم اجل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور علامہ اقبال اس دنیا میں موجود نہیں جو مولانا کی مراجعت پر خیر مقدم کے لیے آتے۔ وہی ان کے ساتھ مساوی حیثیت میں گفتگو کرنے کے اہل تھے۔ ہماری بابرکت مجلس کے اکثر اکابر رخصت ہو چکے ہیں۔ اب تو ہمارے جیسے عاصی باقی رہ گئے ہیں۔“

وہ لاہور سے دہلی جانا چاہتے تھے مگر مولانا حسین احمد مدنی کی دعوت پر انہوں نے دیوبند جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یوپی کی پہلی کانگریس وزارت نے ۱۹۳۷ء میں ان پر صوبہ میں نہ داخل ہونے کی وہ پابندی اٹھالی تھی جو ان کے کابل جانے کے بعد عائد کر دی گئی تھی۔

جب ٹرین جالندھر پہنچی تو عوام کا ایک جم غفیر انہیں دیکھنے اور خوش آمدید کہنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھا۔ مجلس احرار کی صوبائی کانفرنس اگلے روز جالندھر میں ہو رہی تھی۔ احرار کے زعماء اور کارکنان نے ان سے کانفرنس میں شرکت کی درخواست کی مگر اپنے پہلے سے طے شدہ پروگرام کی بنا پر انہوں نے معذرت کر لی۔ ۲۳

دیوبند میں ان کے آنے کی اطلاع نہ تھی۔ وہ ۶ صفر ۱۳۵۸ھ مطابق ۲۸ مارچ ۱۹۳۹ء کو یکایک دیوبند پہنچ گئے۔ سب سے پہلے مسجد میں پہنچ کر دو گانہ ادا کیا۔ اطلاع ہوتے ہی سب سے پہلے مولانا محمد طیب ان سے ملنے مسجد پہنچے۔ آمد کی خبر ملتے ہی طلباء اور منتظمین مسجد میں جمع ہو گئے۔ مگر مولانا نے انہیں بتا دیا کہ وہ مولانا قاسم نانوتوی اور حضرت شیخ الہند کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے بعد ہی ان سے کلام کریں گے۔ مولانا سندھی دارالعلوم کے نائب مہتمم مولانا سید مبارک علی کی ہمراہی میں فاتحہ

خوانی کے لیے قبرستان گئے۔ واپسی پر وہ دارالعلوم کے شرقی دروازہ میں کھڑے ہو گئے اور دارالعلوم کے ہر استاد اور طالب علم سے فرداً فرداً مصافحہ کیا۔^{۲۴} اس کے بعد وہ دارالحدیث گئے اور وہاں موجود طلباء سے خطاب کیا۔ انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ دارالعلوم کے ہر طالب علم کو قرآن حکیم کے ان انقلابی اصولوں کو اپنی زندگی میں راہ دینی چاہئے جن کو عوام الناس بھول چکے ہیں۔ انہوں نے طلباء سے یہ بات زور دیکر کہی کہ انہیں رب جلیل سے عہد کرنا چاہئے کہ وہ اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھیں گے جب تک قرآنی احکامات پوری طرح سوسائٹی میں لاگو نہ ہو جائیں۔^{۲۵}

ان کے خیر مقدم کے لیے ۳۰ مارچ ۱۹۳۹ء کو دارالحدیث میں بعد نماز عشاء ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت دارالعلوم کے مہتمم قاری محمد طیب نے فرمائی۔ جلسہ میں شہر کے غیر مسلم حضرات بھی کافی تعداد میں شریک تھے۔ مولانا سندھی نے حضرت شیخ الہند کی سیاسی تحریک کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور اپنی طویل سیاحت کے تجربات بیان فرمائے۔^{۲۶}

شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری کے صاحبزادے عبید اللہ انور کا جو اس زمانہ میں دیوبند میں زیر تعلیم تھے۔ کہنا ہے کہ مولانا سندھی نے ان سے فرمایا ”انور تمہاری عمر کے نوجوانوں کے لیے ہماری یہ نصیحت ہے کہ دورہ حدیث شریف کے بعد جب تک بی۔ اے کے اسٹینڈرڈ تک انگریزی زبان میں استعداد بہم نہ پہنچا لو عملی زندگی میں قدم نہ رکھنا“۔ اس کے بعد مولانا سندھی ہنس کر فرمانے لگے کہ خیال ایک بیج ہی تو ہوتا ہے۔ خواہ یہ بیج کسی درخت کا ہو، کسی شہر کا کسی جامعہ یا کسی تحریک کا ہی کیوں نہ ہو۔ پہلے دماغ میں جنم لیتا ہے۔ پھر زمین میں جڑ پکڑتا ہے اور پھر آسمانی رفعتوں کو چھونے لگتا ہے۔ انسان کی زندگی اس کے مقاصد جلیلہ کی زندگی سے ہمیشہ کم ہوتی ہے وہ کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ پائے بالا خرا سے اس دنیا سے کوچ کرنا ہے۔ جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک عمر طبعی ہوتی ہے۔ اس طرح بڑے مقاصد کی بھی ایک زندگی ہوتی ہے لیکن یہ ہماری زندگی سے علیحدہ ہوتی ہے۔ جس پر موت طاری نہیں ہوتی۔ لیکن ایک مخصوص زمانے کے بعد اس کی وقعت کم ہو کر بالکل ختم ہو جاتی ہے اور ہوتا یہ کہ عظیم تر مقاصد کے لیے کچھ لوگوں کو قدرت اعلیٰ استعداد اور غیر معمولی صلاحیت و دیعت فرما دیتی ہے۔ جو اس مہم کو سر کرنے کے لیے پوری سعی

کرتے ہیں اور پھر دوسرے کے لیے جگہ خالی کر دیتے ہیں۔ اسی کو ہم تقدیر الہی اور مشیت الہی قرار دیتے ہیں۔ بے شک انسان اپنی عمر طبعی گزار کر رخصت ہو جاتا ہے۔ لیکن ہر شخص اپنے عمل کے خیر و شر میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ (گویا مادے کی طرح عمل لازوال ہے کہ شکل بدلتا رہتا ہے مگر فنا نہیں ہوتا) ایک طبعی دنیا میں دوسرا روحانی و اخلاقی زندگی میں اس فرق کے ساتھ کہ خیر و شر کتنے ہی اضافی کیوں نہ قرار دئے جائیں لیکن ان کے خواص و نتائج کے اعتبار سے ایک بہر حال خیر ہے اور دوسرا بہر حال شر ہے۔ ۲۷

۱۵/ اپریل ۱۹۳۹ء کی شام کو دہلی پہونچے، اسٹیشن پر استقبال کرنے والوں میں جمیعۃ العلماء، مجلس احرار اور کانگریسی کارکنان کے علاوہ مختلف مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ ۲۸ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے جو دہلی ریلوے اسٹیشن پر دیگر افراد کے ہمراہ استقبال کے لیے موجود تھے مولانا کی آمد کا حال اس طرح لکھا ہے:-

”آخر وہ دن بھی آ ہی گیا۔ ہم سب لوگ مولانا کے استقبال کے لیے ریلوے اسٹیشن پہونچے۔ علماء اور ملک کے زعماء جس طرح رہتے تھے اس کے پیش نظر میں نے اس وقت مولانا کی نسبت جو تخیل قائم کیا تھا وہ یہ تھا کہ عمامہ سر پر ہوگا۔ جبہ زیب تن ہوگا۔ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہوں گے۔ ایک خادم کم از کم ضرور ہمراہ ہوگا۔ دو تین بھاری بھر کم سوٹ کیس۔ دو تین تھرماس کی بوتلیں۔ تین چار بھاری بھر کم وزنی ناشتہ دان ساتھ ہوں گے۔ چہرہ پر تمکنت اور وقار۔ لیکن جب ٹرین پہونچی تو یہ تمام تخیلات اوہام باطلہ ثابت ہو کر رہ گئے۔ لوگ پلیٹ فارم پر ادھر ادھر فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے درجوں میں گھومتے رہے۔ دیکھا کہ ایک صاحب ننگے سر صرف کھدر کا کرتہ اور پاجامہ پہنے ایک کھدر کی چادر گلے میں ڈالے ایک دم پھدک کر تھرڈ کلاس کے ڈبہ سے اترے۔ پہچاننے والوں نے پہچانا اور ان کی طرف لپکنا شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ یہی مولانا سندھی ہیں۔ سر اور ڈاڑھی کے بال بالکل سفید عمر پینسٹھ اور ستر سال کے درمیان ہوگی۔ مگر بدن مضبوط اور گھٹا ہوا۔

آنکھوں میں غیر معمولی چمک۔ لوگوں کو تلاش ہوئی کہ مولانا کا سامان اتاریں۔ مگر وہاں سامان کہاں تھا۔ جو کچھ مولانا کے جسم پر تھا وہی ان کا سامان تھا۔ باقی نام اللہ کا۔ میں نے دنیا میں علماء بھی دیکھے ہیں۔ درویش بھی، تارکین دنیا بھی دیکھے ہیں، کسانوں اور مزدوروں کے غم میں مرنے والے بھی۔ لیکن دنیا اور اس کی چیزوں سے اس درجہ بے تعلقی اور بے نیازی۔ اس قسم کا قلندر آج تک نہ کوئی دیکھا تھا اور شاید نہ دیکھ سکوں گا۔ دہلی پہنچنے کے بعد مولانا کا قیام جامعہ ملیہ کے مہمان خانے واقع قریب باغ میں تھا۔^{۲۹} اگلے دن ۲ اپریل کو دہلی پردیش کانگریس کمیٹی کی طرف سے استقبالیہ جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ اپنی تقریر میں مولانا سندھی نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ انہوں نے عوام سے اپیل کی کہ کانگریس میں شامل ہو کر اپنی صفوں میں ضبط و نظم پیدا کریں اور ملک کی آزادی کے لیے قربانی و ایثار کے لیے تیار رہیں۔ انہوں نے کانگریس کی کایا کلپ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ گاندھی جی سے مل کر کانگریس کو غیر پسندیدہ عناصر سے چھٹکارا دلانے پر زور دیں گے۔^{۳۰}

۱۵ اپریل ۱۹۳۹ء کو جامعہ آئے۔ ان کی آمد کے موقع پر جامعہ میں ان کے لیے خیر مقدمی تقریب ہوئی۔ جس میں دہلی کے سربراہ آوردہ لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر بیت الحکمت کی داغ بیل ڈالی گئی۔^{۳۱} اس کے مقاصد میں کہا گیا کہ ”اس بیت الحکمت کا خاص مقصد اجتماعی اور انفرادی زندگی سے متعلق صحیح اسلامی فکر کی نشر و اشاعت۔ سیاسیات، معیشت، معاشرت اور تمدن کے جدید نظریات اور اداروں کو اسلامی تعلیم کی روشنی میں پرکھنا اور صحیح اسلامیات، معاشرت و تمدن کے اصول پیش کرنا اور اسلام کی پیت اجتماعی کی صالح نشوونما کے لیے مناسب نظام تعلیم کی ضروریات کو واضح کرنا ہوگا۔ ان اغراض کے لیے حکمائے اسلام کی تصانیف کا اس طرح شائع کرنا کہ دور حاضر کے لوگ اپنے مسائل کے حل میں ان سے مدد لے سکیں۔“^{۳۲}

مولانا سندھی جلا وطنی کے ۲۰ سال گزار کر ہندوستان پہنچے تو ایک جامع انقلابی، اور عملی پروگرام ساتھ لائے تھے۔ اور آخر دم تک اپنے پروگرام کو عملی شکل دینے کی سعی کرتے رہے۔ ان کی ترجیحات میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے افکار کے مطالعہ اور مسلمان نوجوانوں کی ذہنی و فکری تربیت کے لیے ایک ادارہ کا قیام بھی شامل تھا۔

مکہ کے دوران قیام جب انہیں ہندوستان واپس آنے کی اجازت مل چکی تھی وہ اس امر میں متذبذب تھے کہ ایک طویل مدت جو احرام میں گزارنے کے بعد وطن واپس لوٹیں یا نہیں۔ اگر واپس جائیں بھی تو اپنے فکر کے نتائج کو کس طرح رو بہ عمل لائیں۔ وطن جا کر گوشہ نشینی انہیں منظور نہ تھی۔ اگر زندگی کا یہی پہلو اختیار کرنا تھا تو اس کے لئے جو احرام سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جس کام کو وہ سرزمین حجاز میں بیٹھ کر نہیں کر سکتے وہ اپنے وطنوں میں رہ کر بطیب خاطر سرانجام دے سکیں گے۔^{۳۳} مولانا نے مکہ معظمہ ہی سے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو ایک تفصیلی خط لکھا۔ اس خط میں مولانا نے اپنے بعض مخصوص خیالات کا اظہار فرمایا تھا اور ان کے بارے میں ذاکر صاحب سے استصواب رائے کے ساتھ یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ ”کیا اچھا ہوتا اگر اس زمانے میں جامعہ کا کوئی استاد یہاں آ جاتا اور ہم اس کو اپنی باتیں سنا سکتے“۔^{۳۴}

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کارکن آغاز کار ہی سے احیاء ملت کے لیے فکری نشاۃ الثانیہ اور علمی تجدید کی ضرورت پر زور دیتے رہے ہیں۔ اس کے بانیوں کا مقصد بھی یہی تھا کہ قدیم اسلامی تعلیم اور جدید مغربی تعلیم کے امتزاج سے کچھ ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جو مشرقی تہذیب اور اسلامی ذہنیت کو اس طرح پیش کر سکیں کہ ان سے موجودہ زمانے کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

جس زمانے میں ذاکر صاحب کو مولانا کا خط ملا اس زمانے میں واردہ اسکیم کے حامی، مبلغ اور شارح کی حیثیت سے مسلمانوں میں ذاکر صاحب کی ذات معرض بحث بنی ہوئی تھی۔ ان کے متعلق طرح طرح کی باتیں کہی جانے لگی تھیں۔ خود جامعہ میں لوگوں کا خیال تھا کہ اس سے مسلمانوں میں مزید غلط فہمیاں پھیلیں گیں اور جامعہ کی مشکلات بڑھ جائیں گی۔ ذاکر صاحب نے مولانا کو جامعہ آنے کی دعوت دی اور

جامعہ کے ایک استاد محمد سرور کو جامعہ کے نمائندے کی حیثیت سے مولانا کے پاس مکہ بھیج دیا۔ ۳۵
 مولانا سندھی کو مسلمانوں میں شیخ الہند سے ان کے گہرے تعلق اور ان کی تحریک کے ایک عظیم
 المرتبت مجاہد اور انقلابی ہونے کی وجہ سے ایک ہیرو کا درجہ حاصل تھا۔ ان کی بے مثال قربانیوں اور دور دراز
 ملکوں میں برسوں سختیاں جھیلنے کی وجہ سے عوام میں ان کی شخصیت افسانوی ہو گئی تھی۔ ۳۶

مولانا جامعہ اور جامعہ کے اراکین اور ان کے کاموں سے اچھی طرح واقف تھے، ابتداء ہی سے
 انہوں نے ہندوستان میں اپنی زندگی کے آخری ایام جامعہ میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سرور صاحب کا
 کہنا ہے کہ جامعہ سے اپنے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کئی مواقع پر فرمایا کہ ”میں دیوبندی ہوں
 اور دیوبند میں میرا تعلق حضرت شیخ الہند سے تھا اور جامعہ کا افتتاح شیخ الہند نے فرمایا تھا۔ اس لیے جب
 بھی میں نے ہندوستان واپسی کے امکانات پر غور کیا تو مجھے قیام کے لیے صرف جامعہ ہی کا خیال آیا۔ ۳۷
 مولانا عبید اللہ سندھی کی وطن واپسی پر علماء نے مولانا سندھی کا بڑے جوش اور تپاک سے استقبال
 کیا تھا۔ لیکن جلد ہی اس جوش پر ٹھنڈی اوس پڑنی شروع ہو گئی۔ ان بزرگوں کا خیال تھا کہ مولانا ملک کے
 سب سے پرانے علماء میں سے ہیں انہوں نے اس صدی کی بہترین ہستیوں سے فیض حاصل کیا ہے، اور
 اپنے معتقدات کے لیے عظیم الشان قربانیاں دی ہیں۔ اور اب جب وہ واپس آئے ہیں تو محفل علماء کے
 صدر نشین بنیں گے اور جس وضع پر یہاں کے علماء چل رہے ہیں اسے نہ صرف قائم رکھیں گے بلکہ اسے ترقی
 بھی دیں گے۔ لیکن مولانا نے اپنی تقاریر میں ایسی باتیں کہنی شروع کیں۔ جن کو سن کر علماء چو کئے ہو گئے۔
 انہیں حیرت اس باب میں تھی کہ ایک ایسا مذہبی عالم جس نے حضرت شیخ الہند کی صحبت سے برسوں کسب
 فیض کیا ہو اور صحرا نورد درویشوں کی زندگی بسر کی ہو، نہ صرف یورپ کی مادی ترقی کو لائق استہزاء اور قابل
 نفرت نہیں سمجھتا بلکہ اس مادی ترقی کے حصول کو وقت کی بڑی ضرورت قرار دیتا ہے اور اس کے لیے وہی
 طریقہ اختیار کرنا چاہتا ہے جو ترکی میں مصطفیٰ کمال نے اپنایا تھا۔ ۳۸

مولانا کی ان ابتدائی تقاریر کا یہ اثر ہوا کہ ان کی آمد پر طبقہ علماء کی طرف سے خوشی اور خیر مقدم
 کے جو جذبات ظاہر کئے گئے تھے وہ پہلے حیرت اور استعجاب اور پھر اختلافات و مخالفت میں بدل گئے۔

لیکن مولانا سندھی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ان کے خیالات اور معتقدات لوگوں کو خوش کرنے کے لیے نہیں بدلے جاسکتے تھے۔ ملک کی تمام مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے قائدین نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے آپ کو ان سے الگ رکھا جائے چنانچہ یہی ہوا۔^{۳۹}

شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم کے وصایا میں ہے کہ: ”کوئی بات مخالف جمہور کے عام مجلس میں زبان پر مت لاؤ۔ گو وہ بات نفس الامر میں صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ لوگ اس پر انکار کریں گے اور صحبت منغٹ ہو جائے گی۔“^{۴۰} افسوس کہ مولانا سندھی نے اپنی تمام زندگی حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ علمی کے علوم اور ان کی حکمت کے مطالعہ اور ان پر عمیق اور پیہم غور و فکر کرنے اور ان کی مسلسل تعلیم اور نشر و اشاعت میں صرف کر دی مگر اسی ایک نکتہ کو نظر انداز کر گئے۔

مولانا سعید اکبر آبادی کے بقول مولانا کی بعض باتیں اتنی آگے کی تھیں کہ اس وقت کے حالات اور ماحول ان کے لیے بظاہر اتنا سازگار نظر نہ آتا تھا۔ لوگوں کو یہ باتیں ناقابل عمل معلوم ہوتیں وہ انہیں مولانا سندھی کی مجذوبانہ طبیعت کا نتیجہ سمجھتے۔ لیکن ان باتوں کو سنتے سب تھے اور ان سے متاثر بھی ہوتے تھے۔^{۴۱}

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے جنہیں مولانا سندھی کے پیش کردہ نظریہ قومیت سے اور کئی دوسری

تعبیرات سے اختلاف تھا اس کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے۔ کہ

”مولانا سندھی ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ عالم دین ہیں۔ انہوں جو قربانیاں اپنے اصول اور اپنے مشن کی خاطر سالہا سال دی ہیں وہ ان کے خلوص کو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ثابت کرتی ہیں۔ اگر ان جیسا ایک مخلص اور جہاں دیدہ عالم ہمارے سامنے بعض اجتماعی مسائل پر اپنے کچھ خیالات جو ظاہر ہے کہ ان کے طویل تجربات اور برسوں کے غور و فکر پر مبنی ہیں پیش کرتا ہے تو ہمارے لیے مناسب بات یہ ہے کہ اپنے ذہن کو شکوہ و شکایات یا شبہات میں الجھانے کی بجائے اس کے نظریات کو عملی حیثیت سے جانچ کر دیکھیں اور سنجیدگی کے ساتھ ان پر تنقید کریں۔ ایک ذی علم اور فہیم آدمی جو نیک نیت بھی ہو اس سے ہم بجا طور پر یہ توقع رکھتے

ہیں کہ جب اس کی غلطی اس پر واضح ہو جائے گی تو وہ اس سے رجوع کر لے گا۔ اور
 بالفرض اگر وہ اپنی غلطی کا معترف نہ بھی ہو تب بھی اس کے غلط نظریہ کو زمین میں جڑ
 پکڑنے سے صرف سنجیدہ علمی تنقید ہی روک سکتی ہے۔ شکوہ و شکایات اور طنز و تعریض
 سے اس کا سد باب نہیں کیا جاسکتا۔“ ۴۲۔

مولانا کے اس دور کے رفیق کار اور رفیق فکر محمد امین کھوسو کا کہنا ہے کہ مولانا جس دور میں یہاں
 لوٹ کر آئے اور جس دور میں سرگرم رہے۔ کسی کو ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔
 کوئی اس کی شخصیت سے کیا متاثر ہوتا۔ سب اپنی اپنی شخصیت کے سحر میں قید اور اپنی اپنی انا کے گنبد میں
 محصور تھے۔ ۴۳۔

اردو صحافت کے مشہور معلم اور کالم نویس عبدالسلام خورشید نے روزنامہ مشرق ۱۷ ستمبر
 ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں ایک جگہ تحریر کیا تھا۔ ”ہم مسلمانوں کی ایک بد نصیبی یہ ہے کہ اس صدی کے آغاز
 میں مسلم لیگ کی متوازی جو بھی قیادت ابھری اس سے ہمیشہ اغماض برتا اور اس کی خدمات کا انگریزوں کے
 کھاتے میں ڈال دیں۔ حالانکہ اس مسلمان قیادت کو کانگریس سے بھی کوئی حسن ظن نہیں تھا۔“

مولانا سندھی کی زندگی ایک انقلابی کی زندگی تھی، جس میں مصائب اور تکلیف کا آنا ایک قدرتی
 بات تھی۔ لیکن جس طرح کی تکالیف انہوں نے اٹھائیں وہ شاید ہی کسی کے حصہ میں آئی ہوں۔ مولانا حسین
 احمد مدنی کے مطابق ”وطن اور مذہب کی آزادی کے لیے اور بھی متعدد اشخاص نے مشکلات اور مصائب
 جھیلے ہیں مگر عبید اللہ کی سی مشکلات کسی نے نہیں جھیلیں اگر غور کیا جائے تو پہاڑ اور زرہ کا فرق نظر آئے
 گا۔“ ۴۴۔ گئے سالہا سال سخت محنت، سخت سردی اجنبی ملکوں میں سرگرداں و پریشان رہے، اعزاز اور اقربا ساتھ
 تھے نہ یار و احباب ہمدردی کرنے والے۔ مال و متاع جس سے غریب اور مسافرت کی کلفتیں آسان ہو
 جاتیں ہیں موجود نہ تھا۔ نیز خبر گیری و امداد کی جھلک بھی نہ تھی پے در پے مہینوں فاقہ کرنے پڑے۔ میل ہا
 میل پیدل چلنا پڑا۔ برف سے ڈھکے ملکوں میں جاڑے کی سخت تکالیف جھیلنی پڑیں۔ تنہائی اور کسمپرسی کا
 عذاب جھیلنا پڑا۔ ناواقف غیر مسلموں اور زبان نہ جاننے والے اجانب میں زندگی بسر کرنی پڑی۔ اس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ حلم و بردباری استقلال اور گراں باری نے جواب دے دیا۔ ۴۵

حالات کے بے شمار نشیب و فراز سے گزرنے کی وجہ سے ان کی طبیعت میں سختی اور جلال کے نقوش ابھر آئے تھے۔ وہ اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کو وہی بات اچھی لگتی تھی جو ان کی سوچ کے مطابق ہو۔

کلکتہ کے دوران قیام سبھاش چندر بوس ان سے ملنے آئے۔ شاہ محمد عثمانی نے لکھا ہے کہ میں نے سبھاش بوس سے کہا کہ مولانا بہت جلد ناراض ہو جاتے ہیں اس لیے ان سے کوئی بحث نہ کی جائے۔ انہوں نے کہا کہ وہ صرف نذرانہ عقیدت پیش کرنے آئے ہیں کسی سیاسی مقصد سے نہیں آئے۔ مولانا نے جس طرح مصیبتیں اٹھائی ہیں اگر کوئی اور ہوتا تو پاگل ہو جاتا وہ تو صرف زودرنج ہوئے ہیں۔ ۴۶

مولانا سندھی نے مولانا ظفر علی خاں کی زبان میں چوتھائی صدی ملک سے باہر گزاری۔ اسی اثناء میں ہندوستان میں بہت سی سیاسی اور مذہبی تحریکوں نے جنم لیا اور متعدد جماعتیں قائم ہوئیں جو سیاست میں بھی سرگرم عمل ہوئیں اور مذہبیات میں بھی۔ تحریک عدم تعاون، تحریک خلافت وغیرہ۔ رولٹ ایکٹ کی سخت مخالفت ہوئی اس کے نتیجہ میں انگریزی حکومت نے قتل و غارتگری بھی کی اور لوگوں کو قید و بند میں بھی ڈالا۔ پرنس آف ویلز کی آمد کے موقع پر اس کے استقبال کا پورے ملک میں بائیکاٹ کیا گیا۔ سائمن کمیشن کا مقاطعہ ہوا۔ سیاسی و مذہبی جماعتوں میں مجلس خلافت قائم ہوئی۔ جمیعہ العلماء ہند معرض قیام میں آئی۔ مجلس احرار خاص جوش اور جذبے کے ساتھ ابھری اور اس کے مقرروں نے لوگوں کا خون گرمایا اور انگریزی اقتدار کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں۔ تحریک کشمیر نے تو اس کی آواز تمام شمالی ہندوستان میں ہر جگہ پہونچادی۔ غیر مسلم تحریکوں میں اکالی تحریک اٹھی۔ شدھی کی تحریک پیدا ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں تبلیغ کے کارواں ملک بالخصوص یوپی، اور پنجاب کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ ۱۹۳۰ء میں خاکساروں نے گلیوں اور بازاروں میں چپ دراست کا ملک گیر ہنگامہ برپا کیا۔ ہندو مسلم فسادات عام ہو گئے۔ یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں مولانا کی ملک سے غیر حاضری اور عدم موجودگی کے زمانے میں ظہور میں آچکی تھیں۔

لوگوں کے ذہن بالکل دوسرے سانچے میں ڈھل گئے تھے۔ جب ۱۹۱۵ء میں مولانا یہاں سے

کئے ہیں اسوقت صورتحال اور تھی اور جب ۱۹۳۹ء میں واپس آئے ہیں تو معاملات کچھ اور نوعیت کے تھے۔ حالات کی تبدیلی نے لوگوں کے ذہنوں کو بالکل بدل دیا تھا اور سوچ و بچار کے پیمانے وہ نہیں رہے تھے جن کو مولانا سندھی اپنے دور میں چھوڑ کر یہاں سے گئے تھے۔

جب مولانا ہندوستان سے رخصت ہوئے تھے اس وقت مسلم لیگ برائے نام تھی۔ جب وہ آئے تو اس کا گھر گھر چا تھا اور اس کی تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کی بھی وہ کیفیت نہ تھی جو ۱۹۱۵ء میں تھی۔

مولانا سندھی نے مولانا محمد صادق سے اکثر اپنی اس پر جوش خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ مدرسہ مظہر العلوم میں شاہ صاحب کی حکمت کی تعلیم کا انتظام ہو اور مولانا محمد صادق اس کے سربراہ اور قائد بنیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں شیخ عبد المجید سندھی، مولانا عزیز اللہ جروار، سید حسن بخش شاہ، جی، ایم سید، حاجی مولانا بخش سومرو، مولانا احمد علی، عبد اللہ لغاری اور مولانا عبد القادر لغاری سے مشورے ہوتے رہے۔^{۷۷}

مولانا سندھی جب دہلی لاہور اور دیوبند وغیرہ کے دورہ سے واپس آئے تو پہلے دارالارشاد اور پھر مدرسہ مظہر العلوم میں دسمبر ۱۹۳۹ء میں ”جمیۃ العلماء کے اندر“ ”جمیعت خدام الحکمت“ کے نام سے ایک مستقل شعبہ قائم کیا۔ پیر جنڈا میں ۲۴ دسمبر ۱۹۳۹ء میں اور ۴ دن بعد مدرسہ مظہر العلوم میں اس کا اعلان کیا گیا۔ اس کی تشکیل کے موقع پر اعلان کیا گیا۔ ”جمیۃ العلماء سندھ میں قائم ہونے والا یہ مستقل شعبہ اسلامی فلاسفی کا خادم اور محافظ ہوگا۔ اور اگر خدا کو منظور ہوا تو ایک سوچے سمجھے دینی پروگرام پر چل کر مسلمانوں کا تشمت دور کرے گا۔“^{۷۸}

مولانا سندھی نے جمیۃ خدام الحکمت کے اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ ”خدام الحکمت کے اساسی اصول، نظری و عملی حسب ذیل ہوں گے:-

(الف) امام ولی اللہ کو جمیع علوم شرعیہ، بلا کتاب و سنت و حکمت و سیاست میں امام ہند تسلیم کرنا ان کی کتابوں کو اصلی زبانوں میں پڑھنے پڑھانے کو مقصد حیات بنانا۔ اور اس کی حکمت کی تشریح میں امام عبد العزیز کو امام ماننا۔ رفیع الدین کی تکمیل الادیان، اسمعیل شہید کی عبقات، مولانا قاسم نانوتوی کی

تقریر دلپذیر، قبلہ نما وغیرہ بطور مساوی پڑھنا پڑھانا۔

(ب) ہندی سیاست کو ترقی دینے کے لیے سندھ ساگر پارٹی یا اسی منہاج کی مستقل پارٹی کو انڈین نیشنل کانگریس میں قائم کرنا اور مولانا محمود الحسن شیخ الہند کو اس سلسلہ کا استاد ماننا۔

(ج) دارالارشاد (پیر جھنڈا) مظہر العلوم (کراچی) اور دارالعلوم دیوبند جمیعۃ الخدام الحکمت کے مراکز ہونگے جن میں اس کے محل و مقام کو بیت الحکمت کیا جائے گا۔

(د) بیت الحکمت میں قرآن عظیم کی حکیمانہ تفسیر پڑھائی جائیگی اور فقط شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی

تعلیم ہو سکتی ہے۔ ۴۹

پارٹی کا پہلا جلسہ ۱۵ فروری ۱۹۴۰ء کو ہوا جس میں پارٹی کے مستقل ارکان کے ساتھ مولانا سندھی نے بھی شرکت فرمائی۔ جلسہ میں مولانا سندھی کی تجویز پر ایک پروپیگنڈا کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے صدر مولوی احمد معلم مظہر العلوم اور سکریٹری میاں عبدالغفور مقرر ہوئے۔ ۵۰

۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو دوسرا جلسہ ہوا۔ جس میں پارٹی ممبران ”خدام خلق“ کو کام کے لیے مندرجہ ذیل ہدایات دی گئیں: ۵۱

۱۔ بلا استثناء ہر قوم کے ناخواندہ اشخاص کو تعلیم کی طرف متوجہ کرنا اور جہاں جہاں تعلیم کیلئے موقعہ پیدا ہو جائے فوراً بلا معاوضہ کام شروع کر دے۔

۲۔ تعلیم کے علاوہ عام خلق کی خدمت کا کام بلا لحاظ قوم و فرقہ کرنا۔

سندھ ساگر پارٹی

مولانا عبید اللہ سندھی نے سندھ ساگر پارٹی کے اصول و مقاصد ۱۳ نومبر ۱۹۳۸ء کو مکہ مکرمہ کے دوران قیام تحریر کئے تھے جن میں کہا گیا تھا کہ ”ہماری تمام کوششوں کا مرجع یہ ہے کہ ہم وطن میں اعلیٰ اصول و ترقی پر ایک نیشنل پارٹی قائم کرنے کا راستہ صاف کریں“۔ ۵۲

انہوں نے ہندوستان میں اسلام و مسلمانوں کے دفاع کے لیے جو پروگرام پیش کیا۔ وہ سندھ ساگر پارٹی کے نام سے مشہور ہے۔ انہوں نے ۲ جون ۱۹۴۲ء کو دارالارشاد سے بحیثیت موسس جمناء، نربداء، سندھ ساگر پارٹی کا منشور شائع کیا۔ اس کے ارکان وہی تھے جو کانگریس پارٹی کے ممبر ہونے کے علاوہ جمیعہ العلماء سندھ کے بھی ممبر اور عہدیدار تھے۔ ۵۳

ان کا خیال تھا کہ ملک میں وحدۃ الوجود یا ویدانت فلاسفی کی بنیاد پر اتحاد قائم کیا جائے۔ ان کو یقین تھا کہ ہندو اور مسلمان آپس میں ہمہ اوست (وحدۃ الوجود) کے فکر پر متحد ہو سکتے ہیں۔ اس فلسفہ کے مطابق انسانیت عامہ کے اصول پر تمام دھرموں اور فرقوں میں تطبیق دی جائے اس طرح ایک انسان کو دوسرے انسان سے جو مذہبی تعصب اور نفرت ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ مولانا سندھی کا خیال تھا کہ ویدانت صوف حضرت شاہ ولی اللہ کے فلسفہ احکام الاسلام کے بہت قریب ہے۔ یہ فلسفہ اتنا فطری ہے کہ کسی مذہب کا کوئی شخص اسے قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ ۵۴

وہ غلبہ اسلام کے داعی تھے۔ اسلام کا یہ غلبہ وہ فکری اور ذہنی تبدیلی کے ذریعہ لانا چاہتے تھے، بظاہر حکومت پر ایسی پارٹی کو قابض رکھنا چاہتے تھے جن کا فکری نظام ولی اللہی یا دوسرے الفاظ میں عبید اللہی ہو۔ ۵۵

اس پارٹی میں شرکت کے لیے کسی مذہبی عقیدہ کی شرط نہ تھی۔ ہندو مسلمان اور کسی بھی دوسرے فرقے اور تہذیب کا جو شخص چاہے پارٹی کا ممبر بن سکتا تھا۔ ممبری کے لیے کوئی چندہ بھی مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ پارٹی کے مقاصد سے فکری اور پارٹی کے لیے عملاسی کے لیے ہر رکن کے لیے یہ عہد کرنا ضروری تھا کہ وہ امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کے ساتھ منسلک رہے گا۔ دوئم انڈین نیشنل کانگریس کے اصولوں پر یقین رکھتے ہوئے تمام جائز ذرائع سے ہندوستان کی کامل آزادی کے حصول کے لیے عہد کرنا بھی ضروری تھا۔ وہ جن لوگوں کے لیے کام کرنا چاہتے تھے ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایک طرف امام ولی اللہ کے خانوادہ علمی سے وابستہ ہو تو دوسری طرف راشدیہ، قادر یہ سلسلہ کے بزرگوں سے رشتہ انسلاک رکھتا ہو۔ ان دونوں وابستگیوں سے باہر کا کوئی شخص اگر ان کی رفاقت کی خواہش کرتا تو پہلے کسی امتحان میں ڈال کر اس

کے عزم کی صداقت اور اخلاص کو پرکھتے اور جب وہ اس آزمائش میں پورا اترتا اور ان کی قیادت کو تسلیم کرتا تو اس کو اپنے ساتھ شریک کر لیتے۔^{۵۶}

وہ سیاست ہند میں ایک نئی پارٹی پیدا کرنا چاہتے تھے ان کے اپنے الفاظ میں:-
 ”ہمارے پروگرام کا سب سے اہم جز یہ ہے کہ ہم سیاست ہند میں اپنا حصہ اپنے قبضہ میں لانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بیرونی مسلمانوں سے کسی قسم کی امداد کی امید اور توقع نہیں رکھتے۔ اگر کوئی بیرونی طاقت ہندوستان پر حملہ آور ہو تو خواہ وہ مسلم ہی کیوں نہ ہو ہم اسکا پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کریں گے۔ صحیح معنوں میں ہندوستانی وہ ہے جو ہندوستان کا انتشار دور کر کے اس میں وحدت پیدا کرے۔“^{۵۷}

زندگی کے اس آخری دور میں ان کا بیشتر وقت مسلسل سفر اور بیماری میں گذرتا تھا۔ لیکن وہ اپنے پروگرام کو عملی شکل دینے کی برابر سعی کرتے رہتے۔ بیت الحکمت کا مرکز جامعہ میں قائم تھا اور کراچی، گوٹھ پیر جھنڈا، دین پور اور لاہور وغیرہ میں اس کی شاخیں قائم ہوئی تھیں۔ لیکن یہ سب شاخیں خود مختار ادارے تھے جو ایک نظام فکر سے تعلق رکھتے تھے اور سب کے سامنے ایک ہی پروگرام تھا۔^{۵۸}
 مولانا سندھی کو جامعہ سے دلی تعلق تھا اور جامعہ والے بھی مولانا کی بے حد عزت کرتے تھے۔ مولانا کی طبیعت میں ایک گونہ سختی اور تندی تو ابتداء ہی سے تھی۔ پیہم ناکامیوں اور کبھی نہ ختم ہونے والی پریشانیوں نے ان کے مزاج کو اور سخت بنا دیا تھا۔ چنانچہ وہ ذرا سی بات پر جھلّا اٹھتے اور جو بھی ان کی بات کو ٹوکتا اس کی بری طرح خبر لیتے۔ لیکن جامعہ کے ماحول میں ان کو یہ سکون میسر تھا کہ شیخ الجامعہ سے لیکر ایک معمولی طالب علم بھی ان کی کسی بات پر اعتراض نہ کرتا تھا اور جو کچھ بھی وہ کہتے عقیدت سے سنتا رہتا۔ وہ بھی جامعہ والوں کی اس بات سے بہت متاثر تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ خدا کا شکر ہے کہ میں یہاں جامعہ میں اپنے اوپر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں پاتا۔ جو کچھ بھی میرے جی میں آتا ہے آزادی سے کہتا ہوں اور کوئی بھی مجھے ٹوکنے والا نہیں۔^{۵۹}

مولانا کو اس امر کا احساس تھا کہ وہ جس کام کی ابتداء کرنا چاہتے تھے اس کا جامعہ ملیہ کے

مقاصد سے جتنا قریبی تعلق ہے ہندوستانی مسلمانوں کے کسی دوسرے تعلیمی ادارہ سے نہیں ہو سکتا۔ ان کا خیال تھا کہ شیخ الہند کے تلامذہ اس تحریک میں ان کے معاون ہوں گے۔^{۶۰}

انہوں نے الفرقان (بریلی) کے شمارے بابت ماہ رمضان ۱۳۶۰ھ میں ایک تجویز شائع کرائی۔ ”منتظمین دارالعلوم درجہ تکمیل قائم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جس میں مولانا محمد قاسم اور امام ولی اللہ کی تحریریں حضرت شیخ الہند کی تجویز کے مطابق پڑھائی جائیں گی۔ دارالعلوم کے بہت سے طالب علم ان کتابوں کو پڑھنے کا شغف رکھتے ہیں۔ مگر انتظامی فیصلہ میں یہ طے ہو چکا تھا کہ جب تک ۲۰ طلباء کے لیے ۱۰ روپیہ ماہوار کے وظیفے بہم نہ پہنچ جائیں کام شروع نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی کمزور حالت میں یہ ارادہ کرتا ہوں کہ ۲۰ روپیہ ماہوار وظیفہ دارالعلوم کے خزانہ میں جمع کرتا رہوں۔“^{۶۱} دارالعلوم سے مایوس ہو کر انہوں نے جامعہ ہی کو اپنا مرکز بنایا اور یادگار شیخ الہند کا ایک خاکہ ماہنامہ برہان کے ۱۹۴۲ء کے شمارہ میں شائع کیا۔ مولانا سندھی ابتدائی طور پر یادگار شیخ الہند کے نام سے ایک درس گاہ چلانا چاہتے تھے۔ اس کا اولین مقصد مولانا سندھی کے ذہن میں یہی تھا کہ ”امام ولی اللہ کا فلسفہ“ ان کی اور ان کے تبعین کی کتابوں کے ذریعہ اس طرح سکھایا جائے جس سے عربی اور انگریزی مدارس کے نوجوان مفکر زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں۔

مولانا سندھی نے اس زمانے میں اپنی ذہنی کیفیت اور دلی جذبات کی ترجمانی کچھ اس زبان میں کی ہے۔ ”ہم ایک عرصہ تک دوسری قوموں کی ترقی کے سامان دیکھتے دیکھتے پہلے حسرت اور پھر وحشت کے غلبے سے پریشان ہو گئے تھے۔ اگر چند روز اور اسی طرح رہتے تو ممکن تھا کہ ہم اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتے۔ وطن پہونچنے سے آخری صدمے کا خوف جاتا رہا، مگر اب تک چونکہ ہماری منشا کے موافق کام کرنے کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا، ہماری وحشت پر کوئی مستقل اثر نہیں ہوا۔“^{۶۲}

”یادگار شیخ الہند کا کام شروع کرنے کے ارادے سے جب ہم جامعہ نگر پہونچے تو سب سے پہلے جامعہ کی شاندار عمارتوں سے متاثر ہوئے۔ ہم نے استانبول میں باسفورس کے کنارے پر کالج دیکھے ہیں۔ ہمیں وہی لطف جمنا کی اس وادی میں نظر آیا۔ جب ہم اسکو اپنی چیز سمجھتے ہیں تو دماغ کی گہرائیوں

تک سرور محسوس کرتے ہیں۔ ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمارے نوجوانوں کو توفیق عنایت کی جنہوں نے اولوالعزمی سے قوم میں معیاری زندگی کی اساس کو قائم کر لیا۔“ ۶۳۔

شیخ الجامعہ ذاکر حسین خاں اور ان کے رفقاء نے فراخ دلی سے ان کی تحریک کا خیر مقدم کیا تھا اور جامعہ ہر قسم کی مدد دینے کو تیار تھی۔ مگر مولانا سندھی اس کے بجٹ پر بجز اشد ضرورت کسی قسم کا بوجھ ڈالنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ مگر ان کا یہ مصمم خیال تھا کہ ان کی یہ درسگاہ (یادگار شیخ الہند) اندرونی استقلال رکھنے کے بعد اس طرح جامعہ ملیہ کی جائداد بنے گی جیسے بنیادی تعلیمی اسکیم کا ٹریننگ اسکول جامعہ کا حصہ ہے۔ ۶۴۔

جامعہ ملیہ میں یادگار شیخ الہند بیت الحکمت کی تحریک شوال ۱۳۵۹ھ سے شروع ہوئی اور اس کا پہلا تمہیدی دور رمضان ۱۳۶۲ھ میں ختم ہوا۔ اس زمانے میں بعض گریجویٹ اور اہل علم اس میں حکمت کی ابتدائی تعلیم دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ ۶۵۔

بیت الحکمت میں مولانا سندھی کے رفقاء میں محمد سرور تھے جو اس ادارہ کے ناظم بھی تھے۔ وہ مولانا کی زندگی میں بھی اور ان کے بعد بھی مولانا کے فکری نتائج کو جمع کرتے رہے تاکہ ان کا مرکزی سرمایہ جس سے مسلمان فائدہ اٹھا سکتے تھے ضائع نہ ہونے پائے۔ ان کو مولانا کی تعلیمات سے بہت شغف تھا۔ دوسرے رفیق محمد عرفان صاحب نوری تھے۔ جو مدرسہ نور العلوم بہرائچ کے فارغ التحصیل تھے۔ ۶۶۔

مولانا سندھی نے جامعہ ملیہ کے اساتذہ کو شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کے مختلف موضوعات سے متعلق اپنے خیالات سے روشناس کرانا شروع کیا۔ ان کی کوشش تھی کہ کسی طرح ان مضمل صلاحیتوں کو جن میں حوادث زمانہ نے آرزو کی بے نیشتی پیدا کر دی تھی۔ اور جو زندہ تھے تو اس لیے کہ نہ مرنے کا نام زندگی تھا ایک نئے معاشرہ کی تعمیر میں لگا سکیں۔

وہ قرآن کے مطالعہ پر زور دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ قرآن سمجھنے کی ہمارے علماء نے آج تک کوشش ہی نہیں کی۔ وہ سمجھتے ہیں اور نہ سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ کہیں کہیں مختلف آیات کا ترجمہ کر لیتے ہیں۔ مختلف مقامات کی آیات کو باہم ملا نا نہیں جانتے اور نہ ہمارے مسلمان قانون داں قرآن سے قوانین اخذ

کر سکتے ہیں۔ قرآن کی ہر آیت سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان اللہ کی ملک ہے اور وہ کسی انسان کا محکوم نہیں ہے۔ ۶۷

آپ کی عمر جب ستر برس کی تھی طلباء کو درس دینے میں آرام کھانے پینے اور سونے کی پرواہ نہ کرتے اگر کوئی رات کو بھی پہونچتا اور آپ سے استفادہ کرنا چاہتا تو اکثر ساری رات اس سے بات چیت اور مباحثہ میں گزار دیتے اور طبیعت میں کسی طرح کا انقباس نہ ہوتا۔ نہ بے آرامی اور تھکان کی شکایت کرتے۔ ۶۸

مولانا سندھی اب عمر کے اس حصہ میں تھے کہ ان کے لیے ضروری تھا وہ ایک جگہ خواہ وہ جامعہ جیسی مرکزی جگہ ہی کیوں نہ ہو مسند بچھا کر بیٹھ جاتے اور باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کرتے۔ لیکن اس کے لیے نہ تو اس وقت ملک کے حالات سازگار تھے اور نہ ان کی عمر ایسی تھی کہ وہ اس قدر انتظار کر سکتے۔ وہ جامعہ میں دو دو تین مہینے قیام فرماتے اور اس مدت میں وہ دن بھر اپنے خصوصی طلباء کو شاہ ولی اللہ کی کتابیں پڑھاتے۔ نماز مغرب کے بعد درس قرآن ہوتا جس میں ہر خاص و عام شریک ہوتا۔ وہ جامعہ کی ہر مجلس میں جاتے۔ کالج کے طلباء انہیں مدعو کرتے اور ان سے اپنے شکوک رفع کرنے میں مدد دیتے۔ ۶۹

جامعہ میں کچھ دن گزارنے کے بعد وہ دیوبند آتے وہاں طلبہ سے ملتے ان کو سمجھاتے کوئی پڑھنے والا مل جاتا تو اس کو پڑھاتے۔ دیوبند سے لاہور آتے وہاں بھی ان سے استفادہ کرنے والوں کا ایک حلقہ تھا ان کو پڑھاتے۔ ایک آدھ ماہ وہاں قیام کرنے کے بعد سندھ تشریف لے جاتے۔ سندھ میں بھی ان کے شاگرد تھے وہ بھی اسی طرح آپ سے مستفید ہوتے۔ الغرض ایک مدت باہر گزارنے کے بعد پھر جامعہ آ جاتے اور درس و تدریس کا سلسلہ نئے سرے سے شروع ہو جاتا۔ یہ گویا ان کا معمول ہو گیا تھا۔ اور وہ مارچ ۱۹۳۹ء سے جون ۱۹۴۴ء تک برابر اس کے پابند رہے۔ ۷۰

سندھ کا دولت مند طبقہ عام طور پر مشرقی علوم سے ناواقف تھا۔ وہ امام ولی اللہ کے علمی مقام اور

علمی معارف کو نہیں جانتا تھا اس لیے مولانا سندھ میں معارف ولی اللہی کی اشاعت کرنا چاہتے تھے اور جس میں ان کو خاصی دقت پیش آئی۔^۱

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ۲۳ فروری ۱۹۴۳ء کے مرقومہ ایک مکتوب میں مولانا سندھی نے اپنے مستقبل کے پروگرام کے ضمن میں شاہ ولی اللہ کے فلسفہ حکمت اور سیاست سے آشنا کرانے کے لیے ایک مستقل مرکز دارالارشاد کے قیام کے علاوہ سندھ ساگر یونیورسٹی کے قیام کا بھی ذکر کیا تھا۔ جس کے ساتھ بیت الحکمت کا مرکزی دفتر، سندھ ساگر ماڈل اسکول اور جمنائز بسندھ ساگر پارٹی کا مرکزی دفتر بھی ہوگا۔ انہوں نے مزید لکھا تھا کہ ایک قطعہ زمین کے حصول کے بعد کام شروع کر دیا گیا ہے۔^۲

امروٹ میں ہدایت خاں پردل نے محمد قاسم ولی اللہ اسکول کھولنے کے لیے مولانا کو چھ جریب اراضی دیا۔ اس کے علاوہ شہدادکوٹ میں بھی ان کا ایک جگہ خرید کر مدرسہ کھولنے کا ارادہ تھا جہاں ولی اللہی تصانیف کی تعلیم ہو سکے۔

وطن واپسی کے بعد دارالارشاد کے قیام کے دوران بہت سے سندھی علماء نے آپ سے اکتساب علم کیا۔ جن میں علی محمد کاپوٹہ، مولانا عبدالحق رتانی، حافظ محمد خلیل نزل سندھ اور ابوسعید غلام مصطفیٰ قاسمی شامل ہیں۔

مآخذ

- ۱۔ حافظ محمد اسمعیل۔ مولانا سندھی مدرسہ مظہر العلوم میں۔ رسالہ الرحیم۔ نومبر ۱۹۶۳ء۔ ص ۶۲
- ۲۔ مکتوب محمد امین کھوسو بنام محمد سرور۔ ایک آدمی سونے جیسا۔ ص ۸۹
- ۳۔ محمد امین کھوسو۔ مولانا سندھی اور الہی بخش سومرو کی ملاقات۔ ایک آدمی سونے جیسا۔ ص ۵۱
- ۴۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۵۱
- ۵۔ عبید اللہ سندھی۔ مکاتیب مولانا سندھی۔ مرتبہ ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ ص ۳۳
- ۶۔ دین محمد وفائی۔ عبید اللہ سندھی حیات و افکار۔ ص ۳۸-۳۹
- ۷۔ شاہ محمد عثمانی۔ ٹوٹے تارے۔ ص ۷۹
- ۸۔ خطبات مولانا سندھی۔ مرتبہ محمد سرور۔ ص ۷۹-۸۰
- ۹۔ ایضاً ایضاً ص ۸۰-۸۱
- ۱۰۔ ایضاً ایضاً ص ۸۱
- ۱۱۔ ڈاکٹر ہاجن شیخ۔ عبید اللہ سندھی۔ ص ۲۰۴
- ۱۲۔ حافظ محمد اسمعیل۔ مولانا سندھی مدرسہ مظہر العلوم میں۔ رسالہ الرحیم۔ نومبر ۱۹۶۳ء۔ ص ۶۵
- ۱۳۔ محمد امین کھوسو۔ ایک آدمی سونے جیسا۔ ص ۵۲
- ۱۴۔ سعید احمد اکبر آبادی۔ چند مشاہدات۔ رسالہ الرحیم۔ اگست ۱۹۶۷ء۔ ص ۲۲۳
- ۱۵۔ عبید اللہ سندھی۔ خطبات۔ ص ۷-۸
- ۱۶۔ ایضاً ایضاً ص ۱۰
- ۱۷۔ ایضاً ایضاً ص ۱۰-۱۱
- ۱۸۔ ایضاً ایضاً ص ۱۱-۱۳
- ۱۹۔ محمد امین کھوسو۔ ایک آدمی سونے جیسا۔ ص ۵۱

- ۲۰۔ حافظ محمد اسماعیل۔ مولانا سندھی مدرسہ مظہر العلوم میں۔ رسالہ الرحیم۔ نومبر ۱۹۶۳ء۔ ص ۶۳
- ۲۱۔ حافظ محمد اسماعیل۔ مولانا سندھی مدرسہ مظہر العلوم میں۔ رسالہ الرحیم۔ نومبر ۱۹۶۳ء۔ ص ۶۳
- ۲۲۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ عبید اللہ سندھی۔ ص ۲۰۶
- ۲۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۲۰۷
- ۲۴۔ سید محبوب رضوی۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ ص ۲۹۴
- ۲۵۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ عبید اللہ سندھی۔ ص ۲۰۷
- ۲۶۔ سید محبوب رضوی۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ ص ۲۹۴
- ۲۷۔ عبید اللہ انور۔ مولانا عبید اللہ سندھی کا سفر دیوبند۔ رسالہ خدام الدین امام انقلاب نمبر۔ ص ۴۰
- ۲۸۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ ص ۲۰۸
- ۲۹۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔ رسالہ خدام الدین لاہور۔ امام انقلاب نمبر۔ ص ۲۲۸-۲۲۹
- ۳۰۔ ڈاکٹر شیخ ہاجن۔ عبید اللہ سندھی۔ ص ۲۰۸
- ۳۱۔ ضیاء الحسن فاروقی۔ شہید جستجو۔ ص ۲۰۲ بحوالہ ہمدرد جامعہ اپریل ۱۹۳۹ء
- ۳۲۔ شمس الرحمن محسنی۔ مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک۔ ص ۱۲۴
- ۳۳۔ محمد سرور۔ مولانا سندھی جامعہ میں۔ رسالہ جامعہ (جوبلی نمبر)۔ ص ۱۹۵
- ۳۴۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۹۵-۱۹۶
- ۳۵۔ ضیاء الحسن فاروقی۔ شہید جستجو۔ ص ۲۰۳
- ۳۶۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۲۰۳
- ۳۷۔ محمد سرور۔ مولانا سندھی جامعہ میں (جوبلی نمبر)۔ ص ۱۹۶
- ۳۸۔ محمد اسحاق بھٹی۔ نقوش عظمت رفتہ۔ ص ۳۶۲
- ۳۹۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۳۶۳
- ۴۰۔ رسالہ الرحیم۔ جولائی ۱۹۶۶ء۔ ص ۹۶

- ۴۱۔ سعید احمد اکبر آبادی۔ ماہنامہ برہان۔ اپریل ۱۹۴۵ء۔ ص ۱۹۷
- ۴۲۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مسئلہ قومیت۔ ص ۱۱۱-۱۱۲
- ۴۳۔ محمد امین کھوسو۔ ایک آدمی سونے جیسا۔ ص ۱۲
- ۴۴۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ ماہنامہ برہان۔ اپریل ۱۹۴۵ء۔ ص ۱۹۵
- ۴۵۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۹۵
- ۴۶۔ شاہ محمد عثمانی۔ ٹوٹے ہوئے تارے۔ ص ۹۴
- ۴۷۔ حافظ محمد اسماعیل۔ مولانا سندھی مدرسہ مظہر العلوم میں۔ الرحیم۔ نومبر ۱۹۶۳ء۔ ص ۶۵
- ۴۸۔ عبید اللہ سندھی۔ خطبات۔ ص ۱۸۷
- ۴۹۔ محمد امین کھوسو۔ عبید اللہ سندھی کے ارشادات۔ ایک آدمی سونے جیسا۔ ص ۴۳
- ۵۰۔ حافظ محمد اسماعیل۔ مولانا سندھی مدرسہ مظہر العلوم میں۔ الرحیم نومبر ۱۹۶۳ء۔ ص ۶۵
- ۵۱۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۶۵
- ۵۲۔ عبید اللہ سندھی کا انقلابی منصوبہ۔ مرتبہ ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ ص ۷۳
- ۵۳۔ محمد امین کھوسو۔ عبید اللہ سندھی کے ارشادات۔ ایک آدمی سونے جیسا۔ ص ۴۳
- ۵۴۔ محمد دین وفا کی۔ عبید اللہ سندھی، حیات و افکار۔ ص ۸۰
- ۵۵۔ محمد امین کھوسو۔ انقلابی فکر کی اساس۔ ایک آدمی سونے جیسا۔ ص ۶۶
- ۵۶۔ محمد دین وفا کی۔ عبید اللہ سندھی، حیات و افکار۔ ص ۵۰
- ۵۷۔ عبید اللہ سندھی۔ خطبات۔ ص ۱۹۶
- ۵۸۔ ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ بیت الحکمت۔ رسالہ الولی۔ ص ۱۵
- ۵۹۔ محمد سرور۔ مولانا سندھی جامعہ میں۔ رسالہ جامعہ (جوبلی نمبر) ص ۱۹۹
- ۶۰۔ عبید اللہ سندھی۔ یادگار شیخ الہند۔ رسالہ برہان۔ نومبر ۱۹۴۳ء۔ ص ۳۷۲
- ۶۱۔ عبید اللہ سندھی کی اپیل۔ مکتب مولانا عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۴۴-۱۴۵

- ۶۲۔ ضیاء الحسن فاروقی۔ شہید جستجو۔ ص ۲۰۴
- ۶۳۔ ضیاء الحسن فاروقی۔ شہید جستجو۔ ص ۲۰۴
- ۶۴۔ ایضاً ایضاً ص ۲۰۴
- ۶۵۔ عبید اللہ سندھی۔ یادگار شیخ الہند۔ رسالہ برہان۔ نومبر ۱۹۴۲ء۔ ۳۷۳
- ۶۶۔ عبد الغفار مدھولی۔ جامعہ کی کہانی۔ ص ۲۷۰
- ۶۷۔ ایضاً ایضاً ص ۳۴۱
- ۶۸۔ ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ بیت الحکمت۔ رسالہ الولی۔ ص ۲۱
- ۶۹۔ محمد سرور۔ مولانا سندھی جامعہ میں۔ رسالہ جامعہ (جوبلی نمبر)۔ ص ۱۹۸
- ۷۰۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۹۸-۱۹۹
- ۷۱۔ محمد دین وفائی۔ عبید اللہ سندھی، حیات و افکار۔ ص ۷۶
- ۷۲۔ مکتوب مولانا سندھی۔ بنام سید سلیمان ندوی۔ مکتبہ مولانا سندھی۔ ص ۴۲

باب دہم

آخری ایام

سفر تمام ہوا

عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

مارچ ۱۹۴۴ء میں دہلی سے دیوبند، لدھیانہ اور قصور ہوتے ہوئے مولانا لاہور پہونچے تو آپ کی صحت خراب ہو چکی تھی۔ لاہور کے قیام میں اسہال کی شکایت بہت بڑھ گئی تھی۔ علاج ہوا لیکن چونکہ وہ اپنے زیر تجویز کاموں کے سرانجام دینے کی فکر میں جسم اور دماغ کو بیماری میں بھی آرام نہ لینے دیتے تھے اور عمر کے ساتھ ساتھ اس سلسلہ میں آپ کی بے تابی اور اضطراب دن بدن بڑھتا جاتا تھا اس لئے علاج سے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ اسی زمانہ میں سندھ کے عربی طلبہ نے ۷ اپریل ۱۹۴۴ء کو منعقد ہونے والے جمیعتہ الطلباء کے اجتماع کی صدارت کے لئے مولانا کو بااصرار بلوایا اور وہ باوجود خرابی صحت حیدرآباد پہونچے۔^۱ اجتماع میں شریک ہوئے اور سندھی زبان میں خطبہ دیا۔^۲ اپنی زندگی کے مختلف ادوار اور جدوجہد پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے عربی طلباء کو انگریزی زبان

سکھنے کا مشورہ دیا تا کہ مغرب میں جو علمی اور سیاسی انقلاب برپا ہوا ہے وہ اس سے براہ راست واقف ہو سکیں۔ آپ نے زور دیکر کہا کہ وہ عربی کے رائج نصاب میں عقلیات کے حصہ کو بھی اسی طرح پڑھیں جیسے دینی حصہ کو پڑھتے ہیں۔ اسی کی بنیاد پر وہ اپنے ملک اور صوبہ کے عوام کی بہ خوبی خدمت کر سکیں گے۔^۳

اس اجتماع میں تقریر کے دوران ان پر ضعف کی وجہ سے کئی بار غشی طاری ہوئی لیکن آپ نے اس پر قابو پایا اور اطمینان سے اپنی تقریر ختم کی۔ دراصل مولانا کے قوائی جسمانی اب جواب دے رہے تھے۔ یہ تو صرف ان کے عزم و یقین کی توانائی تھی جو ان کے زندگی کے رشتہ کو ٹوٹنے نہیں دیتی تھی۔ ان ایام میں وہ بے حد مضطرب اور بیقرار تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ کسی وجہ سے ان کے کام میں کوئی خلل پڑے۔ چنانچہ حیدرآباد کے اجتماع کے بعد اسی بیماری اور ضعف کی حالت میں ہی وہ ایک رفیق کو لے کر سندھ کے عربی مدارس کے دورہ پر نکل کھڑے ہوئے۔ سفر کی صعوبتوں کو سہتے ہوئے وہ اطراف سندھ میں مدارس کا معائنہ کرنے کے ساتھ ساتھ نوجوان طلبہ سے ملاقات کرتے رہے۔^۴

ان ایام میں وہ مختلف امراض کے زرعے میں تھے۔ ان پر تکالیف کی یورش تھی۔ لیکن زبان سے کسی قسم کا اظہار نہیں فرماتے تھے۔ بس ایک ہی لگن تھی جو بھی عیادت کے لئے آتا اسے قرآن میں غور و تدبر اور تفکر کی نصیحت فرماتے۔ ان دنوں ان کا ایک ہی پیغام تھا کہ دنیا کے تمام روگوں، دکھوں اور مصائب و مشکلات کا حل صرف قرآن میں موجود ہے۔ قرآن کو پڑھو، سمجھو اور اس پر عمل کرو۔^۵

وطن واپسی کے بعد دیہات میں کام کرنا اور دیہاتیوں کو تعلیم دینا، ان کو ووٹ کی اہمیت بتانا ان کے پروگرام کا ایک حصہ رہا تھا۔ ملنے کے لیے آنے والے کارکنان کو دیہات میں کام کرنے کی اہمیت بتاتے۔^۶ جون ۱۹۴۴ء کی گرمیاں تھیں اور مولانا سندھ کا دورہ فرما رہے تھے کہ صحت نے بالکل جواب دے دیا۔ اور جو رفیق کار ساتھ تھے وہ بڑی مشکل سے انہیں کراچی چلنے پر راضی کر سکے۔ کراچی

میں کچھ عرصہ علاج ہوا لیکن جب بدن کا پورا رس نکل چکا ہو تو دو ادوارو سے کیا ہو سکتا تھا۔ ۷

وہ ۱۹۴۴ء کے موسم گرما میں کراچی آ گئے تھے۔ لیکن وہاں ان کی طبیعت اور علیل ہو گئی۔ بستر علالت پر ایک دن محمد ہاشم گزدر، مولانا محمد صادق، جی ایم سید موجود تھے حبیب اللہ بھٹو کے مطابق اس وقت جی ایم سید نے محمد ہاشم گزدر سے کہا کہ مولانا کو میری رہائش گاہ پر منتقل کر دیا جائے۔ جس پر مولانا نے بے حد ناراضگی کا اظہار کیا۔ ۸ ان کے معالج ڈاکٹر ہیمن داس نے جو سندھ کے وزیر صحت بھی تھے ان کو کسی یورپین طرز کے نرسنگ ہوم میں رکھنے کی صلاح دی۔ مولانا نے پہلے تو اس مشورہ پر آمادگی ظاہر کی مگر پھر انکار کر دیا۔ بعد میں وہ اپنے مخلص ڈاکٹر عبدالعزیز کے زیر علاج رہے۔ ۹

کراچی میں زیر علاج تھے اور طبیعت برابر گرتی جا رہی تھی۔ اکثر بے ہوشی کا عالم رہتا تھا۔ لیکن جب ہوش میں آتے تو شہداد کوٹ میں ۴ اگست کو محمد قاسم ولی اللہ تھیولوجیکل اسکول شہداد کوٹ ضلع لاڑکانہ کے بارے میں دریافت کرتے جسکی رسم افتتاح میں شرکت کا وعدہ کیا تھا اس کا مسلسل ذکر کرتے اور وہاں جانے والی گاڑیوں کے اوقات دریافت کرتے اسی دوران جب شہداد کوٹ سے یاد دہانی کے تار آنے لگے تو تیماردار شاگردوں نے اس خدشہ کے پیش نظر اطلاع نہ دی کہ کہیں اسی حالت میں ہی سفر کا ارادہ نہ کر لیں۔ ۲ اگست کے دن طبیعت کچھ بحال ہوئی تو کاغذ قلم منگوا کر تقریر لکھی اور اسے چھپوا کر ایک طالب علم کے ہاتھوں شہداد کوٹ روانہ فرمایا۔ ۱۰

اس خطبہ میں تحریک ولی اللہی کے قیام کے پس منظر اور اس کے مختلف ادوار پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے اپنے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ وہ اس تحریک کے تیسرے دور کو چلانا چاہتے ہیں جس کے لئے محمد قاسم ولی اللہ تھیولوجیکل کالج محمود نگر برائے یادگار شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی قائم کیا ہے۔ اور اس سارے ادارے کا نام سندھ ساگر انسٹیٹیوٹ رکھا ہے جو اپنے تین مرکز بنائے گا۔

(۱) بیت حکمت جو محمد قاسم ولی اللہ کالج کا جز بن جائے گا۔

(۲) سندھ ساگر اکاڈمی جو کالج کیلئے (۱) نشر و اشاعت (ب) طالب علموں کا جمع کرنا

(ج) فارغ التحصیل طالب علموں کی تعلیم کا اہتمام اور انتظام کرے گی۔

(۳) جمنائز بد اسندھ ساگر پارٹی۔ یہ خالص سیاسی جماعت ہوگی مگر باقاعدہ پارٹی نہیں بنائی

جائے گی۔

انہوں نے کہا کہ وہ اس کالج کے قیام سے اس کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ کالج کی تحریک سندھی نوجوانوں تک پہنچ گئی ہے۔ اسی بیماری کی حالت میں آپ نے دارالارشاد (گوٹھ پیر جھنڈا) چلنے کی خواہش کی مگر آخر میں اپنی صاحبزادی اور نواسے کی خواہش پر دین پور ضلع بھاوپور آگئے اور وہیں ۲۲ اگست ۱۹۴۴ء کو انتقال فرمایا۔ اور اپنے مرشد حضرت مولانا غلام محمد دین پوری کے قدموں میں آسودہ خاک ہو گئے۔

وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بیتاب ہو جاتا اور دوسروں کو بیتاب کرتا تھا ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گیا۔ اور وہ جب سپرد خاک ہوئے تو یقین ہے کہ ان کا سوز نہاں اور درد پناہاں جو ان کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے تھا ان کا توشہ آخرت بن گیا ہوگا۔ آمین۔

ان کی وفات سے علم و سیاست کی بزم میں جو جگہ خالی ہوئی اس کا افسوس کرنے والے اور اس خلاء کو محسوس کرنے والے بہت کم تھے۔

انہوں نے خدائے تعالیٰ کے قانون کو دنیا میں سر بلند کرنے کی کوشش میں اپنی جان و مال اپنے عزیز واقارب اور ملک و وطن سب کچھ ہجج سمجھا اور ایک بلند نظر صاحب عزیمت کی طرح زندگی بسر کی۔ وہ غلبہ اسلام کی تعلیم دیتے جہاں سے رخصت ہوئے۔ ان کے وجود کا داخلی انقلاب کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ وہ خاندانی محبت اور رشتے کو توڑ کر اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ ان کی زندگی ایک انقلابی کی زندگی تھی جس میں مصائب و تکالیف کا آنا قدرتی تھا۔

وہ اس قافلہ کے فرد تھے جو قوم کی راہ میں خود کو مٹا گئے۔ جنہوں نے اپنی زندگی برباد کر لی مگر ملک اور قوم کی تباہی ان سے نہ دیکھی گئی۔ جنہوں نے اپنی زندگی کی ساری راحتیں، زندگی کے سارے ولولے زندگی کا سارا عیش اپنے مقصد پر قربان کر دیا۔

ان کی فطرت غیر اختیاری طور پر اخلاص کی طرف چلتی رہی۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مولانا سندھی نے جو سرفروشانہ حصہ لیا اور اس راستہ میں انہوں نے جو مصائب اور تکالیف برداشت کیں۔ ان کے پیچھے ان کے بزرگوں بالخصوص حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی اتباع و اطاعت کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی اور قربانیوں کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ قیمت وصول نہیں کی۔ ان پر زرو مال، جاہ و عزت کا کوئی اثر نہ تھا۔ غرباء و فقراء اور اہل اللہ سے انہیں انس عظیم تھا۔

ان کے خطوط کے مطالعے سے جو گذشتہ چند برسوں کے دوران سامنے آئے ہیں اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کیسی کٹھن زندگی گزاری تھی۔ اور وہ زندگی کے کیسے کیسے نشیب و فراز سے گزرے تھے اور انہیں کیسے تلخ تجربات ہوئے تھے۔ ان کی زندگی میں ایسا وقت بھی آیا تھا جب انہیں کوئی یار و مددگار نظر نہیں آتا تھا۔ انہوں نے زندگی میں اپنوں کی بے وفائی کے چر کے بھی کھائے اور اپنے خوردوؤں کے ہتک آمیز رویوں کو بھی برداشت کیا۔ خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کس درجہ کا تحمل اور برداشت کی خوبی تھی وہ لوگوں کی غلطیوں کو معاف کر دینے والے، ساتھیوں اور پارٹی کارکنان کی ہمت بڑھانے اور ان کی کوتاہیوں سے درگزر کرنے والے، ان کی خوبیوں کی تعریف کرنے اور ان کی تالیف قلب کا خیال رکھنے والے تھے۔

سید ازہر شاہ قیصر نے جو مولانا سندھی کے الفاظ میں ”انکے رفیق درس اور رفیق فکر“ مولانا سید انور شاہ کشمیری کے صاحبزادے تھے لکھا ہے۔

”اخبار میں مولانا سندھی کے وفات کی خبر آئی کہ سندھ کے کسی گاؤں میں اس مرد مجاہد

اور مشرق کے اس مفکر جلیل نے انتقال فرمایا تو کئی دوست جمع تھے۔ ایک نے کہا علم اور سیاسی فکر کا ایک ستون گر گیا۔ دوسرے نے کہا کہ اسلامیات کے ایک زبردست عالم نے وفات پائی۔ تیسرے نے کہا ایک سخت جان اور جفاکش لیڈر کی موت۔ چوتھا بولا ایک ناکام لیڈر اور مجھے یہی بات اچھی لگی۔^{۱۲}

کسی شاعر کا یہ شعر ان کی زندگی پر ہر طرح صادق آتا ہے:-

تھے بہت طعنے ہوس کے اہل دل کی زیست پر
اے تیری قدرت کہ مرگ عاشقی اچھی رہی

مآخذ

- ۱۔ محمد سرور۔ خطبات مولانا عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۴۳
- ۲۔ محمد سرور۔ خطبات مولانا سندھی۔ ص ۱۴۵
- ۳۔ ایضاً ایضاً ص ۱۵۴
- ۴۔ ایضاً ایضاً ص ۱۶۶-۱۶۵
- ۵۔ عبید اللہ انور۔ مولانا سندھی کا آخری سفر دیوبند۔ رسالہ خدام دین۔ ۱۴ نومبر ۱۹۹۴ء۔ ص ۳۶
- ۶۔ محمد دین وفاقی۔ عبید اللہ سندھی۔ رسالہ خدام دین امام انقلاب نمبر۔ ص ۳۷-۳۸

- ۷۔ محمد سرور۔ خطبات مولانا عبید اللہ سندھی۔ ص ۵
- ۸۔ شیخ عبدالعزیز۔ عبید اللہ سندھی۔ رسالہ خدام دین امام انقلاب نمبر۔ ص ۱۷۵
- ۹۔ محمد دین وفائی۔ عبید اللہ سندھی۔ حیات و افکار۔ ص ۶۲-۶۵
- ۱۰۔ خطبات مولانا سندھی۔ مرتبہ محمد سرور۔ ص ۱۶۸
- ۱۱۔ ایضاً ایضاً ص ۱۷۴
- ۱۲۔ محمد ازہر شاہ قیصر۔ رسالہ خدام دین۔ ص ۲۷۲

باب یازدہم

فکر عبید اللہی

بگو با من کہ آں دیدہ ور کیست
کہ خاراں دیدہ و احوال چمن گفت

مولانا عبید اللہ سندھی ہماری قومی، ملکی و علمی تاریخ کی عظیم شخصیت تھے۔ ان کی روئداد زندگی اس زمانے کی سیاست کے ان اہم گوشوں پر حاوی ہے۔ جب ایشیاء پر یورپین استعمار پھیلتا جا رہا تھا اور اس کی گرفت کے اندر ایشیاء کی سوئی ہوئی قومیں آہستہ آہستہ بیداری کی کروٹیں لینے لگی تھیں۔ سیاست کی بہت سی خطرناک منزلوں کو مولانا سندھی نے عزم اور حوصلہ کے ساتھ طے کیا تھا۔ ان کی حیثیت ایک فرد کی نہیں، جماعت کی تھی اور انہوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دئے جو بسا اوقات انسانوں کا ایک پورا گروہ بھی انجام دینے سے قاصر رہتا ہے۔

وہ مسلمانوں کے ذہنوں کو اور ان کے دلوں کو ایک نئے جذبے سے معمور کر دینا چاہتے تھے۔ وہ ایک طرف علوم دینیہ کے بڑے عالم تھے تو دوسری طرف انقلاب و تغیر عالم پر بھی ان کی نظر تھی۔ انہوں نے مشرق میں قومیت کی جدید تحریک اور مغرب میں سوشلزم کے نفوذ و اقتدار کا ان کے پس منظر کے ساتھ بغور مطالعہ کیا تھا۔ اور اپنے خیالات و مفہوم کو اپنے تجربات کی روشنی میں بیان کیا۔ ان کے متعلق لکھنے والوں میں سے کسی نے ان کی عالمانہ حیثیت کو اجاگر کیا۔ کسی نے ان کے

سیاسی افکار کی صراحت کی۔ کسی نے ان کے معاشی اور اقتصادی نظریات کو نمایاں کر کے ان کا جائزہ لیا۔ کسی نے ان کے مختلف ممالک کے دوروں کی تفصیل بیان کیں۔ کسی نے ان کی تدریسی سرگرمیوں پر اظہار خیال کیا۔ کسی نے ان کے نظریات و تصورات کے بعض دائروں کو الفاظ و حروف کے قالب میں ڈھالا۔ بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے انہیں احیاء پسند اور کچھ نے انہیں ماضی پرست بھی کہا۔

مولانا نے ایک بھر پور علمی اور عملی زندگی گزاری تھی۔ انہوں نے زندگی کو نہ صرف قریب سے دیکھا اور پرکھا تھا بلکہ اسکی سختیوں کو جھیلنا بھی تھا۔

مولانا سندھی کا تعارف تحریک ولی اللہی کے ایک بے لوث کارکن اور باشعور رہنما کا تعارف ہے۔ وہ اپنے دور میں تحریک ولی اللہی کے قائد اور جنگ آزادی کے سرخیل رہے۔ دین کی جو تصویر انہیں شاہ ولی اللہ کی فکر میں نظر آئی وہ انہیں کہیں اور نظر نہ آتی تھی۔ انہوں نے اس تحریک کے لیے فکری اور نظریاتی کام کیا اور معروضی حالات میں اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے جاں گسل محنت بھی کی۔ مگر وہ اپنے نادان دوستوں اور بے رحم ناقدوں کے اس طرح شکار ہوئے کہ ان کی فکر عام ہونے کی بجائے تاریخ کے صفحات میں گم ہو گئی۔ مولانا مودودی کے مطابق ان کا تخیل ایک شارح کا محتاج تھا جو ان کی بات سمجھ کر دوسروں کو اچھی طرح سمجھا سکتا۔^۱

مولانا سندھی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا قاسم نانوتوی اور ان کے سلسلہ اساتذہ کے ذریعہ ولی اللہی خاندان کے اکابر اور ان کے علوم و معارف کے سب سے بڑے عاشق، محقق اور شارح تھے۔ انہی علوم میں فکر و تدبر کے لیے انہوں نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا۔ اور انہی کی تعلیم و تالیف و تدوین اور اشاعت ان کا مشن تھا۔

مولانا سندھی کے خیال میں شاہ ولی اللہ کی فکر میں آفاقی وسعت اور عالمگیری انسانیت ہے جس میں تمام فکری، ذہنی اور فلسفیانہ نظاموں کو ایک رشتہ میں پروانے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا سندھی کا خیال تھا کہ ان کے اپنے خیالات کو سمجھنے کے لیے شاہ ولی اللہ، حضرت مولانا

قاسم نانوتوی، حضرت شیخ الہند اور اسلاف و اکابر دیوبند کا مسلک سمجھنا ضروری ہے کیونکہ یہ اکابر حضرات جملہ عقائد و اعمال میں خواہ وہ شروع سے تعلق رکھتے ہوں یا اصول سے۔ ان کے اصول و قوانین مسلمہ اہل سنت والجماعت ہی کے طابع ہیں۔

مولانا سندھی کا کہنا تھا کہ حضرت شیخ الہند نے مجھے وصیت فرمائی تھی اور اس سے مجھے جو کچھ یاد ہے وہ یہ ہے ”کہ اصحاب سنت نے جو کچھ اور جس کو صحیح کہا ہے اس میں قطعاً تنازعات نہ کرنا اور متاخرین و متشککین نے اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کی طرف قطعاً التفات نہ کرنا۔ اور جمع و تطبیق و جہہ ترجیح پر قائم کرنا۔ اور پوری توجہ اور تفقہ احادیث طبقہ اولی موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور طبقہ ثانیہ میں سنن ترمذی اور نسائی کی طرف منقطع کرنا اور اختصار کے ساتھ ضرورت کے وقت مسند احمد پر نظر کرنا اور بس اور شروح میں فتح الباری اس کے بعد حجۃ اللہ البالغہ کی طرف رجوع کرنا۔“

ان کا کہنا تھا کہ ہم نے امام فخر الدین رازی کی تفسیر پڑھی۔ نیز جارا اللہ زنجیری کی تفسیر کا بھی مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ معالم التنزیل اور تفسیر حافظ ابن کثیر پڑھی۔ ان سب تفسیروں کے ذریعہ میں نے قرآن سمجھنے کی اپنی استطاعت کے مطابق پوری کوشش کی۔ لیکن سوائے تحیر کے کچھ نصیب نہیں ہوا۔ اگر زمانہ طالب علمی میں ہم نے شیخ الہند سے چند آیتوں کی تفسیر جو کتابوں میں نہیں ملتی نہ سنی ہوتی اور ہمارے لیے وہ تسکین کا ذریعہ نہ بنتی۔ نیز مولانا محمد قاسم کے بعض تفسیری جملے ہم نے نہ پڑھے ہوتے تو قدما کی ان تفسیروں کو پڑھ کر ہم علم تفسیر کے حصول سے قطعاً مایوس ہو جاتے۔ بے شک ہم اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ پہلے زمانے میں مسلمانوں نے انہی کتابوں کی مدد سے قرآن کو سمجھا تھا اور انہی اصول و قواعد پر انہوں نے اپنے اجتہاد کے مطابق قرآن کی حکومت قائم کی تھی۔ لیکن جہاں تک اس زمانے کا تعلق ہے۔ ہمارے لیے اس قسم کی تفسیروں سے قرآن فہمی ناممکن ہے۔“

شاہ صاحب نے اپنے زمانے کے شبہات اور ضروریات کے لحاظ سے اس زمانے کے مسلمات اور معلومات کی روشنی میں اپنے اجتہادات پیش کئے ہیں اور ان میں سے بعض چیزیں وقتی اہمیت کی حامل تھیں۔ لیکن بعض مستقل قیمت بھی رکھتی تھیں۔

شاہ صاحب کی ایک امتیازی خوبی، متخالف اور متباہن رجحانات کا ہم آہنگ کرنا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں جامع متفرقین تھے اور ان کی تحریروں میں شریعت اور طریقت، شافعی اور حنفی، مقلد اور غیر مقلد، وحدت الوجودی اور وحدت الشہودی، شیعہ اور سنی خیالات کے تطبیق کی مسلسل اور کامیاب کوشش ہے۔ ۵۔

الہامی نوعیت کو خود شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فکر خالص اسلامی تھا جو ولی اللہی قلب پر القا ہوا۔ شاہ صاحب کا بیان ہے:-

”ایک دن میں نماز عصر کے بعد متوجہ الی اللہ بیٹھا تھا کہ اچانک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک ظاہر ہوئی اور سر سے مجھے ڈھانپ لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی کپڑا مجھ پر ڈال دیا گیا ہے اور اس حالت میں میرے دل میں ڈالا گیا کہ یہ دین کی ایک خاص نوعیت کے بیان کی طرف اشارہ ہے اور اس وقت میں نے اپنے سینہ میں ایک نور محسوس کیا جو ہر لمحہ بڑھتا پھیلتا جاتا تھا اور کچھ عرصہ بعد مجھے میرے رب نے الہام فرمایا کہ قلم اعلیٰ (قلم تقدیر) نے جو امور میرے لیے لکھے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں کسی دن اس امر کے لیے کھڑا ہو جاؤں جسے پھیلتے ہوئے نور کی شکل میں میں نے دیکھا تھا۔ یعنی دین کا ایک خاص بیان و تشریح۔ بالیقین زمین چمک اٹھی اپنے رب کے نور سے اور اس کی شعاعیں منعکس ہوئیں۔ غروب کے وقت روشنی نے اپنا عکس زمین پر ڈالا (یعنی دل کی ہر سمت پر یہ نور چھا گیا جو علم حقائق کا ایک خاص نور تھا اور (وہ یہ کہ) شریعت مصطفویہ اس دور میں حجت و برہان کے مکمل لباس میں نمایاں ہوئی ہے۔ (جو اس عقل پسندی کے دور کی نفسیات کا تقاضہ ہے) پھر میں نے مکہ مکرمہ میں ایک روز دین کے اماموں حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو خواب میں دیکھا کہ گویا ان دونوں نے مجھے ایک قلم عطا کیا اور فرمایا کہ ہمارے جد امجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلم ہے۔ تب میں

بار بار اپنے دل میں سوچتا رہا کہ فن اسرار و حقائق میں ایک رسالہ دویدن کروں جو مبتدی کے لیے تو بصیرت ہو اور فقہی کے لیے تذکیر ثابت ہو تو حجة اللہ البالغہ تصنیف کی۔^{۱۰}

مولانا سید سلیمان ندوی کا کہنا ہے کہ شاہ صاحب کی تعبیرات ایسی نازک ہیں کہ کفر اور اسلام کے درمیان پل صراط کا کام رہ جاتا ہے۔^{۱۱}

شیخ محمد اکرام کا خیال ہے کہ اگر دیوبند نے شاہ صاحب کے خیالات کی نہیں بلکہ ان کے طریق کار کی پیروی بھی کی ہوتی تو بہت سے مسائل کے حل کی کوشش سب سے پہلے یہیں سے شروع ہوتی اور جو اختلافات مغرب کی سیاسی کامیابی اور غیر معمولی مادی ترقی کے باعث جدید اور قدیم طبقوں میں پیدا ہو گئے ہیں انہیں رفع کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ارباب دیوبند نے شاہ صاحب کے نتائج فکر کو تو اختیار کیا۔ مگر جس فکری عمل اور جن ذہنی مراحل کے بعد شاہ صاحب ان نتائج پر پہونچے تھے ان کی پیروی نہیں کی۔ انہوں نے اختلافات کو مٹانے کی بجائے اور وسیع کیا اور جدید کے مقابلہ میں قدیم کی ترجمانی کی۔^{۱۲}

دیوبند میں ایک عالم ایسا بھی پیدا ہوا جس نے شاہ صاحب کے نتائج فکر کی نہیں بلکہ ان کے طریق کار کی پیروی کی ہے اور ان کے قائم کردہ اصولوں پر چل کر قدیم اور جدید کے اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کی۔ مسلک کے لحاظ سے وہ خفی تھے۔ وہ صرف مذہبی معاملات ہی میں نہیں بلکہ سیاسی امور میں بھی ولی الہی طریقہ کو اپنا اساس مانتے تھے۔ ان کے تمام دینی عقائد اور سیاسی تصورات ان ہی دوائر میں تلاش کئے جانے چاہئے۔ جو عقائد اس مسلک اور مکتبہ فکر کے اسلاف کے تھے ٹھیک ٹھیک وہی دینی عقائد مولانا سندھی کے تھے۔ سیاسی مسلک میں وہ اپنے عظیم استاد مولانا محمود حسن اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے افکار و رہنمائی کو ہندوستان کے مخصوص حالات میں کافی اور صحیح سمجھتے تھے۔

حضرت مولانا اس عہد انقلاب میں بھی انقلاب لانا چاہتے تھے۔ انسان کا خدا سے رشتہ جوڑنا چاہتے تھے۔ انسانوں کو جو مختلف اور متضاد گروہوں میں بٹے ہوئے تھے انہیں ملانا اور ایک لڑی میں

پرونا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو لوگ تحریک وحدت انسانی کے قیام میں رکاوٹیں ڈال کر ایک طبقے کو دوسرے طبقے سے، ایک مذہب کو دوسرے مذہب سے، اور ایک مسلک کو دوسرے مسلک سے لڑانا چاہتے ہیں وہ رجعت پسند ہیں۔^{۱۰}

روایت پرست مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ ان بہت سوں سے جنہیں جدید تعلیم یافتہ کہا جاسکتا ہے۔ کہیں زیادہ وسیع الذہن اور جدید خیالات کو قبول کرنے والے تھے وہ ایک انقلابی ذہن رکھتے تھے۔ بہت بے تعصبی سے غور و خوض کے بعد مسائل کا معروضی مطالعہ کرتے اور فراست و بصیرت کے ساتھ حال و مستقبل کے مسائل کا حل پیش کرتے۔ ان کے ذہن میں جمود نہ تھا۔

مولانا کی بعض باتیں اتنی آگے کی تھیں کہ اس وقت کے حالات اور ماحول ان کے لیے بظاہر سازگار نظر نہ آتے تھے۔ لوگوں کو ان کی باتیں ناقابل عمل معلوم ہوتی تھیں اور وہ انہیں مولانا کی مجذوبانہ طبیعت کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ لیکن ان باتوں کو سنتے سب تھے اور ان سے متاثر بھی ہوتے تھے۔

ان کی تصانیف میں ان کے پیش کردہ کئی نظریات محل نظر ہیں جن سے اختلاف ممکن ہے۔ لیکن اگر ان کی تہہ تک پہنچیں تو ان کے مخالفین کو بھی ان کے تجربی اور ذہنی قوت استخراج کی داد دینی پڑتی ہے۔^{۱۱}

ان کا کہنا تھا کہ:- ”ہم جب سے ہند میں واپس آئے ہیں ہم نے کسی سیاسی جماعت سے پورے اشتراک کا کبھی ارادہ نہیں کیا۔ بلکہ ایسے فکر کی دعوت دیتے رہے جو ملک کی عام ذہنیت سے بہت دور ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ جو پارٹی امام ولی اللہ کی فلاسفی پر بنے گی وہی ہماری وطنی و ملی ضرورتیں پوری کرے گی۔ ہمارا یہ فکر اور زبانہ کی فضا اہل علم بھی نہیں جانتے۔ ان کے افکار میں ہلکا سا متوج پیدا کرنے کے لیے ہم نے پہلے امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف اور اس کے بعد ان کی سیاست پر ان کو الہیات اور اقتصادیات میں ایک مستقل امام فرض کر کے مضامین لکھے۔^{۱۲}

مولانا ۱۹۳۹ء میں وطن واپس آئے اور ۱۹۴۰ء میں ماہنامہ الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر

میں ان کا مضمون ”امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف“ شائع ہوا تھا جس پر علماء کی طرف سے کافی اعتراضات کئے گئے۔

مولانا مسعود عالم ندوی نے مولانا سندھی پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مولانا سندھی اسلام اور ہندوستانی قومیت کا مبجون مرکب پیش کرنا چاہتے ہیں۔^{۱۳} اور مولانا سندھی کے افکار میں یہ چیز بری طرح کھلکتی ہے کہ وہ اسلام کا قلاوہ بھی موجودہ انسان کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری نہیں سمجھتے مولانا مسعود عالم ندوی کا کہنا تھا کہ مولانا سندھی کے دل و دماغ کسی اور وادی میں بھٹک چکے تھے اور وہ محض زمانہ سازی کے طور پر یا اپنی کسی خاص مصلحت کے لحاظ سے کتاب و سنت کے ذیل میں اپنی باتیں کہا کرتے تھے۔^{۱۴}

مولانا مناظر احسن گیلانی نے مولانا سلیمان ندوی کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۹ فروری ۱۹۴۳ء میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مولانا سندھی کا یہ مقالہ ارتدادی عقائد کے دائرہ میں آتا ہے۔ اگر حکومت نہ ہونے کی وجہ سے ایسے عقائد کے حامل کو قتل کرنے کا امکان نہ ہو تو کم از کم تردید ہی کر دی جائے۔^{۱۵}

محمد سرور کا کہنا ہے کہ مولانا کا دستور تھا کہ جب بھی کتاب و سنت کے حوالہ سے کوئی بات کہتے اس کے ساتھ اس کی صراحت ضرور کر دیتے کہ یہ نتیجہ میں نے شاہ صاحب کی فلاں کتاب کی فلاں عبارت سے اخذ کیا ہے۔ اور اگر کوئی ایسی بات کہتے جس کے لیے انہیں شاہ صاحب کی کتابوں سے سند نہ ملتی تو صراحت کر دیتے کہ یہ میرا ذاتی اجتہاد ہے۔^{۱۶}

مندرجہ بالا مقالہ کے سلسلہ میں مدیر الفرقان مولانا منظور احمد نعمانی کا بیان ہے کہ ”جب مولانا کے افکار و نظریات خود مولانا کی زبانی پوری طرح سننے کا موقع ملا تو اپنے خیالات میں مجھے بہت کچھ ترمیم کرنی پڑی اور یہ مستقل فیصلہ کرنا پڑا کہ مولانا جو کچھ فرماتے ہیں اس کی غرض و غایت اور حقیقت پر خود مولانا سے گفتگو کے بعد ہی آخری رائے قائم کرنی چاہئے۔ بعض اوقات وہ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ جن سے خواہ مخواہ وحشت پیدا ہوتی ہے۔ بسا اوقات ان کا طرز عمل ملامتیہ مشائخ کے طریق کار سے بہت مل جاتا ہے۔ وہ بعض اوقات ایسی باتیں کہہ گزرتے جس سے خواہ

مخواه ہم جیسوں کو نہ صرف وحشت بلکہ بدگمانی ہوتی ہے۔ اور جب وہ اس کی حقیقت بیان فرماتے ہیں تو وہ اکثر و بیشتر قابل قبول ہوتی ہے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت شاہ صاحب کے علوم و فنون کا مولانا نے گہرا مطالعہ فرمایا ہے اور وقت کے خاص مسائل کی روشنی میں خاص مسائل کو حل کرنا ان کا خاص فن ہے۔^{۱۷}

پروفیسر محمد سرور کا بیان ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا سندھی کے اس مقالہ کو پڑھ کر مدیر الفرقان کو لکھا تھا کہ مولانا سندھی کے مضمون کو میں نے بغور پڑھا۔ اور اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ بے شک مولانا کی نظر حضرت شاہ صاحب کے فلسفہ اور نظریات پر نہایت وسیع اور عمیق ہے۔ اور حکمت ولی اللہی کی معرفت میں ان کا مقام کتنا بلند ہے۔^{۱۸}

دیپلف خالد نے اپنے مضمون ”نواعتزال کے بعض پہلو“ میں تحریر کیا ہے کہ شاہ ولی اللہ کے خیالات معتزلی افکار کی صدائے بازگشت ہیں۔ لیکن وہ اس مبغوض فرقہ کا نام قصداً زبان پر نہیں لاتے۔ مگر ان کے بڑے مفسر اور شارح مولانا عبید اللہ سندھی شاہ صاحب کی تعلیمات اور معتزلیوں کے عقائد میں باہم توافق و تطابق پاتے ہیں۔ وہ اپنی تصنیف شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ میں بتاتے ہیں کہ معتزلہ کی طرح شاہ ولی اللہ بھی کسی آیت کو منسوخ نہیں مانتے۔ ان کے خیال میں قرآن میں صرف پانچ آیتیں منسوخ ہیں۔ لیکن اگر ان آیات کے اندورنی مطالب کو بغور دیکھا جائے تو وہ بھی منسوخ نہیں ہیں۔ اور ان کا مستقل اور دائمی ہونا شک سے بالاتر ہے۔ مولانا سندھی لکھتے ہیں کہ ”شاہ ولی اللہ محدثین کے اس نظریہ سے متفق نہیں کہ قرآن پاک کی بعض آیتوں کو بعض آیات منسوخ کرتی ہیں۔ لیکن اس عوامی عقیدے کی تردید و اصلاح کی خاطر جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا وہ حکمت پر مبنی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ علماء نے عرصہ دراز سے قرآن میں مسئلہ نسخ کو تسلیم کر رکھا ہے اور جو کوئی بھی اس کی بالکل تردید کرے گا وہ معتزلی سمجھا جائے گا اور اس کی رائے بھی ناقابل لحاظ ہوگی۔ مولانا سندھی کے خیال میں معاصر علماء کے اس طرز عمل کے پیش نظر شاہ ولی اللہ نے اس مسئلہ کو بدرجہ حل کرنے کی کوشش کی۔^{۱۹}

جہاں تک مولانا عبید اللہ سندھی کا معتزلی خیالات پر اعتماد کا تعلق ہے۔ دیپلف خالد کے خیال

میں ان کا مقصد انوکھا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ عربی اسلام کی مدح و ستائش نے برصغیر کے مسلمانوں میں غلامانہ ذہنیت پیدا کر دی ہے۔ ایک اجنبی قوم کے ماضی سے ان کی والہانہ وابستگی اتنی زیادہ ہے کہ خود انہوں نے اپنی تاریخ کے زریں واقعات کو نظر انداز کر کے دیگر مسلم ممالک کا احترام کھودیا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں میں خود نگری و خود شناسی کا جذبہ پیدا کرنا چاہا۔ مولانا سندھی اول و آخر قومیت کے حامی تھے۔ وہ معتزلہ اور محدثین کی آویزش کو ایرانی اور عربی مزاج کا نام دیتے تھے۔^{۲۰}

مولانا سندھی کا کہنا تھا کہ مامون کے عہد میں عرب حکومت کے کاروبار سے بے دخل ہو چکے تھے۔ برتری کے اظہار کے لیے لے دے کر ان کے پاس عربی زبان رہ گئی تھی۔ جسے انہوں نے تقدس کا درجہ دے رکھا تھا۔ اس وجہ سے مولانا کے خیال میں جو لوگ معنوں سے زیادہ الفاظ کو اہمیت دیتے ہیں وہ عربی عصیت کے مبلغ ہیں۔ بہت سے عرب علماء قرآن پاک کے قدیم ہونے کے قائل تھے اور وہ اس نظریہ کی حمایت میں سینہ سپر رہے۔ عرب اقتدار کے پُر جوش مبلغ امام شافعی تھے۔ ان کے مقابلے میں غیر عرب امام ابو حنیفہ اور امام بخاری تھے جو قرآن پاک کو حادث مانتے تھے۔^{۲۱}

مولانا عبید اللہ سندھی نے جلا وطنی کے بارہ سال مکہ معظمہ میں گزارے تھے۔ وہ یہ دیکھ کر مایوس ہوئے کہ عرب علماء انہیں اور دوسرے ہندوستانی علماء کو اہمیت نہیں دیتے اور ان کو اسلام پر سند نہیں مانتے۔ ان کو یہ جان کر بھی دکھ ہوا کہ عرب علماء کو شاہ ولی اللہ کے تصوف میں عجمیت اور ہندیت کی بُو آتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ وہ (عرب) عجمیت کو خالص اسلام کے منافی سمجھتے ہیں۔ ان حالات میں وہ اپنے مثالی نمونہ شاہ ولی اللہ کے نقش قدم پر چلے اور مسلمہ حقائق کے لیے نظریاتی بنیاد فراہم کر دی۔ وہ فقہ حنفی کو جو ہندوستان کی مسلم اکثریت پر کئی حکمراں ہے، آریائی کتب قانون کہتے، اور اسے اسلام کی ہندی قومی تشریح کا نام دیتے ہیں اور امام شافعی کے فقہ کو سامی یا عربوں کی قومی تشریح و تعبیر سے یاد کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اسلامی ممالک میں دونوں فہموں کا مساوی درجہ ہے۔^{۲۲}

پروفیسر محمد سرور جو مولانا سندھی پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک جگہ رقم طراز ہیں: ”قرآن پاک کے حادث ہونے کا مسئلہ چھیڑ کر مامون الرشید عربوں کے احساس برتری کی اصلاح کرنا چاہتا تھا۔

اس کے خیال میں محدثین کا یہ اصرار کہ قرآن قدیم ہے، عربی، ایرانی افکار کی صحت مند آمیزش میں سد راہ تھا۔ پھر یہ نظریہ ملکی مصالح کے بھی خلاف تھا اس لیے مامون نے اس مسئلہ کو زور و شور سے اٹھایا۔^{۲۳}

مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ: ”اس زمانے کے بہت سے علماء جو علم و فضل میں عرب علماء سے کم نہ تھے، قرآن پاک کے الفاظ کے حادث ہونے کے قائل تھے۔“^{۲۴} مامون کے عہد میں ایرانیوں نے تھوڑی سی علمی برتری حاصل کر لی تھی۔ اور معتزلی تحریک بھی اسی ذہنی برتری کی مظہر تھی۔

مسلمانان عالم میں ہندوستانی مسلمانوں کی علمی اور ثقافتی بالادستی ثابت کرنے کے لیے مولانا سندھی نے معتزلی افکار سے فائدہ اٹھایا۔ اگرچہ وہ حقیقت میں نئے اعتزال کے مقلد نہ تھے۔ انہوں نے قومی مقاصد کی ترویج کے لیے اعتزال کا سہارا لیا۔ لیکن اس کام کے لیے انہیں ”ولی اللہ ازم“ زیادہ موزوں نظر آیا جو اسلام کا نہ صرف عجمی بلکہ ہندوستانی ایڈیشن ہے۔^{۲۵}

مولانا سندھی کے فکر و عمل پر اشتراکیت کے گہرے اثرات تھے۔ لیکن وہ کیونکہ اشتراکیت کے فلسفہ کی گہرائیوں سے بے بہرہ تھے اس لیے اس کے بارے میں ان کا نقطہ نظر رومانوی اور غیر سائنسی تھا۔ وہ مذہب اور اشتراکیت کو ایک دوسرے کی ضد یا ایک دوسرے کا مخالف تصور نہیں کرتے تھے۔ اس باب میں ان کا نقطہ نظریہ تھا کہ اشتراکیت ایک ایسا مذہب ہے جو روحانیت سے محروم ہے۔ اس لیے یہ نامکمل ہے اس کے ارتقاء کا ترقی یافتہ مرحلہ مذہب ہے۔^{۲۶}

مولانا سندھی کے تصور اشتراکیت پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں کہ: ”مولانا نے اور چیزوں کی طرح اشتراکیت کا جائزہ بھی بڑے غور و خوض اور وسعت نظر سے لیا۔ لیکن اس تمام سفر میں ان کا رہنما اسلامی فکر ہی رہا۔ مولانا کے نزدیک اشتراکیت کا اچھا پہلو یہ ہے کہ یہ ایک عالمگیر اور بین الاقوامی تحریک ہے جو کسی خاص قوم یا ملک کے فائدے کے لیے شروع نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ اس کی بنیاد عام انسانی ہمدردی اور مساوات پر ہے۔“^{۲۷}

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی کے خیال میں روسی انقلاب کے ابتدائی دور کے بارے میں مولانا سندھی کے اس دور کے تاثرات کا اطلاق بعد کے ادوار پر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جب روس خود ایک

استعمار کا روپ لے چکا تھا اور مشرقی یورپ اور وسط ایشاء کی اقوام کی آزادی غضب کر کے ان کے مذہب ثقافت اور معاشرت کو ختم کرنے کے درپے تھا۔ عہد رسالت میں رومیوں اور ایرانیوں کی باہم جنگ کے حوالے سے قرآن کریم نے بھی ایک موقع پر رومیوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ اور رومیوں کی کامیابی کو مسلمانوں کے لیے باعث مسرت قرار دیا تھا۔ لیکن یہ ایک وقتی بات تھی جو اس وقت کے معروضی حالات کے پس منظر میں تھی۔ اس کے چند سال بعد خود رسالت مآب صحابہ کرام کا لشکر لے کر تبوک کے مقام پر جہاد کے لیے رومی لشکر کا انتظار کر رہے تھے۔ اس طرح اگر روسی انقلاب کے بارے میں مولانا سندھی نے کچھ تعریفی باتیں کہی ہیں تو ان کو اس دور کے معروضی منظر میں دیکھنا ہوگا۔ ورنہ جہاں تک کمیونزم کے اعتقادی اور نظریاتی پہلو کا تعلق ہے ان کے بارے میں مولانا سندھی کا نظریہ اور عقیدہ بھی وہی ہے جو اس دور کے اہل علم کا ہے۔^{۲۸}

مولانا سندھی نے اسلام کی جو توجیہ پیش کی ہے وہ انقلابی اور جارحانہ ہے۔ اس میں جدید مغربی علوم و فنون اور تہذیب کو جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اشتراکی اصولوں سے قریبی مشابہت رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کا نقطہ نظر انیسویں صدی کے متکلمین سے بالکل مختلف تھا۔ جو زیادہ تر مطابقت پذیری پر اصرار کرتے تھے۔ خود مولانا سندھی کو بھی اس امر کا پوری طرح احساس تھا۔ اسکی توجیہ وہ اس طرح کرتے تھے کہ سید احمد خاں کی دعوت بالائی طبقہ کے لیے تھی جب کہ وہ خود کسانوں اور مزدوروں سے مخاطب تھے۔^{۲۹}

اسلامی تعلیمات میں ترقی پسندانہ رجحانات کا جواز پیدا کرنے کی خاطر مولانا سندھی اپنے فکری امام شاہ ولی اللہ کی مانند صورت اور مادے میں امتیاز کرتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کا جو ہر جو مادہ کی حیثیت رکھتا ہے اگر چہ اٹل ہے۔ لیکن اس کے اظہار کی صورتیں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ زندگی کی ہر حرکت تبدیلی اور انقلاب ہے۔ گزرا ہوا زمانہ واپس نہیں پٹ سکتا۔^{۳۰}

مولانا کے ہم عصر ان کا فہم حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ بلاشبہ ابلاغ کے مناسب سلسلہ کے قائم ہونے میں ناکامی کا ایک بڑا سبب خود مولانا کا انداز اظہار تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں انہیں اس

ناکامی کا بہت احساس تھا۔ قاضی جاوید نے محمد سرور سے مولانا کی ایک گفتگو کا حوالہ دیا ہے جس میں مولانا کا کہنا تھا کہ: ”دیکھ پروفیسر میں ایک مولوی ہوں۔ ساری عمر مولویوں کے ساتھ رہا ہوں۔ ان سے پڑھا ہے اور انہی کو پڑھایا ہے۔ میری سوچ کی تعبیر اور اسے پیش کرنے کا اسلوب ان جیسا ہے۔ ان کے لیے ہے۔ اور ہونا بھی چاہئے۔ لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں کہ میرا جو فکر ہے۔ اس کی آخری حد یہی ہے۔ فکر تسلسل چاہتا ہے۔ وہ آگے جاتا ہے وہ کہیں رکھتا نہیں۔ میری فکر کی بنیاد یہ ہے کہ انسانیت عامہ کی معاشی فلاح کے حصول کے لیے مذہب کا انکار ضروری نہیں اور اشتراکیت جس غیر مذہبی انصاف و مساوات پر مبنی معاشرے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے وہ مذہب کو تسلیم کر کے بھی ممکن ہے۔ یہ ہے میرا فکر۔ میری تمام تر کوشش اپنے نوجوان کو یہ بات سمجھانے کی رہی کہ یہ ضروری نہیں کہ جس طرح میں یہ بات کہتا ہوں اسی طرح یہ ہمیشہ کہی جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی اور آئے۔ میرے فکر کے سلسلہ کو اور آگے لے جائے اور اسے آج کی زبان و اسلوب میں پیش کرے۔“^{۳۱}

مولانا آزاد کے خیال میں مسلمانوں میں دو فرد ایسے تھے جو عوام کی بہتر سیاسی و سماجی خدمت انجام دے سکتے تھے ایک خان عبدالغفار خاں اور دوسرے مولانا عبید اللہ سندھی۔ مولانا آزاد نے اس پر افسوس ظاہر کیا کہ مولانا سندھی نے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے پروگرام میں داخل کر لیا ہے۔ جس سے خطرہ ہے کہ ان کے راستہ میں بہت رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔ مثلاً جوتا پہن کر مسجد میں داخل ہونے اور نماز پڑھنے کی بات۔ یہ حضور کا فرمان ہے اور حدیث سے ثابت ہے۔ لیکن اس سے لوگوں کو مخالفت کا موقع ملا اور کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مباحات کا دائرہ وسیع ہے۔ لیکن انسان کو اپنی ذہانت سے سمجھنا چاہئے کہ کہاں کیا چیز قابل عمل ہے اور کس چیز پر عمل کرنے سے مقصد کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔^{۳۲}

مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار کا خلاصہ

اسلام کے پانچ ارکان نفس اسلام نہیں ہیں۔ لیکن ہم ان کو اسی طرح اسلام کی تمہید مانتے ہیں۔ جیسا کہ ہر سیاسی پارٹی میں شامل ہونے کے لیے چند شرطیں عائد کی جاتی ہیں۔ جب تک کوئی فرد وہ شرطیں

یا قواعد جن کی مشق کرنی پڑتی ہے مکمل نہ کرے پارٹی میں شامل نہیں ہو سکتا یا فوجی کمپنی میں نہیں لیا جاسکتا۔ اسی طرح اسلام کے لیے یہ چند شرطیں اور بنیادیں ضروری ہیں۔ انہی بنیادوں پر اسلام کی عمارت ٹھہرائی جائے گی۔ اس درجہ کی اہمیت نہایت اہم ہے۔ یہ وہی درجہ ہے جسے پرائمری ایجوکیشن کہتے ہیں اور یہ لازم اور جبری ہونی چاہئے۔ اعلیٰ تعلیم جبری نہیں ہوتی وہ استعداد کے مطابق انسان خود اپنے لیے متعین کرتا ہے۔ ہمارا اسلام یہ ہے کہ پہلے قومی اور پھر بین الاقوامی حکومت قائم کرو اور یہ دونوں چیزیں قرآن کے مطابق ہوں۔ ۳۳

قرآن مجید انسانیت کا داعی

مسلمان قرآن حکیم کو انسانیت کے لیے آخری پیام ربانی مانتا ہے۔ مولانا سندھی اس کی اس طرح تعریف کرتے ہیں کہ اس عقیدے کو آج کی ذہنیت کے قریب لانے کے لیے قرآن کریم دنیا کو انٹرنیشنل انقلاب کا پیغام دیتا ہے۔ جسے وہ ہوالذی ارسل رسولہ بالہدی و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلمہ میں مضمر دیکھتے تھے۔ ۳۴

مولانا کا خیال ہے کہ قرآن کل انسانیت کے بنیادی فکر کا ترجمان ہے۔ اور یہ بنیادی فکر عالمگیری، ازلی، ابدی و لازوال ہے۔ سارے ادیان، مذاہب اور فلسفیوں کا اصل اصول یہی فکر ہے۔ اس بنیادی فکر کو فطرت اللہ کہہ لیجئے یا اسے دین کا نام دیجئے یا اسے ضمیر انسانی سے تعبیر کیجئے۔ اسی ضمیر انسانی کی ترجمانی انبیاء، صلحاء اور حکماء کرتے آئے ہیں۔ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اصل فکر میں باہر سے کدورتیں شامل ہوتی گئیں اس لیے بار بار نئے نذیر و بشیر کی ضرورت پڑی۔ قرآن مجید اسی بنیادی فکر کا ترجمان ہے۔ قرآن کے اصولوں پر اس دنیا میں خالص انسانیت کا قیام مولانا کا عقیدہ تھا۔ ان کے نزدیک خالص اور بے میل انسانیت ہی فطرۃ اللہ کی محافظ ہے اور سچا دین اگر ہے تو یہی ہے۔ ۳۵

ان کا کہنا تھا کہ ہم پر جو قرآن کے ماننے والے ہیں فطری طور پر لازم ہے کہ تمام اقوام عالم کے سامنے ثابت کر دیں کہ انسانیت کے ہاتھ میں قرآن سے زیادہ درست اور صحیح کوئی پروگرام نہیں۔ پھر ہم پر

یہ بھی لازم ہے کہ جو لوگ قرآن کریم پر ایمان لا چکے ہیں ان کی جماعت کو منظم کیا جائے خواہ وہ کسی قوم یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ مستقبل میں ایسی جماعت ہی غالب آئے گی۔ لیکن اس کا غلبہ انتقامی شکل میں نہیں ہوگا بلکہ ہدایت و ارشاد کے طریق پر ہوگا۔ ۳۶

مولانا کا کہنا تھا کہ دنیا سے ظلم کو دور کیا جائے چاہے کسی شکل میں ہو۔ اور اسے دور کر کے قرآن کی حکومت قائم کی جائے۔ مثلاً ہمارے زمانے میں ظلم انتہا کو پہنچ چکا ہے اور عدم توازن کی وجہ سے لوگوں کا یہ حال ہے کہ اکثر لوگ غذا نہ ملنے کی وجہ سے مر رہے ہیں۔ اور صحیح تعلیم نہ ہونے کے سبب اپنے انسانی فرائض ادا نہیں کر رہے ہیں۔ انہیں اس حالت سے نکال کر ایسے حالات پیدا کرنا کہ وہ فکر معاش سے نجات پا کر اللہ کی یاد میں لگ سکیں۔ یہ ہر اس شخص کا فرض ہے جو قرآن کی تعلیم کو مانتا ہے اور یہ سب کچھ جان و مال کی قربانی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ۳۷

قرآن جو نیا نظام پیدا کرنا چاہتا ہے اس کے تحت انسانوں پر حکومت صرف اللہ کی ہوتی ہے۔ وہ ایسی حکومت پیدا کرنا چاہتا ہے جس کا مرکز اور محور صرف قرآن ہی کا قانون ہو۔ اس بین الاقوامی قانون کا نوع انسان میں چلنا ضروری ہے تاکہ نوع انسانی اپنی طبعی رفتار پر ترقی کرے۔ ان کے خیال میں قرآن کا ایمان باللہ اور جہاد فی سبیل اللہ ایک ہے۔ ایک عقیدہ ہے اور دوسرا شاہراہ عمل۔ ایک نصب العین ہے دوسرا مسلک دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ۳۸

مولانا کے نزدیک قرآن مجید کا معجزہ ہونا تو سب مسلمانوں کے لیے مسلم ہے۔ لیکن ہر گروہ کا اعجاز قرآن کے متعلق اپنا نظریہ ہے۔ فلسفی مزاج علماء اسلام نے بہت پہلے اس اعجاز قرآن کو جو صرف عربی بلاغت سے وابستہ ہے چند اہمیت نہیں دی۔ اگر ان فلسفی مزاج علماء کے اقوال کی یہ توجیہ کی جائے کہ عجمی اقوام چونکہ عربی بلاغت کے اعجاز کو کما حقہ سمجھنے سے قاصر تھیں اس لیے ان کے لیے قرآن کے اعجاز کا معیار عربی بلاغت نہیں ہو سکتا اور یہ لوگ مجبور تھے کہ اعجاز کا معیار کسی دوسری چیز میں ڈھونڈیں۔ ۳۹

قرآن مجید کا اصل اعجاز اس کی تعلیم اور انسان کی ہدایت کا وہ نظام ہے جو اس نے پیش کیا ہے۔ گویا قرآن کی علمی و عملی افادیت ہی اس کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اس سے ہر شخص خواہ وہ عربی ہو یا عجمی،

عامی ہو یا عالم، فلسفی ہو یا سادہ مزاج مستفید ہو سکتا ہے۔ اور اس کے اس اعجاز کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اگر قرآن کا اعجاز محض عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کا پابند ہو جاتا ہے تو اس صورت میں محدودے چند افراد کے سوا دوسرے لوگ اس کی خوبیوں سے محروم رہتے۔ قرآن کریم ایک انقلاب آفریں نظام کی دعوت دیتا ہے۔ خالص اور بے میل انسانیت کا قیام قرآن کا نصب العین ہے۔ اس نے اس کا راستہ دکھایا اور ایک دفعہ اسے وجود میں لا کر دکھا دیا۔^{۴۰}

مولانا کے خیال میں تمام انبیاء، صلحاء، حکماء ایک ضمیر انسانی کی ترجمانی کرتے آئے ہیں۔ مگر زمانے کے ساتھ ساتھ ان کی اصل فکر میں باہر سے کدورتیں شامل ہوتی گئی اس لیے بار بار نئے نذیر اور بشیر کی ضرورت پڑی۔ قرآن مجید اسی بنیادی فکر کا ترجمان ہے۔ اور یہ بنیادی فکر عالمگیر، ازلی، ابدی اور لازوال ہے۔ ظاہر میں بے شک اس فکر کا جامہ عربی ہے لیکن الفاظ و تراکیب کے اندر جو معانی ہیں وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔^{۴۱}

قرآن مجید میں آیا ہے شرع لکم من الدین ما وصیٰ نوحا و الذی او حینا الیک و ما وصینا بہ ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ ان اقیمو الدین ولا تتفرقوا فیہ (اس نے تمہارے دین کا وہی راستہ متعین کیا ہے جس کی نوح کو وصیت کی تھی اور اے پیغمبر جو تمہیں وحی کی ہے وہی وحی ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو ہم نے کی تھی۔ اور وہ یہ ہے کہ اسی دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ حضرت مجاہد سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے محمد ہم نے تم کو اور ان کو ایک ہی دین کی وصیت کی ہے۔ قرآن کا ایک اور ارشاد ہے ”اور یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ پھر لوگوں نے آپس میں پھوٹ ڈال کر اپنا اپنا دین جدا کر لیا اور جو جس کے پاس ہے وہ اسی سے خوش ہے۔“

مولانا کے خیال میں اسلام کی تعلیم کا لب لباب قرآن کی اس آیت ”هو الذی ارسل رسولہ بالہدیٰ و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون“ میں دیا گیا ہے۔ یعنی قرآن کا مقصد اصلی سب دینوں سے اعلیٰ دین، سب فکروں سے بلند تر فکر، یا سب سے بلند بین الاقوامی

نظریہ جو زیادہ سے زیادہ انسانیت پر مشتمل ہو پیش کرنا اور اس پر عمل کرانا ہے۔^{۴۲}

ان کا کہنا تھا کہ قرآن نے ان تمام مذاہب کو جو انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا سبب بن گئے تھے مردود قرار دیا۔ اور یہ تلقین کی کہ خدا کا سچا مذہب وہ ہے جو خدا سے زیادہ قریب ہو اور خدا سے قربت کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرقوں اور قوموں سے بالاتر ہو کر ساری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لے۔ قرآن نے تمام اقوام، ادیان اور مذاہب کے مرکزی نکات کو جو کل انسانیت پر منطبق ہو سکتے ہیں یکجا کیا اور دنیا کو یہ دعوت دی کہ صرف یہی ایک اساس ہے جس پر صحیح انسانیت کی تعمیر ہو سکتی ہے۔^{۴۳}

اصل دین یہی ہے باقی سب اس کے زرائع و وسائل ہیں جنہیں اصطلاحاً شعائر و رسوم کیا گیا ہے۔ یہ شعائر و رسوم اصل دین تک پہنچنے کے زرائع ہیں۔ ان کے وجود اور ان کی افادیت سے انکار نہیں۔ لیکن اگر یہ رسوم و شعائر بے روح ہو کر رہ جائیں اور ان سے وہ اصل مقصود حاصل نہ ہو تو پھر ان کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ قرآن مجید ان بے روح رسوم کے خلاف جہاد کی تلقین کرتا ہے۔^{۴۴}

قرآن مجید دین فطرت کا حامل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی تعلیم دیتا ہے جو انسانیت کی صحیح فطرت کی آئینہ دار اور ساری نوع انسانی کے فائدے کے لیے ہو۔ لیکن اگر قرآن کو ایک فرقہ یا ایک گروہ کی کتاب بنا دیا جائے تو پھر یہ ثابت کرنا کہ وہ ازلی وابدی ہے۔ اور اس کی تعلیمات سب کے لیے اور ہر زمانے کے لیے ہیں۔ بڑا مشکل ہے۔ قرآن کی عالمگیریت اس بنا پر ہے کہ وہ کل انسانیت کی کتاب ہے۔^{۴۵}

قرآن نے بار بار ایمان باللہ پر زور دیا ہے۔ یعنی ایمان باللہ نصب العین ہے اور انسانیت عامہ کی فلاح و بہبود اس نصب العین کو عمل میں لانے کا ذریعہ اور طریق۔ ایمان باللہ کا عقیدہ انسانیت کے لیے ایک اعلیٰ نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے اور اس دنیا میں اس سے ارفع تصور ممکن نہیں۔ اللہ کے تصور میں وحدت انسانیت اور وحدت کائنات سب آ جاتے ہیں اور ذہن کے سامنے لامحدود آفاق اور بے کنار وسعتیں واشگاف ہو جاتی ہیں۔ اللہ کا تصور سب پنہائیوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے اور کوئی بلندی اور وسعت نہیں جو اس تصور سے بلند تر اور وسیع تر سوچی جاسکے۔ صحیح خدا پرستی آگے چل کر لازماً انسان دوستی کا موجب ہوتی ہے۔ قرآن اسی خدا پرستی کی تعلیم دیتا ہے۔ جہاد بدوں کے خلاف ہوتا ہے لیکن اس سے

مقصود بدی کا استیصال ہے۔ بدی سے جنگ کرنا انسانیت عامہ کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ یہی قرآن کا ایمان باللہ اور جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ ایک عقیدہ ہے دوسرا عمل ہے۔ ایک نصب العین ہے دوسرا مسلک اور دونوں لازم و ملزوم ہیں اگر ایک ناقص ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے میں بھی کچھ کمی ہے۔^{۴۶}

ایمان باللہ اور جہاد فی سبیل اللہ ان معنوں میں ایک ایسی کسوٹی ہے جس پر ہر فرد، ہر جماعت ہر قوم اور ہر نظام و قانون کو پرکھا جاسکتا ہے۔ اور اس میں کسی رو رعایت کی گنجائش نہیں۔ ایک زمانہ میں مسلمان ان دو اوصاف کے حامل تھے۔ اسی لیے قرآن مجید نے انہیں اُمتہ وسطاً کا خطاب دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ و کذلک جعلکم امہ وسطاً لکونوا شہداء علی الناس۔ مسلمانوں کا یہ امتیاز محض اس بنا پر تھا کہ وہ ایمان باللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کو صحیح معنوں میں مانتے اور اس پر عمل کرتے تھے۔^{۴۷}

جس طرح خدا کا قانونی (تکوینی قانون) تمام کائنات میں جاری ہے اور کوئی اس میں شریک نہیں ہے۔ ویسے ہی اس کا قانون قرآن حکیم انسانی سوسائٹی (معاشرے) میں جاری کیا جائے اور تمام مصنوعی خداؤں کی خدائی ختم کر دی جائے اور بندگی صرف ایک خدا کی کی جائے۔ یعنی انسان جو کچھ سوچے اور کرے اس میں یہ سمجھے کہ خدا کے سامنے جواب دینا ہے۔ اس میں لوگوں کے دکھاوے یا کسی حاکم کے فیصلہ کو کوئی دخل نہیں۔ جب تک انسان کو یقین نہ ہو جائے کہ میرا یہ کام خدا کے سامنے پیش ہوگا تو اس وقت تک وہ اس کام کو اچھا نہ سمجھے۔ اس طرح خود کو جوابدہ سمجھنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی نوع کی یکساں خدمت کر سکے گا۔ کیونکہ وہ اصل میں اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی اس تجلی کے حوالہ کر دے گا جو انسانیت کے قلب پر پڑتا ہے۔ اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ تو یہ نوع انسانی کی ہمدردی اور خدمت کرنا ہوگی۔ یعنی قرآن کے انقلاب کا مقصد یہ ہے کہ انقلاب برپا کیا جائے جو کسی خطے یا قوم کی ضرورتیں پوری نہ کرے بلکہ سب انسانوں کی ضرورتیں پورا کرے۔^{۴۸}

بے طبقہ معاشرہ

تمام انسان خدا کے بندے ہیں۔ تمام نعمتوں سے سب کو یکساں متمتع ہونے کا حق ہے۔ مولانا معاشرہ کو غیر طبقاتی معاشرہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک جاندار معاشرہ وہ ہے جس کی بنیاد طبقات پر نہ ہو۔ یعنی ”جب کسی قوم میں انسانوں کا ایک مخصوص طبقہ تمدنی لحاظ سے بہت آگے بڑھ جائے اور دوسرے لوگ جو تعداد میں زیادہ ہوں پیچھے رہ جائیں تو پھر اس تمدن کو گھن لگ جاتا ہے اور قوم کے ایک محدود طبقہ کی اس غیر فطری ترقی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثریت تو معمولی معاش کی ضرورت کو ترستی ہے اور دولت چند ایک کے پاس مرکز ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں قوم کو روگ لگ جاتا ہے۔ افراد کی صلاحیتیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ عیش پرستی پھیلنے لگتی ہے۔ عوامی مفاد کا کسی کو خیال نہیں رہتا۔ نفسانفسی کا معاملہ ہوتا ہے۔ جب قوم ادا بار کے اس نرغہ میں گرفتار ہو جاتی ہے تو پھر انقلاب کا آنا ایک حتمی امر ہوتا ہے۔“^{۴۹}

وحدة الوجود

مولانا سندھی کا خیال تھا کہ ہندو مسلم اختلافات نے ملک کے لیے بہت سے مسائل پیدا کر دیے ہیں اور تمام کوششوں کے باوجود اس کا کوئی پائیدار حل نہیں نکل سکا ہے۔ اس لیے عملی اتحاد کے ساتھ فکری اتحاد بھی ضروری ہے۔ ان کو پختہ یقین تھا کہ ملک میں وحدة الوجود یا ویدانیت فلاسفی کی بنیاد پر اتحاد قائم کیا جاسکتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندو اور مسلمان ہمہ اوست (وحدة الوجود) کی فکر پر متحد ہو سکتے ہیں۔ اس فلسفہ کے مطابق انسانیت عامہ کے اصول پر تمام مذاہب، دھرموں اور فرقوں میں تطبیق دی جائے۔ اس طرح ایک انسان کو دوسرے انسان سے جو مذہبی نفرت اور تعصب ہے وہ ختم ہو جائے گا۔^{۵۰}

بنیادی طور پر ہندوستان میں صوفیاء کے ۴ اہم سلاسل ہیں جن کا مرکزی فکر وحدت الوجود ہے جو ویدانیت فلاسفی کا اصل اصول ہے۔ خود شاہ ولی اللہ نے اسی کی تہذیب و تکمیل سے انسانیت کی تشریح

کی اور اسے کتاب و سنت کا بطن بنایا۔ مولانا سندھی کا کہنا تھا کہ اگر دونوں مذاہب کے خدام انسانیت اسی فلاسفی کو امام بنا کر جد و جہد میں مشغول ہو جائیں تو ہند ایکبار پھر مجمع البحرین بنکر دنیا کے رہنمائی کر سکتا ہے۔^{۵۱}

مولانا کا کہنا تھا کہ شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے ساتھیوں کے خیال میں اسلام وہ معیاری حقیقت ہے جس کی بنیاد پر تمام مذاہب پر کھے جاسکتے ہیں۔ یعنی اس معنی اور مفہوم کے ساتھ وحدت الوجود میں عقیدہ رکھنے سے اسلام کی برتری کو رد کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ اس کے برعکس یہ اسلام کی برتری کو قائم رکھتا ہے۔ اور وحدت الوجود کا یہ نظریہ دوسرے مذاہب کے سلسلہ میں چند امور کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہ امور اسلام کی بنیاد ہیں۔ اور دوسرے مذاہب کا آغاز بھی انہی سے ہوتا ہے۔ یہ ایک عالمگیر مذہب کا بین الاقوامی یا خالص انسانی تصور ہے۔^{۵۲}

ان کا کہنا تھا کہ اکبر کے عہد میں نظریہ وحدت الوجود کی بنیاد پر ایک عملی نظام کی تعمیر کی کوشش کی گئی۔ لیکن اکبر اور اس کے مشیروں کی خامی یہ تھی کہ انہوں نے مذہب اور قوم کی حیثیت کو بحیثیت ایک سیاسی ہستی کے بالکل نظر انداز کر دیا۔ جس کے نتیجے میں اکبر کے دین الہی سے نہ تو مسلمانوں کو فائدہ ہوا اور نہ ہندو ہی مطمئن ہو سکے۔^{۵۳} ان کا کہنا تھا اس سلسلے میں ہندوستانی تحریک سکندر لودھی اور شیر شاہ نے شروع کی تھی۔ اکبر نے اسے اپنا مقصد حیات بنالیا۔ تحریک بنیادی طور پر صحیح تھی۔ مگر اسے چلانے والے میسر نہیں آئے اس لیے غلط راستہ پر پڑ گئی۔^{۵۴}

شاہ صاحب کے نزدیک انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے اقتصادی تعاون ایک ضروری امر ہے۔ اور ہر انسانی جماعت کو ایک ایسے اقتصادی نظام کی ضرورت ہے جو اس کی ضرورت کا کفیل ہو۔ جب قوموں کو اقتصادی ضرورتوں سے اطمینان نصیب ہوتا ہے تو پھر کہیں وہ اپنے خالی وقت میں جوان کے پاس کسب معاش کے بعد بچ رہتا ہے زندگی کے ان شعبوں کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں جو انسانیت کا اصل جوہر ہیں۔ لیکن اگر ان کی اقتصادی ضروریات ہی فراہم نہ ہوں اور ان کی وجہ سے انسانی زندگانی ہی ٹھہر کر رہ جائے تو انسانیت کے اعلیٰ مدارج کا کسے ہوش رہے گا۔

اقتصادی نظام کے درست اور متوازی ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زندگی میں انسانی اجتماع کے اخلاق تکمیل پذیر ہو سکتے ہیں۔ جب انسان کے اخلاق اس دنیا میں سدھر گئے اور تہذیب نفس کے ذریعہ اس نے اپنے اخلاق کی تکمیل کر لی تو اخلاق کی یہ تکمیل ہی اسے جنت کا حقدار بنا دے گی۔ ۵۵

شاہ ولی اللہ کے حوالہ سے مولانا کا کہنا تھا کہ کسی سوسائٹی میں عدل و انصاف اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک رزق کمانے والی جماعتوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے سے احتراز کئی نہ برتا جائے۔ اس بات کو ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکے جب تک ہم نے یورپ جا کر سوشلزم کا مطالعہ نہیں کیا۔ شاہ ولی اللہ ۱۷۷۲ء میں فوت ہوئے اور کارل مارکس ۱۸۱۸ء میں۔ اس قسم کے انقلابی پروگرام کے تمام حصے ہم نے شاہ صاحب کی کتابوں میں بہت شرح و بسط سے پڑھے جو مارکس سے بہت پہلے گزر چکے تھے۔ ۵۶

اسلام کا اولین مقصد اور دلچسپی اس دنیا میں فرد اور معاشرے کی فلاح و بہبود ہے جو وہ معاشرے کی سیاسی سماجی اور معاشی قوتوں کو ایک نئی شکل دے کر سرانجام دیتا ہے۔ اپنے معاشرے کو بہتر بنانے سے ہی انسان آخرت میں نجات حاصل کر سکتا ہے۔ ایک ایسا فرد جو صرف اپنی نجات کے لیے فکرمند ہو اور معاشرے کی روحانی و مادی بھلائی کی بالکل پرواہ نہ کرے یعنی اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی سیاسی و سماجی قوتوں کو نظر انداز کر دے وہ انسانی طرز زندگی گزارنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ۵۷

اجتماعیت

وہ طبقاتی اور گروہی معاشرہ کو انسانیت کے حق میں زہر قاتل سمجھتے تھے ان کے خیال میں حضور اکرم کی بعثت کا ایک مقصد طبقاتی معاشرہ کا خاتمہ بھی تھا۔

اسلام دین فطرت ہے اور اجتماعیت انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔ انسان فطرتاً اجتماعیت پسند ہے۔ اس لیے اسلام نے نظریہ اجتماعیت کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اور ہر اس کام کی حوصلہ افزائی کی

ہے جس میں اجتماعی رنگ ہو۔ حتیٰ کہ اسلام کا نظام عبادت اجتماعیت کی اہمیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ بلکہ بعض عبادات کو بغیر اجتماعیت قبولیت کی سند ہی نہیں ملتی۔ چنانچہ جمعہ اور عیدین کی نمازیں انفرادی پڑھی ہی نہیں جاسکتی۔ اسلام اپنے پیروکاروں میں یہ نظریہ راسخ کرنا چاہتا ہے کہ تمہاری سوچ اور عمل اجتماعی ہونی چاہئے۔ اجتماعیت کی ضد انفرادیت ہے۔ اسلام نے انفرادیت کو گمراہی قرار دیا ہے۔ جو جماعت سے کٹا جہنم اس کا ٹھکانہ ہے۔ انہوں نے کہا: ”انفرادیت پسندی کا یہ رجحان ہی ہے کہ جس نے ہمارے اہل علم کو اس طرف ڈال دیا ہے کہ وہ اسلام کی اجتماعی قوت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کا سارا زور افراد کی شخصیتوں کو اجاگر کرنے میں لگ جاتا ہے۔ چنانچہ قوموں کی زندگی اور ان کی ترقی میں اجتماعیت کو جو اہمیت حاصل ہے ہمارے اہل علم اس پر بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ مثال کے طور پر جب وہ حضورؐ کی سیرت لکھنے بیٹھتے ہیں تو مکہ کی اجتماعی زندگی، قریش کا قومی نظم و نسق، قصی کے عہد سے قریش کی تنظیم و توسیع کے حالات جن کا رسول اللہ کی بعثت اور آپ کے مشن سے گہرا تعلق ہے۔ وہ ان باتوں کو پیش نظر نہیں رکھتے۔ نہ ان کے یہاں رسول اللہ کی نبوت اور رسالت پر اس طرح غور کیا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو منظور تھا کہ ساری نسل انسانی میں سے ایک مکمل اور برتر انسان پیدا کرے۔ وہ فرد فرید اور بے مثال شخصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ ہر عالم کے سامنے سیرت نبویؐ کا بس یہی موضوع ہوتا ہے جسے وہ اپنی علمی استعداد اور مخصوص فکری رجحان کے مطابق پیش کرتا ہے“۔^{۵۸}

مولانا نے مزید کہا کہ شاہ صاحب بھی انفرادیت کی بجائے اجتماعیت پر بہت زور دیتے ہیں۔ مجھے قرآن کی اپنی تفسیر پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ چنانچہ میں نے اپنے انفرادی رجحان کے پیش نظر قرآنی تعلیمات سے پہلے جو مطالب اخذ کئے تھے ان کو اپنے ذہن سے خارج کر کے اسلامی اصولوں کی اجتماعی روح کو قائم رکھنا اپنے لیے ضروری قرار دیا۔ مجھے اس امر کا یقین ہو چکا تھا اور میں نے اس حقیقت کو خوب جان لیا تھا کہ قرآن شریف کو اس طرح (اجتماعی نقطہ نظر) سے سمجھے بغیر اسے دنیا کے اقوام کے سامنے پیش کرتا کسی طرح ممکن نہیں۔ میں اب فرد کی بجائے جماعت پر زور دیتا ہوں اور انفرادیت کے خلاف

اجتماعیت کا قائل ہوں۔ اسلام کو سمجھنے کے لیے رسول اللہ کی ذات پر تمام تر زور ڈالنے کی بجائے اس اجتماعی تحریک کو سامنے رکھنا چاہئے جو اس ذات اقدس کے ارد گرد جمع ہوتی تھی۔^{۹۵}

اسلام کو اس طرح سمجھنے سے میرے بہت سے عقیدے حل ہو گئے۔ یہ اجتماعیت اور اجتماعی فکر ہی کا اثر ہے کہ میں سورہ بقرہ کی آخری آیت لا تفرق بین احد من رسلہ سے یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ تمام انبیاء پر ایمان لائیں اور ان انبیاء میں ایک فرد اکمل ہمائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ غلطی یہ ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ کے شخصی اوصاف میں اس قدر انہماک کرتے ہیں کہ آپ کی پیدا کی ہوئی جماعت (صحابہ کرام) کی قدر و قیمت ہماری نظروں سے جاتی رہتی ہے۔ ہمارے اس تخیل کو درست کرنے کے لیے قرآن کا ایک اشارہ کافی ہے۔ سورۃ فتح میں محمد رسول اللہ کے ساتھ والذین آمنوا معہ بھی ارشاد ہے یعنی آپ کی تمام کامیابی کو آپ کا اور آپ کی جماعت کا کام بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حدیث کی کتابوں میں ایک مشہور روایت ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے ”کہ مسلمانوں کی ایک جماعت برحق رہے گی۔ اس کی تفسیر میں رسول اللہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے ”مالنا علیہ و اصحابی“ جس طریقہ پر میں اور میرے اصحاب ہوں گے اس پر چلنے والی جماعت برحق ہوگی۔^{۹۶}

ہے جو خدا سے زیادہ قریب ہو اور خدا سے قربت کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرقوں

اور قوموں سے بالاتر ہو کر انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لے۔^{۶۱}

وہ قرآن مجید کے متعلق فرماتے ہیں:- ”میں اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ

یہ کتاب (قرآن) دنیا کی تمام اقوام کو ایک انٹرنیشنل انقلاب کی دعوت دیتی ہے،

اور اس کا مقصود اصلی یہ ہے کہ تمام انسانیت کو ایک نقطہ پر جمع کر دے۔ دوسرے

الفاظ میں قرآن کے پیش نظر یہ ہے کہ دنیا کے سب دینوں سے اعلیٰ دین یعنی تمام

فکروں سے بلند تر فکر جو ساری انسانیت پر جامع ہو۔ اس کی طرف لوگوں کو بلائے۔

اور اس پر عمل کرائے۔“^{۶۲}

مولانا وحدت انسانی کیا کل کائنات کی وحدت کے قائل ہیں۔ جس طرح کائنات کی کثرت

صاحب نظر کو پریشان نہیں کرتی۔ اور وہ جانتا ہے کہ ان سب مختلف شکلوں میں ایک ہی جلوہ عکس ریز

ہے۔ اس طرح مولانا کو انسانوں کا قوموں، گروہوں اور افراد میں بٹا ہونا وحدت انسانیت کے منافی

نظر نہیں آتا۔ وہ اس تقسیم کو مٹانا غیر فطری سمجھتے ہیں۔ فرد ایک مستقل اکائی ہے۔ اور جماعت ایک

ایسی اکائی ہے جو افراد پر مشتمل ہے۔ اس طرح ایک قوم اپنی جگہ مستقل وجود رکھتی ہے اور انسانیت

سب قوموں کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ فرد کا صالح ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ وہ جماعت کا

اچھا جز ہو۔ اچھی جماعت وہ ہے جو قوم سے تضاد نہیں مطابقت رکھتی ہو اور اچھی قوم اسے کہیں گے جو

کل انسانیت کے لیے جز صالح کا حکم رکھتی ہو۔ انفرادیت ان معنوں میں کہ ہر فرد ہر جماعت اور ہر

قوم دوسرے سے برسر نزاع ہو غلط اور مردود ہے۔ مولانا وحدت انسانیت کو مانتے ہیں۔ قرآن مجید

کو اس وحدت کا شارح سمجھتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک قرآن کی تعلیمات کا مقصود یہی ہے کہ اس

وحدت کا قیام عمل میں آئے اور لوگ عقیدتاً اور عملاً موحد بن جائیں۔^{۶۳}

اسلامک اسٹیٹ

مولانا سندھی نے اپنے اس خیال کو الگ الگ پیرایہ میں زور دیکر کہا کہ وطنیت کا جذبہ اگرچہ بے شک ایک قابل قدر جذبہ ہے۔ لیکن اسلامی ممالک میں اسلام کو چھوڑ کر کوئی بنیاد قائم نہیں کی جاسکتی۔ ایک ایسی وطنیت جو مذہبیت سے عاری ہو کسی کام کی نہیں۔

اسلامی ریاست تاریخ کے کسی بھی عہد اور دنیا کے کسی بھی خطے میں جب اور جہاں قائم ہوگی اس کا دائمی نصب العین ایک ہی رہے گا جس کی صراحت اس ریاست کے دائمی اور ناقابل تغیر دستور قرآن مجید میں اس طرح کردی گئی ہے۔ کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کو اگر ہم زمین میں تمکن و حکومت ادا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ عطا کریں گے نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے دور رہیں گے۔

اس طرح اقتدار و اختیار کی قوت جب بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے گی وہ چار بڑے مقاصد کے لیے استعمال ہوگی۔

- ۱۔ اقامت صلوٰۃ کے ذریعہ خدا اور بندے کے تعلق کو مضبوط و مستحکم بنائے رکھنے کا اہتمام۔
- ۲۔ ایتاء زکوٰۃ کے ذریعہ بندگان خدا کے درمیان ایسے عادلانہ معاشی نظام کا قیام جو ظلم و استحصال کا ہر دروازہ بند کر دے اور مسلمانوں کے معاشرہ کو ایثار و اخوت، کفالت و سرپرستی اور مروت و احسان کی پاکیزہ بنیادوں پر استوار کر سکے۔ جہاں ناداری و محتاجی و محرومی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔
- ۳۔ ریاست کے جملہ افرادی و مادی مسائل اور تمام ذرائع کو نیکی پھیلانے کی جدوجہد میں لگا دینے کا اہتمام۔

- ۴۔ ہر ممکن ذریعہ سے اور اقتدار و اختیار کی پوری قوت کے ساتھ بدی کو مٹانے کی کوشش۔
- مولانا کے خیال میں یہ چار مقاصد بھی درحقیقت ایک ہی مقصد کی تکمیل کے لیے چار بنیادی ضروریات ہیں اور مقصدیت ایک ایسے معاشرہ کا قیام جو روحانی اعتبار سے انتہائی مستحکم ہو۔

تصوف

مولانا کا کہنا تھا سلوک کے تمام راستے میرے دیکھے بھالے ہیں لیکن آخری حد تک پہنچنے کے بعد میں نے یہ راستہ ترک کر دیا۔ میرے مرشدوں کا ارادہ تھا کہ اشغال طریقت کی تکمیل کے بعد وہ مجھے خرقہ خلافت سے سرفراز کریں گے لیکن میری طبیعت کو سلوک و طریقت سے ایسی مناسبت نہ تھی۔ میرے لیے دوسرے کاموں کی اہمیت تھی میرا ذوق سراسر سیاسی یا علمی تھا۔^{۶۴}

شاید ان کا خیال تھا کہ تمام صوفیاء روایات و آداب ان اصلاح کاروں کی راہ میں ہمیشہ سے حائل رہے ہیں جو خالص اسلامی تعلیمات کو بحال کرنے کے خواہشمند ہیں۔ اس لیے کہ اصلاح کا فرد کی بجائے معاشرہ کے سیاسی و سماجی نظام کی اصلاح اور تعمیر نو میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور تصوف دنیاوی معاشرت یا ان سیاسی و سماجی قوتوں میں جو انسانی مقدر پر حکمراں ہیں دلچسپی نہیں رکھتا۔ تصوف کا بنیادی مقصد فرد کی اصلاح اور آخرت میں اس کی نجات ہے۔ اس کے علاوہ تصوف قناعت، تحمل اور اصلاح پذیری کی تلقین ہے۔ صوفیاء کے یہاں خدا کی عبادت بھی جمالیاتی سرور حاصل کرنے کی کوشش ہے۔ ایسی خوابیاں مثلاً جوش و خروش، اعلیٰ مقاصد کا حصول، حب الوطنی اور اپنے ساتھیوں کی مادی و اخلاقی بھلائی میں عملی دلچسپی کا اظہار تصوف کے جذبے کے خلاف ہے۔ اپنے معاشرے کی تعمیر نو کے لیے انقلابی جوش و خروش کو ایک صوفی کس طرح جب خدا میں شامل کر سکتا ہے۔

مولانا نے یہ بات بھی باصراحت کہی کہ تصوف کے طریقوں پر چلنے سے انسان میں قوت برداشت، صبر اور استقلال کی عظیم قوت پیدا ہوتی ہے۔ اور ایک انقلابی کے لیے تصوف کے منازل طے کرنا لازمی ہے۔^{۶۵}

ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو اپنی مادی ترقی، معاشی تنظیم کے لیے مغرب کی صنعت اور جمہوریت سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ لیکن مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام ہمارے مسائل کا حل نہیں۔ سرمایہ داری نظام کو توڑ کر ایسا منصفانہ اور عادلانہ اقتصادی نظام قائم کرنا چاہئے جو محنت کشوں کی فلاح کا ضامن ہو۔ یورپین

ازم اور فلسفہ ولی اللہی کو بیک وقت قبول کرنے سے ہندوستانی مسلمان اپنی دنیا بہتر کر سکتے ہیں اور اپنے دین کو بھی بچا سکتے ہیں۔ اگر وہ یورپ کی معاشی اور مادی تنظیم قبول نہ کریں گے تو حسۃ الدنیا کا حصول ممکن نہیں۔ اسلام محض حسۃ فی الآخرة نہیں ہے۔ دونوں کا جامع ہے۔^{۶۶}

ان کا کہنا تھا کہ یہ مادی نظام سارے کا سارا محض یورپ کی اپنی تخلیق نہیں ہے۔ ہزار ہا سال سے انسان دنیائے اسباب کی تسخیر کے لیے تگ و دو کرتا چلا آ رہا ہے۔ ہر قوم نے اپنے وقت میں تسخیر کے اس عمل کو آگے بڑھایا۔ اس وقت اسباب کی دنیا میں یورپ سب سے آگے ہے۔ اس لیے ہمیں یورپ کی سائنس، اس کی تنظیم و صنعت کو اپنانا ہوگا۔ اگر خدا نخواستہ اگر ہم نے یہ نہیں کیا۔ تو ہمارا وجود اس دنیا میں باقی نہیں رہیگا اور ہم ریت کے زروں کی طرح ہوا میں اڑتے نظر آئیں گے۔ ملک کی آزادی کے ساتھ ساتھ مشین کا دور دورہ ہوگا اور یہ مشین ایک نئے ذہن کو جنم دے گی جسے تمہارے پرانے طریقے اور قدیم روایات زیادہ دیر تک مطمئن نہیں رکھ سکیں گی۔ مشین کا آنا لازمی ہے وہ ایک نیا دین اور نیا معاشرہ پیدا کرے گی۔ اگر تم اس دین اور اس معاشرہ کو اسلامیت سے وابستہ رکھنا چاہتے ہو تو نئے دور کے نئے تقاضوں کے اسلامی حل تلاش کرو۔ مشین کو حسۃ فی الدنیا کے ساتھ حسۃ فی الآخرة کا ذریعہ بھی بناؤ۔^{۶۷}

وہ چاہتے تھے کہ مسلمان میدان عمل میں آئے اور دنیا کی رہبری کرے جن کا انہیں یقین تھا۔ کیونکہ ان کے خیال میں قدرت نے اسے ایسی صلاحیتیں دی ہیں کہ وہ دنیا کی تمدنی، تہذیبی اور کئی دوسرے لحاظ سے دور آ خر کا وارث ہو۔ مسلمانوں کا مذہب اور عقائد خود انقلاب آفریں ہیں۔ بشرطیکہ مذہب کا صحیح تصور دل میں جاگزیں ہو جائے۔

سیاسی منشور

ہندوستان کو آئینی مراعات دینے کی سفارش کرنے کی غرض سے انگلستان کی کنزرویٹو حکومت نے ۱۹۲۷ء میں سر جان سائمن کی سرکردگی میں ایک وفد ہندوستان بھیجا تھا جس کے تمام اراکین انگریز

تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ نے وفد سے عدم تعاون کا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں اس وفد کا ہر جگہ مقاطعہ کیا گیا اور یہ وفد اپنے مقاصد میں ناکام ہوا۔ جس کے بعد ہندوستان کی تمام پارٹیوں نے متفقہ طور پر ایک کمیٹی تشکیل دی جس کا سربراہ پنڈت موتی لال نہرو کو بنایا گیا۔ جنہوں نے ۱۹۲۸ء میں دستوری سفارشات پیش کیں۔ جس میں ہندوستان کے لیے ڈومنین اسٹیٹس کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

مولانا سندھی نے ۱۹۲۷ء میں آزادی کامل کا مطالبہ کیا تھا۔ تاکہ غیر ملکی اقتدار ختم ہونے کے بعد ملک میں سروراج ”سب کا راج“ یا موجودہ عوامی اصطلاح میں جسے عوامی حکومت کا نام دیا جاسکتا ہے قائم ہو سکے۔

مولانا سندھی جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان کے تین قدرتی حصے قرار دیتے ہیں:

۱۔ شمال مغربی حصہ:- جس میں صوبہ سرحد، پنجاب سندھ اور بلوچستان ہیں اور اسی میں کشمیر کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

۲۔ مشرقی حصہ:- جو آسام اور بنگال پر مشتمل ہے۔

۳۔ جنوبی حصہ:- جس میں ہندو اکثریت کے صوبے مدراس، بمبئی، اڑیسہ، سی پی (موجودہ مدھیہ پردیش) شامل ہیں انہوں نے یوپی و بہار کے ہندو اکثریت کے صوبے بھی اسی میں شامل کر دئے ہیں۔^{۶۸} ۱۹۴۶ء میں برٹش کابینہ مشن نے ہندوستان کا سیاسی بحران ختم کرنے کی غرض سے صوبوں کے اس طرح تین گروپ بنائے تھے۔

گروپ (الف) :- ہندو اکثریت کے صوبے یوپی، بہار، اڑیسہ، بمبئی، مدراس اور سنٹرل پروونس۔

گروپ (ب) :- شمالی مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریتی صوبے سرحد، پنجاب اور سندھ (کابینہ وفد نے بلوچستان اور کشمیر کا نام حذف کر دیا تھا)

گروپ (ج) :- مشرقی ہندوستان کے مسلم اکثریت کے صوبے بنگال اور آسام۔

کینویشن کی سفارشات میں کہا تھا کہ یہ تینوں گروپ اپنی جگہ آزاد ہوں اور یہ مل کر ایک وفاق

میں شامل ہو جائیں۔ وفاقی حکومت میں ہندو اور مسلمان نمائندوں کی تعداد مساوی ہو۔

مولانا سندھی نے اپنے پیش کردہ دستور میں کہا تھا کہ ہر گروپ کا سرکاری مذہب وہاں کی آبادی کا سرکاری مذہب قرار دیا جائے گا۔ لیکن وفاقی حکومت بالکل سیکولر اور غیر جانبدار رہے گی۔ اسے مذہبی معاملات میں مداخلت کا حق صرف اس صورت میں دیا جائے گا جب مذہب پارٹی کے اقتصادی نظام یا اجتماعی اصولوں کے خلاف ہو۔ ۶۹۔

کابینہ وفد نے آبادی کے تناسب سے ہر دس لاکھ باشندوں کا ایک نمائندہ مرکزی اسمبلی میں بھیجنے کی تجویز پیش کی تھی۔ مگر مولانا سندھی نے مرکزی اسمبلی میں ان تینوں گروپس کو اپنی آبادی کے تناسب کے علاوہ اپنے اقتصادی وسائل، تمدنی برتری اور فوجی اہمیت کی اساس پر نمائندے بھیجنے کی تجویز رکھی تھی۔ ان کے پیش کردہ نظام میں پارٹی کارکن کا معیار زندگی ایک عام کسان کے معیار زندگی سے بلند نہیں ہوگا۔ وہ عوام اور خواص میں تفاوت ختم کرنا چاہتے تھے۔ غریب اور امیر کے درمیان کے تفاوت کو ختم کرنے کے لیے مولانا سندھی نے فرمایا کہ ان کی پارٹی کے اراکین اپنی ضرورت سے زیادہ آمدنی اور فاضل جائیداد پارٹی کو دیدیں گے۔ ۷۰۔

پروفیسر محمد اسلم کے خیال میں مولانا سندھی کا یہ منشور قرآن حکیم کی آیت:-

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرة ۲۱۹) کے عین مطابق ہے۔

وہ زمیندارانہ نظام کو ختم کرنے کے حق میں تھے ان کی یہ رائے تھی کہ زمین قومی ملکیت قرار دی جائے۔ اس طرح موجودہ استبدادی زمیندارانہ نظام ختم ہو جائے گا۔ اس کے حق میں وہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے فیصلے اور امام اعظم امام ابوحنیفہ کے فتویٰ سے استدلال کرتے تھے۔ مولانا سندھی کے منشور میں یہ شق شامل تھی کہ زمینداروں کو حضرت عمر کے فیصلے کے مطابق زمینوں کی ملکیت چھوڑنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اور امام ابوحنیفہ کے فتویٰ کے مطابق مزارعات ختم کر دی جائیں گی۔ ایک کاشتکار کے پاس صرف اتنی ہی زمین رہنے دی جائے گی جس پر وہ خود کاشت کر سکے۔ مولانا سندھی نے امیروں پر پچاس فیصد ٹیکس لگانے کی تجویز پیش کی تھی۔ جیسا کہ عمر فاروق نے

حضرت عمرو بن العاص سے نصف جائداد بیت المال کے لیے لے لی تھی۔^۱

ان کا کہنا تھا کہ ان کی پارٹی برسر اقتدار آ کر تمام کارخانے قومی ملکیت میں لے لے گی۔ اور قومیاے ہوئے کارخانے مزدوروں کی انجمنیں چلائیں گی اور انہیں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے صلے میں منافع سے بونس دیا جائے گا۔ ان کے منصوبے کے مطابق اگر ان مزدوروں کو منافع سے حصہ دیا جائے گا تو وہ دل لگا کر کام کریں گے اور پیداوار بڑھائیں گے۔ مولانا کی سروراجیہ پارٹی مزدوروں کو رہنے کے لیے صاف ستھرے مکان اور مفت طبی امداد فراہم کرنے کی پابند ہوگی اور ان کے بچوں کو مڈل تک مفت تعلیم دینے کی پابند ہوگی۔^۲

مولانا سندھی زمین کی ملکیت منفرد اشخاص کو دینے کے مخالف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ فتح ایران کے بعد عرب فاتحین نے ایران کو اپنی ذاتی ملکیت مان کر جب وہاں کی زمینوں پر اس بنا پر قبضہ کرنا چاہا کہ یہ زمینیں انہوں نے اپنی قوت بازو سے حاصل کی تھیں تو حضرت عمر نے ان کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ ساری ارضیات کو بیت المال کی ملکیت قرار دیا اور فاتحین کو صرف ان زمینوں پر کاشت کا حق عطا فرمایا۔^۳

اسلامی دور حکومت میں زمین کی ملکیت کے بارے میں عام رجحان یہ رہا ہے کہ وہ ریاست کی ملکیت ہیں۔ اور حکومت کو اس پر تصرف کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے۔ برنی کے حوالہ سے ڈاکٹر حبیب اللہ کی رائے ہے کہ ریاست کاشتکار سے مقررہ خراج کے ساتھ کاشت میں انہماک کا بھی مطالعہ کرتی تھی۔ اور اپنے لیے یہ اختیار محفوظ رکھتی تھی کہ اگر وہ اپنے فرائض کی انجام دہی سے قاصر رہتا ہے تو ریاست اس سے زمین کا انخلا کر سکتی ہے۔^۴

خود ہندوستان میں غیر مسلم مفتوحین جو حکومت کے خلاف بغاوتوں میں شریک تھے ان کی مملوکہ ارضیات پر ریاست کا حق ملکیت و تصرف قائم ہو گیا۔ اس حالت میں اراضی پر ریاست کی بالادستی فقہ حنفی کے تحت تقریباً متفق علیہ ہے۔ قاضی محمد اعلیٰ تھانوی متوفی ۱۱۵۸ھ اور شاہ عبدالعزیز متوفی ۱۲۳۹ھ نے بھی اسی رائے کی پیروی کی ہے۔^۵

سودی نظام

وہ سودی نظام حکومت کو بھی ظلم و استبداد کی ہی ایک صورت سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی پارٹی برسرِ اقتدار آ کر سودی کاروبار ختم کر دے گی۔ اور محنت کشوں کے پرانے قرضے بے باق کر دے گی۔^۶ یہ نبی رحمتؐ کے خطبہ حجۃ الوداع کی صدائے بازگشت تھی جن میں آپؐ نے فرمایا تھا تمام سود باطل ہیں۔

انڈین نیشنل کانگریس

شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی روشنی میں مولانا نے جو پروگرام وضع کئے تھے ان کے مد نظر انہوں نے مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس کے ممبر بننے کا مشورہ دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر غیر ممالک میں ایک ہندوستانی کو خود کو متعارف کرانا ہو تو اس کے لیے کانگریس بہترین عنوان ہے۔ کانگریس کی طاقت کا اصل اندازہ باہر ہی ہوتا ہے۔

وہ کانگریس کے شاندار ماضی کے پیش نظر اسے بہت اہمیت دیتے تھے۔ وہ اس لیے بھی کانگریس کے حامی تھے کہ انڈین نیشنل کانگریس میں ایسی پارٹیاں موجود تھیں جن کا پروگرام خاص معنوں میں انقلابی تھا۔ اور وہ ملک کی سیاست میں اپنی منشاء کے مطابق انقلاب لانا چاہتے تھے۔

ان کی سوچ تھی کہ کانگریس کی عدم تشدد کی پالیسی کو اس وقت تک اپنانا چاہئے جب تک یہ یقین نہیں ہو جاتا کہ ہم اپنی آزادی لڑائی کے ذریعہ حاصل کر سکتے ہیں۔ عدم تشدد کا اصول تیاری کے لیے بہترین مثال ہے۔ اس پر استقلال کے ساتھ عمل پیرا ہونا چاہئے۔ ان کے خیال میں یہ فکر گاندھیائی فلسفہ کی پابند نہیں بلکہ اس کی بنیاد رسول اکرمؐ کی تیرہ سالہ مکی زندگی پر ہے۔

انہوں نے اپنی تقاریر، صدارتی خطبوں اور مجلسوں کی گفتگو میں یہ بات بار بار زور دیکر کہی کہ مسلمانوں کو اپنے اور مستقبل میں اسلام کے مفاد کی خاطر انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جانا چاہئے۔ اور کانگریس سے اپنا پروگرام منوالینا چاہئے۔ گو کہ کانگریس مولانا کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔ ان

کے خیال میں مسلمانوں کی کانگریس سے دوری نے اسے گاندھیائی فلاسفی کے پیروکاروں کی جماعت بنا دیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ کانگریس کو مذہبی تصورات سے پاک کر کے خالص نیشنلسٹ پارٹی بنایا جائے۔ اور مسلمانوں کو مذہبی تعصبات سے الگ ہو کر قومی اور ملکی خدمت کے میدان میں عامۃ الخلائق کے فائدہ کے کاموں میں سرگرم ہو جانا چاہئے۔

ان کا خیال تھا کہ اگر مسلمان ہندوؤں کے ساتھ ملکر کام کرنے میں ناکام ہوئے اور فرقہ وارانہ سیاست ترک نہ کی اور مذہبی رنگ میں الگ کام کرتے رہے اور ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس کا درجہ حاصل ہو گیا تو ہندو فرقہ پرستوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا جو حال ہو گا اس کا تصور بھی لرزہ خیز ہے۔ انہوں نے یہ بات ۱۹۴۲ء میں دارالرشاد (گوٹھ پیر جھنڈا) میں کہی تھی۔ مولانا نے اکثر زور دیکر کہا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو بیرونی مسلمانوں سے مدد کی کوئی امید نہ رکھنی چاہئے۔ وہ دوسروں پر بھروسہ کرنے کی غلطی نہ کریں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی طاقت اپنے میں تلاش کرنی چاہئے۔ انہیں ہندوؤں کی اکثریت سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ صحیح پروگرام کی بدولت اقلیت اکثریت پر راج کر سکتی ہے۔ انہیں اس کا افسوس تھا کہ ۱۹۴۲ء کے بعد سے کانگریس سے ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف اشتراکی رجحان رکھنے والے لوگ الگ ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اگر کانگریس جلد ہی رجعت پسندی کے اثرات سے آزاد نہ ہوئی تو بد قسمتی سے ملک کو بہت بُرے دن دیکھنے پڑیں گے۔

سنہ ہندی

مولانا عبید اللہ سندھی ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملوں سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم اور نیا دور شروع کرتے ہیں۔ ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملوں کا آغاز ۱۰۰۰ء سے ہوتا ہے۔ مولانا سندھی اس وقت سے ہندوستان کا نیا کلینڈر شروع کرتے ہیں۔ جسے وہ سنہ ہندی کا نام دیتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ قوموں کی تربیت اور سیرت کی تکمیل میں اس قسم کے اختیارات کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اقبال شیدائی مولانا احمد علی

لاہوری، اور مولانا محمد وفائی کے نام اپنے خطوط میں مولانا نے یہی سنہ اختیار کیا ہے یعنی ۱۰/ اکتوبر ۱۹۴۰ء۔
ہندی اور یکم مئی ۱۹۴۲ء ہندی۔ سنہ ہندی کا استعمال انہوں نے حجاز کے قیام کے دوران شروع کیا تھا۔

مآخذ و حواشی

- ۱۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ شخصیات۔ ص ۲۲۲
- ۲۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ برہان ۱۹۴۵ء۔ ص ۱۹۵
- ۳۔ ابوسعید غلام مصطفیٰ قاسمی۔ شذرات۔ رسالہ الولی۔ اگست ۱۹۹۶ء۔ ص ۶
- ۴۔ عبید اللہ سندھی۔ رسالہ الرحیم ستمبر ۱۹۶۵ء۔ ص ۲۶
- ۵۔ شیخ محمد اکرام۔ عبید اللہ سندھی دیوبندی۔ موج کوثر۔ ص ۳۴۵
- ۶۔ شاہ ولی اللہ۔ حجۃ اللہ البالغہ حصہ اول۔ ص ۲۱
- ۷۔ مسعود عالم ندوی۔ مکاتیب سلیمانی۔ ص ۱۶۹
- ۸۔ شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر۔ ص ۳۴۵
- ۹۔ شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر۔ ص ۳۴۶
- ۱۰۔ محمد امین کھوسو۔ ایک آدمی سونے جیسا۔ ص ۴۰
- ۱۱۔ شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر۔ ص ۳۴۹
- ۱۲۔ عبید اللہ سندھی۔ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک۔ ماہنامہ برہان۔ مئی ۱۹۴۲ء۔ ص ۳۲۵
- ۱۳۔ مسعود عالم ندوی۔ مولانا سندھی افکار و خیالات پر ایک نظر۔ ص ۱۶/ الف

- ۱۴۔ محمد سرور۔ عبید اللہ سندھی کا مکتبہ فکر۔ ماہنامہ الرحیم۔ جون ۱۹۶۵ء۔ ص ۱۴
- ۱۵۔ مسعود عالم ندوی۔ مکاتیب سلیمانی۔ ص ۱۷۹
- ۱۶۔ محمد سرور۔ مولانا سندھی کا مکتبہ فکر۔ الرحیم۔ جون ۱۹۶۵ء۔ ص ۱۵
- ۱۷۔ منظور احمد نعمانی۔ اداریہ الفرقان۔ شاہ ولی اللہ نمبر۔ ص ۴
- ۱۸۔ محمد سرور۔ مولانا عبید اللہ سندھی حیات و افکار۔ ص ۴
- ۱۹۔ دہلطف خالد۔ نواعترال کے بعض پہلو۔ ترجمہ نذیر حسین۔ رسالہ فکر و نظر، اسلام آباد۔ ص ۲۱۵
- ۲۰۔ دہلطف خالد۔ نواعترال کے بعض پہلو۔ ترجمہ نذیر حسین۔ رسالہ فکر و نظر، اسلام آباد۔ ص ۲۱۵
- ۲۱۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۲۱۶
- ۲۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۲۱۶
- ۲۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۲۱۷
- ۲۴۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۲۱۷
- ۲۵۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۲۱۷
- ۲۶۔ قاضی محمد جاوید۔ سرسید سے اقبال تک۔ ص ۱۹۵
- ۲۷۔ سعید احمد اکبر آبادی۔ تبصرہ پر تبصرہ۔ رسالہ برہان۔ اپریل ۱۹۴۵ء۔ ص ۲۱۲
- ۲۸۔ ابوعمار زاہد الراشدی۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ مقالات مرتبہ ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ ص ۷۵
- ۲۹۔ قاضی جاوید۔ سرسید سے اقبال تک۔ ص ۱۸۹
- ۳۰۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۹۰
- ۳۱۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۹۹
- ۳۲۔ شاہ محمد عثمانی۔ ٹوٹے ہوئے تارے۔ ص ۶۴
- ۳۳۔ ابوسعید غلام مصطفیٰ قاسمی۔ افادات مولانا سندھی۔ رسالہ الولی۔ اگست ۱۹۹۴ء۔ ص ۳۴
- ۳۴۔ عبید اللہ سندھی۔ شعور و آگہی۔ مرتبہ مطلوب علی زیدی۔ ص ۳۱

- ۳۵۔ محمد سرور۔ مولانا عبید اللہ سندھی تعلیمات و سیاسی افکار۔ ص ۴۴-۴۵
- ۳۶۔ شیخ عبدالعزیز۔ عبید اللہ سندھی۔ رسالہ خدام دین امام انقلاب نمبر، لاہور۔ ص ۱۹۶
- ۳۷۔ عبید اللہ سندھی۔ قرآنی جنگ انقلاب۔ رسالہ خدام دین امام انقلاب نمبر، لاہور۔ ص ۱۹۵
- ۳۸۔ عبید اللہ سندھی۔ قرآنی دستور انقلاب۔ رسالہ خدام دین انقلاب نمبر، لاہور۔ ص ۱۹۸
- ۳۹۔ عبید اللہ سندھی۔ شعور و آگہی۔ مرتبہ سید مطلوب علی زیدی۔ ص ۲۵
- ۴۰۔ عبید اللہ سندھی۔ مرتبہ سید مطلوب علی زیدی۔ شعور و آگہی۔ ص ۵۷
- ۴۱۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۵۷
- ۴۲۔ محمد سرور۔ تعلیمات مولانا عبید اللہ سندھی۔ ص ۲۹
- ۴۳۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۳۱
- ۴۴۔ محمد سرور۔ تعلیمات مولانا عبید اللہ سندھی۔ ص ۳۱-۳۲
- ۴۵۔ عبید اللہ سندھی۔ شعور و آگہی۔ مرتبہ سید مطلوب علی زیدی۔ ص ۲۲
- ۴۶۔ محمد سرور۔ مولانا سندھی کا مکتبہ فکر۔ رسالہ الرحیم، جون ۱۹۶۵ء۔ ص ۵۸۸
- ۴۷۔ محمد سرور۔ عبید اللہ سندھی حیات و تعلیمات۔ ص ۵۴
- ۴۸۔ شیخ عبدالعزیز۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ خدام دین امام انقلاب نمبر۔ ص ۱۹۸
- ۴۹۔ سید مطلوب علی زیدی۔ شعور و آگہی۔ ص ۳۵
- ۵۰۔ محمد امین کھوسو۔ عبید اللہ سندھی کے ارشادات۔ ص ۴۳
- ۵۱۔ محمد امین کھوسو۔ عبید اللہ سندھی کے ارشادات۔ ص ۴۳
- ۵۲۔ محمد خالد دیپلف۔ نواعتز ال کے چند پہلو۔ رسالہ فکر و نظر، اسلام آباد۔ ص ۲۶۸
- ۵۳۔ محمد سرور۔ عبید اللہ سندھی، حیات و افکار۔ ص ۳۰۹
- ۵۴۔ مکتوب مولانا عبید اللہ سندھی بنام مفتی عتیق الرحمن عثمانی۔ مکتبہ عبید اللہ سندھی۔ ص ۴۳
- ۵۵۔ عبید اللہ سندھی۔ شاہ ولی اللہ ایک اجمالی تعارف۔ رسالہ الرحیم۔ جون ۱۹۶۳ء۔ ص ۲۲-۲۳

- ۵۶۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۲۳
- ۵۷۔ عبید اللہ سندھی۔ شعور و آگہی۔ مرتبہ سید مطلوب علی زیدی۔ ص ۹۸-۹۹
- ۵۸۔ عبید اللہ سندھی۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ۔ ص ۱۴۶
- ۵۹۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۴۸
- ۶۰۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۴۸
- ۶۱۔ عبید اللہ سندھی۔ شعور و آگہی۔ مرتبہ سید مطلوب علی زیدی۔ ص ۳۱
- ۶۲۔ عبید اللہ سندھی۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ۔ ص ۱۵۲
- ۶۳۔ عبید اللہ سندھی۔ شعور و آگہی۔ مرتبہ سید مطلوب علی زیدی۔ ص ۳۲-۳۳
- ۶۴۔ محمد دین وفائی عبید اللہ سندھی، حیات و افکار۔ ص ۸۱
- ۶۵۔ محمد دین وفائی۔ عبید اللہ سندھی، حیات و افکار۔ ص ۳۲
- ۶۶۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۴۹
- ۶۷۔ محمد سرور۔ رسالہ الرحیم۔ اکتوبر ۱۹۹۴ء۔ ص ۴
- ۶۸۔ محمد دین وفائی۔ عبید اللہ سندھی، حیات و افکار۔ ص ۸۴
- ۶۹۔ پروفیسر محمد اسلم۔ انقلابی و سیاسی دستور۔ مجموعہ مقالات یوم مولانا سندھی۔ ص ۱۲۶
- ۷۰۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۲۶
- ۷۱۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۲۶
- ۷۲۔ عبید اللہ سندھی۔ سروراجیہ پارٹی کا پروگرام۔ عبید اللہ سندھی کا انقلابی منصوبہ۔ ص ۵۲-۵۳
- ۷۳۔ ظفر حسن۔ آپ بیتی، حصہ دوم۔ ص ۳۳
- ۷۴۔ ملکیت زمین اسلامی عہد میں۔ سالہ تاریخ و سیاست۔ جولائی ۱۹۵۱ء۔ ص ۷۹
- ۷۵۔ ایضاً ایضاً ایضاً ص ۷۸
- ۷۶۔ عبید اللہ سندھی۔ سروراجیہ پارٹی کا پروگرام۔ عبید اللہ سندھی کا انقلابی منصوبہ۔ ص ۵۳

باب دوازدهم

امالی تصنیفات

ہر تحریر اپنے مصنف کے ذہن مزاج، فکر، عقیدہ، دلی کیفیات و جذبات کی مظہر ہوتی ہے۔ مصنف نے جس ماحول میں زندگی گزاری ہے اور حالات کے جبر نے اس کو جن کیفیات سے گزرنے پر مجبور کیا ہے اس کی تصنیفات ان سب کا صحیح مرقع ہوتی ہیں۔ مصنف کے عزائم اور منصوبوں کی صحیح اور منہ بولتی تصویر اس کی تصنیف ہی ہوتی ہے۔ مصنف کو جن موانع اور دشوار گزار وادیوں سے گزرنا پڑا ہو اس کا پرتو اسکی تصانیف میں صاف دیکھا جاسکتا ہے۔

مولانا سندھی نے بہت ناہموار حالات میں اپنی زندگی کے مختلف مراحل طے کئے۔ محنت شاقہ، حالات کی ابتری و ناسازگاری اپنی بے بضاعتی اور بے سروسامانی کے باوجود اپنے مقصد کے حصول کے لئے جہد مسلسل کے لئے ان کے سامنے ایسے مخلص علماء کی مثال تھی جو اپنے مقصد پر قربان ہو گئے۔

وہ شروع ہی سے مجاہدانہ جذبات و عزائم کے حامل تھے۔ یہ بات انکو اپنے مرتبی اور شیخ طریقت مولانا سید محمود تاج امروٹی اور اپنے استاد شیخ الہند مولانا محمود حسن سے وراثت میں ملی تھی۔

مولانا عبید اللہ عہد حاضر کے شارحین حکمت ولی اللہی میں ایک اہم اور بلند مقام رکھتے ہیں۔ اور انہوں نے اپنی ساری زندگی حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ علمی کے علوم اور ان کی حکمت کے مطالعہ اس پر عمق اور پیہم غور و فکر کرنے اور اس کی مسلسل تعلیم و تلقین اور نشر و اشاعت میں صرف کردی۔ انہوں نے خود کو شاہ ولی اللہ کے افکار میں فنا کر دیا تھا۔

علامہ شوکانی کے حوالہ سے مولانا ابوالحسن علی ندوی نے تحریر کیا ہے کہ ”علامہ شوکانی نے علوم اسلامیہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ علم ہے جو پکا اور جل گیا، ایک وہ علم ہے جو پکا لیکن جلا نہیں۔ اور ایک علم وہ ہے جو نہ پکا نہ جلا۔“

تو جس علم کو کہتے ہیں کہ پکا پختگی کو پہونچا اور جل گیا۔ ان کے خیال میں یہ مذمت کی نہیں بلکہ اس کے کمال کا اظہار ہے کہ اپنے نقطہ ارتقاء کو پہونچ گیا۔ وہ علم نحو ہے اور علم حدیث کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے کہ اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں۔ نحو میں بھی اب قیل و قال کی گنجائش نہیں۔ جہاں تک حدیث و روایت اور جال کا تعلق ہے وہ بھی اس میں شامل ہے۔

وہ علم جو پکا لیکن جلا نہیں وہ علم فقہ ہے۔ کہ جب تک نسل انسانی باقی ہے اور دنیا میں تغیر کا عمل جاری ہے اور جب تک انسانی زندگی میں تنوع اور اس کے غیر محدود مطالبات موجود ہیں اس وقت تک فقہ کو مکمل نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں تمام مسائل کی تدوین ہو چکی۔ اجتہاد کا دروازہ بہر حال کھلا رہے گا۔

جو علم پکا بھی نہیں اور جلا بھی نہیں وہ علم تفسیر ہے۔ کیونکہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کے علم و کلام سے ہے انسانی زندگی، کائنات، تمام بنی نوع انسان ان کی ضروریات اور ان کی فطرت سے ہے اس لئے اس کی تحدید نہیں کی جاسکتی کہ کسی کا پورا جواب دے دیا گیا ہے۔ کیونکہ علم تفسیر میں برابر اس کی گنجائش رہی ہے کہ لوگ پیدا ہوتے رہیں اور اضافہ کرتے رہیں۔ تفسیر کو کسی زمانی اور مکانی رقبہ یا علم انسانی کے رقبہ سے مقید اور محدود نہیں کر سکتے۔ اس لئے کسی نے دعویٰ نہیں کیا کہ قرآن شریف میں اب غور و فکر کی گنجائش نہیں،۔!

مولانا علی میاں کا بیان ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی غیر معمولی طور پر ذہین و ذکی واقع ہوئے تھے۔ پر لے درجہ کے انگریز اور استعمار دشمن تھے۔ شیخ الہند نے ان کے ذہن کو اتنا متاثر کیا اور ان کے ذہن کو جہاد حریت، احیائے خلافت و حکومت الہی و حصول آزادی اور انگریز دشمنی کی طرف ایسا موڑا کہ ان کو تمام قرآن مجید جو شروع سے ان کی دلچسپی اور مطالعہ کا مرکز تھا۔ اسی کی تفسیر اور اسی کی دعوت و تبلیغ نظر آنے لگا۔ ان کی ذہانت اور نکتہ آفرینی نے اس کی آیات اور اشارات سے وہ کام لیا

کہ ان کو اپنے ہر دعویٰ کی تائید قرآن مجید ہی میں نظر آنے لگی۔ اور انہوں نے اس سے اجتماعی و سیاسی زندگی کے ایسے ایسے اصول و کلیات وضع کئے جن کا کسی قدیم تفسیر میں نشان ملتا ہے نہ کسی جدید تفسیر میں۔ یہ طرز استنباط اور یہ طریقہ تفسیر صوفیائے کرام کے تفسیری لطائف اور متصوفانہ نکات سے بہت ملتا ہے۔ جس کے نمونے شیخ اکبر کی فتوحات مکیہ، علامہ مہائمی کی تبصیر الرحمن اور علامہ ہقی کی تفسیر روح البیان میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اور اگر وہ حد اعتدال سے متجاوز نہ ہوں تو یہ دور کے علماء نے اس میں ہرج نہیں سمجھا ہے۔^۱

مولانا سندھی تفسیر میں ایک خاص طرز کے مالک تھے۔ جن کو انکے شاگرد مولانا احمد علی تفسیر کی بجائے الاعتبار والتاویل ہی کے نام سے یاد کرنا پسند کرتے تھے۔^۲

قرآن کے بعد ان کی دوسری محبوب کتاب حجتہ اللہ بالغہ تھی جسکو وہ بہت ذوق و شوق سے پڑھاتے تھے۔ انکی ذہانت اور نکتہ آفرینی نے اسمیں بھی ایک نیا عالم پیدا کر دیا تھا۔ اسمیں انکو تمام جدید سیاسی و معاشی انقلاب کی پیش گوئیاں اور ایک نئے صالح اور مکمل نظام کا نقشہ نظر آتا تھا جو اخلاقیات، معاشیات، سیاسیات اور الہیات کے چار ستوتوں پر کھڑا ہو سکتا تھا۔ کتاب کا موضوع اس کے مطالب، شاہ ولی اللہ کے وسیع و آفاقی ذہن، ان کی نکتہ رس طبعیت اور دور بین نگاہ نے مولانا عبید اللہ کی خود مدد اور رہنمائی کی اور مولانا سندھی نے اس کا رشتہ موجودہ زندگی اور اس کے مسائل سے جوڑ دیا۔^۳

ہندوستان میں درس قرآن کا عمومی رواج مولانا عبید اللہ سندھی نے شروع کیا تھا اور اس سلسلہ کو ان کے دو شاگردوں مولانا احمد علی اور مولانا عبدالحی فاروقی نے آگے بڑھایا۔

مولانا نے خود اپنے قلم سے بہت کم لکھا ہے ان تمام تر توجہ پڑھانے کی طرف رہی۔ اور جو چیزیں ان کے نام سے شائع ہوئی ہیں وہ زیادہ تر وہی ہیں جو مولانا نے املا کرائی ہیں یا جو مولانا کی تقاریر سن کر لوگوں نے خود قلم بند کی ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک معلم تھے۔ عام شکایت تھی کہ ان کی تحریریں واضح نہیں ہوتیں۔ کیونکہ ان میں غور و فکر اور مشاہدے کی ضرورت ہوتی تھی۔ مولانا کے افکار بہت بلند ہوتے تھے مگر افسوس ہے کہ افکار جتنے بلند تھے اس کے مطابق مولانا تقریر و تحریر پر قابو

نہ رکھتے تھے۔ اردوان کی نہ مادری زبان تھی اور نہ انہوں نے اس کو بطور فن سیکھا تھا۔ وہ نہ مقرر تھے نہ انشا پرداز بات بہت گہری اور پتے کی کہتے مگر انداز بیان کچھ ایسا گنجلک اور اشتباہ انگیر ہوتا کہ بعض اچھے اچھے اہل قلم اور مفکرین بھی ان سے بدظن ہو جاتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مولانا نے کچھ کہا ہو اور مستملی حضرات نے اس کا کچھ مطلب سمجھ کر اپنے الفاظ میں لکھ لیا ہو۔ ۵

مولانا حمید الدین فراہی کا کہنا تھا کہ: ”مولانا سندھی ایک ذہین آدمی ہیں۔ ذہین لوگ بیوقوفوں کی بہت کم پرواہ کرتے ہیں اور وہ اکثر ایسی باتیں کہہ گذرتے ہیں جو مشابہات کی نوعیت کی ہوتی ہیں جن سے تیسرے درجہ کی عقلیں فتنہ میں پڑ جاتی ہیں اور ارباب زلیغ ان کو لے اڑتے ہیں اور بات کا بتکڑ بنا دیتے ہیں۔“ ۱

مولانا حسین احمد مدنی کے بیان کے مطابق: ”مولانا سندھی کا کلام ان کی شدت ذکاوت اور مہارت علمی کی بنا پر پہلے بھی (ان کی ہجرت کا بل سے قبل) بہت زیادہ دقیق ہوتا تھا جس کو سمجھنے کے لئے اہل علم و فہم کو غیر معمولی غور و فکر کی ضرورت ہوتی تھی۔“ ۲

وہ بے زور سرمایہ تھے لیکن شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی روشنی میں انہوں نے اس پر مسلسل غور کیا تھا کہ اسلام کو موجودہ اقتصادی، سماجی اور سیاسی حالات میں کس طرح ایک عالمگیر طاقت بنایا جائے جس کا وہ دین فطرت ہونے کی بنا پر بجا طور پر مستحق ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک طرف اسلام کے اجتماعی، اقتصادی اور سماجی نظام کا بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا تو دوسری طرف انہوں نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مختلف دوائر میں ہونے والے عظیم الشان انقلابات اور ان انقلابات کے جو اثرات انسانی فکر و تخیل پر پڑے تھے اور عام معاشرہ اس سے جس طرح متاثر ہو رہا تھا اس کا انہوں نے دیدہ دری اور عمیق بصیرت سے جائزہ لیا اور ایک نتیجہ پر پہنچ کر اس کو اپنی فکر کا محور بنایا جو ان کی مندرجہ ذیل تصنیفات میں نظر آتا ہے۔

امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف

از عبید اللہ سندھی

ناشر سندھ ساگر اکاڈمی - لاہور - سن اشاعت مئی ۱۹۴۴ء

مولانا سندھی نے یہ مقالہ ماہنامہ الفرقان بریلی کے شاہ ولی اللہ نمبر کے لئے مولانا نور الحق علوی پروفیسر اور نیشنل کالج لاہور کو املا کرایا تھا۔ جنہوں نے ضروری حوالہ جات کا اصل مقالہ میں اضافہ فرمایا تھا۔ مولانا سندھی نے اس مختصر مقالہ میں تاریخ اور علم و حکمت کی وسیع معلومات کو سمودیا ہے۔

کچھ عرصہ بعد مولانا نور الحق علوی نے اس کو دوبارہ مرتب کر کے شائع کیا۔ مولانا نور الحق کے بیان کے مطابق انہوں نے اس مقالہ کو ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۱ء سے ۲۶ اکتوبر تک مولانا سے پڑھا۔ مشکل اور مغلق مقامات پر مولانا جو بھی وضاحت فرماتے وہ اس کو تحریر کرتے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مولانا سندھی کی تصنیف التہدید لائمتہ التجدید سے بھی کچھ ضروری اقتباسات جگہ جگہ نقل کر کے اشکال کو رفع کرنے کی کوشش کی۔

اس مقالہ میں مولانا سندھی نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ بالکل نئے اور انوکھے ہیں۔ رسالہ میں شاہ صاحب اور ان کے جانشینوں کی تعلیمات اور کارناموں پر مولانا کی گہری اور وسیع واقفیت نظر آتی ہے۔

شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک

مرتب: محمد سرور

ناشر سندھ ساگر اکاڈمی - لاہور۔

اس کتاب کی بنیاد وہی مقالہ ہے جو ماہنامہ الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر میں ”شاہ ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا اور جو بعد میں مولانا نور الحق کے حواشی اور تعلیقات کے ساتھ کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔

کیونکہ اس مقالہ میں مولانا سندھی نے صرف علماء اور طبقہ خواص کو مخاطب کیا تھا۔ اسلئے مقالہ کی زبان، انداز بیاں اور مضامین کی ترتیب قدرے مغلق تھی۔ نیز عربی اور فارسی کی طویل عبارتوں نے اس کو اور بھی مشکل بنا دیا تھا۔ سرور صاحب کا بیان ہے کہ اردو داں حضرات کو ولی اللہی حکمت سے آشنا کرنے کے لئے انہوں نے بیت الحکمت دہلی۔ میں مولانا کے قیام کے دوران بعض مشکل مقامات کو خود مولانا سے سمجھ کر اسے آسان زبان میں مرتب کیا ہے۔

محمد سرور کے مطابق انہوں نے جہاں مناسب سمجھا کتاب کے مضمون اور حواشی کو یکجا کر دیا ہے۔ عربی و فارسی کی اصل عبارات کی جگہ ان کا ترجمہ دے دیا ہے۔ اور جہاں تک موقعہ اور محل اجازت دیتے تھے زبان اور پیرایہ بیان کو آسان کر دیا ہے۔

مولانا سندھی نے اس کتاب کو ملاحظہ فرمایا تھا اور بیت الحکمت (دہلی) میں قیام کے دوران اس پر ”عرض حال“ کے عنوان سے مقدمہ بھی تحریر فرمایا۔ مولانا سندھی کے مطابق یہ مقالہ شاہ ولی اللہ کی اجتماعی تحریک کا ایک مختصر تعارف ہے جس میں شاہ ولی اللہ سے لیکر شیخ الہند تک اہم واقعات کا اشارتاً ذکر کر دیا گیا ہے۔ ان کے الفاظ میں ان کا یہ مقدمہ وطنی تاریخ کی تحقیق میں تمہید کا کام دے گا۔

مولانا نے حزب ولی اللہی کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ اول شاہ ولی اللہ سے شاہ اٹحق تک۔ دوم مولانا مملوک علی سے مولانا محمود الحسن تک۔ دور سوئم کو ان کے بیان کے مطابق شیخ الہند نے ۱۹۲۰ء سے تھوڑے عرصہ قبل شروع کیا تھا۔

اردو شرح حجتہ اللہ البالغہ

از۔ مولانا عبید اللہ سندھی

مرتبہ شیخ بشیر احمد لدھیانوی

ناشر مکتبہ بیت الحکمت۔ لاہور۔ قیمت چار روپیہ

مولانا عبید اللہ سندھی کے امالی پر مبنی حجتہ اللہ البالغہ کی یہ اردو شرح مکتبہ کے دوران قیام مولانا عبداللہ لغاری نے ۱۳۵۳ھ میں مولانا سندھی سے حجتہ کے درس کے دوران اخذ کئے تھے۔ شاہ ولی اللہ

نے اپنی کتاب میں مذہب کی بنیاد اور اصل روح پر جیسی وہ سمجھتے تھے بحث کی ہے۔ انہوں نے مجہدانہ انداز میں غزالی کی طرح شریعت میں تصوف کی رنگ آمیزی کی ہے۔ آزادانہ تشریح و توضیح برتتے ہوئے تقلید محض کی مخالفت کی ہے۔ زیر نظر ترجمہ حجتہ اللہ البالغہ کا لفظی ترجمہ نہیں ہے۔ بلکہ مولانا سندھی کا بیان کیا ہوا ترجمہ اور تشریح ہے جسے مولوی بشیر احمد نے مولانا سندھی کے امالی مرتبہ مولانا لغاری کے مسودہ کو سامنے رکھ کر ان پر اپنے حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ جس کی وجہ سے مولانا خلیل احمد اسراہیلی اور مولانا اسماعیل گودھروی کے کئے ہوئے تراجم کے مقابلہ میں ایک عام قاری شاہ ولی اللہ کے اس شاہکار سے بہ آسانی تعارف حاصل کر سکتا ہے۔

قرآن کے بعد مولانا عبید اللہ کی دوسری پسندیدہ کتاب حجتہ اللہ البالغہ ہی تھی۔ جس کو وہ بہت ذوق و شوق سے پڑھاتے تھے۔ ان کی ذہانت اور نکتہ آفرینی نے اس میں ایک نیا عالم پیدا کر دیا تھا۔ اس میں ان کو تمام جدید سیاسی معاشی انقلابات کی پیشن گوئیاں اور ایک نئے صالح اور مکمل نظام کا نقشہ نظر آتا تھا۔ انہوں نے اس کتاب کا رشتہ موجودہ زندگی اور مسائل سے جوڑ دیا تھا۔ جمیعہ الا انصار دیوبند میں اپنی دیگر تنظیمی فرائض کے علاوہ انہوں نے شیخ الہند کے ایماء پر دارالعلوم کے فارغ التحصیل طلباء کے لئے حجتہ کا باقاعدہ درس شروع کیا جسکو دہلی میں نظارۃ المعارف کے تحت بھی قائم رکھا۔ اور جب وہ چوتھائی صدی کی جہاں گردی اور جہاں بینی کے بعد وطن واپس آئے تو بیت الحکمت کے تحت انہوں نے حجتہ اللہ البالغہ کے درس کو پھر جاری کیا۔

تعلیمات قرآنی

مولانا عبید اللہ سندھی۔ مرتب۔ عبدالرحمن

قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ اشاعت اول ۱۹۵۹ء

یہ مختصر کتاب اس مقالہ پر مشتمل ہے جو مولانا سندھی نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ راولپنڈی میں پیش کیا تھا۔ اس میں قرآن کے مطالعہ ہی کو موضوعِ سخن بنایا تھا یعنی قرآن کی تعلیم کا کیا اثر ہوتا ہے اور مختلف ادوار میں مسلمانوں نے قرآن کو کس طرح پڑھا اور سمجھا۔ اس کو غلط طریقہ سے پڑھنے اور سمجھنے سے کیا برے نتائج پیدا ہوتے ہیں اور صحیح طریقہ سے

پڑھنے اور سمجھنے سے کتنے خوشگوار اور مفید نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اور یہ صرف قرآن کی تعلیم کا اثر تھا کہ چند سال کے عرصہ میں عرب کے بت پرست اور جاہل لوگ دنیا میں سب سے زیادہ خدا پرست سب سے زیادہ متمدن سب سے زیادہ مہذب اور سب سے زیادہ طاقتور بن گئے۔

مضمون کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اول: قرآن کی تعلیم کا اثر۔ دوسرا باب: قرآن کی تفاسیر کی مختصر تاریخ۔ تیسرا باب: قصص القرآن۔ چوتھے باب: میں شیخ محمد عبدہ کی کتاب ”الاسلام والنصرانیت“ کو بنیاد بنا کر مسلمانوں پر طاری جمود اور اس کے اسباب کے متعلق بحث کی ہے۔ مولانا کے خیال میں یہ قرآن کی تعلیم کو کمزور کرنے کی ایک منظم سازش کی وجہ سے ہوا۔ پانچویں باب میں انہوں نے بتایا کہ قوموں کی ترقی میں سنگ بنیاد دو ہی جذبے ہوتے ہیں جو اول مذہب دوم حب وطن۔ مذہب کے مقابلہ میں حب وطن کا جذبہ مسلمانوں میں بہت کمزور ہے اس لئے مسلمان صرف مذہب ہی سے متاثر ہو کر حقیقی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔

النبی الامین و القرآن المبین

افادات مولانا عبید اللہ سندھی۔ مرتب قمر الدین سہتو

قمر الدین سہتو نے اس کتاب کو اولاً سندھی میں مرتب کیا تھا۔ اس میں مختلف عنوانات اور ذیلی عنوانات کے تحت قرآن کریم کی آیات سے سیرت پاک کے واقعات بیان کئے گئے ہیں اور حواشی میں مولانا سندھی کی تفسیر سے آیات کے تفسیری نوٹ دئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۳ جلدوں پر مشتمل ہے۔

حصہ اول: بعثت نہوی سے پہلے بشارتیں اور حالات زندگی

حصہ دوم: بعثت سے ہجرت تک (مکی آیات سے مرتب کیا گیا)

حصہ سوئم: ہجرت اور مدنی دور (مدنی آیات سے مرتب کیا گیا)

جنگ انقلاب - سورۃ قتال کی حکیمانہ انقلابی تفسیر

مولانا عبید اللہ سندھی - مرتبہ بشیر احمد لدھیانوی - ناشر الحکمت لاہور

سورۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مدنی سورت ہے۔ یعنی ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں جنگ بدر کے بعد ۲ھ میں نازل ہوئی۔ اس سورۃ کی تفسیر شاہ ولی اللہ کے افکار کو اساس بنا کر کی گئی ہے جس میں بین الاقوامی انقلاب کی ضرورت واضح کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ قرآن حکیم کی تعلیم کے مطابق جنگ، اجتماعی جنگ (ٹوٹل وار) ہے جس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں۔ حتیٰ کہ ہاتھ پیر سے اپاہج بھی۔

جب انسانی سوسائٹی انسانیت کے اونچے درجہ سے گر جاتی ہے تو زیادہ اچھے اصول پر کام کرنے والی جماعت یا تو اسے بالکل فنا کر دیتی ہے یا اپنے اندر ضم کر لیتی ہے۔ چنانچہ جب کسی انسانی سوسائٹی میں زندگی کی ضرورتیں تمام افراد کو انصاف کے ساتھ بہم پہنچائے جانے کی جگہ سمٹ کر ایک چھوٹے طبقہ کے قبضہ میں چلی جاتی ہیں۔ اور وہ طبقہ ایک بڑے طبقہ کو ان سے محروم کر دیتا ہے تو اس سوسائٹی میں انقلاب (Revolution) آ جاتا ہے۔ اور یہ جماعت انقلابی قوتوں کے مقابلہ میں آ کر فنا ہو جاتی ہے۔ اور وہ بے بس و بیکس لوگ زندگی کے وسائل کو انصاف سے آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں قیصر روم اور کسریٰ ایران کے ساتھ عربوں کی جو جنگیں ہوئیں مولانا سندھی کے خیال میں وہ اس نکتہ کی بہترین مثال ہیں۔

قرآن حکیم کی تعلیم اجتماعی انقلاب کی تعلیم ہے۔ اس کا فائدہ انسانیت کے کسی خاص طبقہ کو نہیں پہنچتا ہے بلکہ اس کا فائدہ ساری انسانیت کو یکساں پہنچتا ہے۔ اس لئے اس کے اصول پر ہر سوسائٹی میں انقلاب آنا ضروری ہے۔ حکمت ولی اللہی کے مطابق اس طرح قائم ہونے والی حکومت اجتماعی اور غیر استعمالی ہوگی۔

قرآنی اصول انقلاب - تفسیر سورۃ العصر

تالیف مولانا عبید اللہ سندھی - مرتب بشیر احمد لدھیانوی

صفحات ۳۱ رنا شر المحمود اکاڈمی لاہور

مولانا کے مطابق قرآن حکیم کا اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ دین کے بنیادی اصولوں کی تشریح بعض چھوٹی سورتوں میں کرتا ہے۔ اس کے بعد طویل سورتوں میں جہاں ان اصولوں کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے ان پر تفصیلی نہیں کرتا۔ بلکہ صرف اشارہ کر دینا یا ان کے لئے اصلاحی الفاظ استعمال کرنا ہی کافی سمجھتا ہے۔ مولانا کے خیال میں یہ سورت قرآن حکیم کی انقلابیت کو پوری طرح واضح کرتی ہے۔ اس میں انقلاب کے وہ اصول بیان کئے گئے ہیں جن کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے عمل کر کے قرآن حکیم کی حکومت قائم کر دکھائی۔ مثلاً قرآن حکیم میں بار بار آتا ہے الذِّیْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ۔ اس میں دو اصلاحیں آئی ہیں الذِّیْنَ آمَنُوا اور عملوا الصالحات سورۃ العصر میں ان دو اصلاحوں کی تشریح کر دی گئی ہے۔ ان کے خیال میں جب تک انسانی اجتماع میں مندرجہ ذیل چار باتیں پیدا نہ ہو گئیں وہ کامیاب نہیں ہوا:

۱۔ نظریہ ایمان، ۲۔ عمل صالح، ۳۔ حق کی تلقین، ۴۔ صبر کی تلقین۔

۱۔ کسی ایسے عقیدے کا علم جس سے سارے اجتماع انسانی کو فائدہ پہنچتا ہوا اپنا نظریہ خیال کر کے کام کرنا۔

۲۔ اس نظریہ کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ اس نظریہ کی بنیاد پر مطلوبہ جماعت پیدا کرنا۔ اس

جماعت یا پارٹی کا انتشار پیدا کرنے والی بیرونی اور اندرونی حملوں سے محفوظ ہونا۔

قرآنی اساس انقلاب

از عبد اللہ سندھی - مرتب نامعلوم

صفحات ۶۲ - ناشر محمود اکاڈمی لاہور

یہ سورۃ فاتحہ کی تفسیر ہے جس کا نام الاساس بھی ہے۔ اس آیتہ کریمہ میں جو نازل ہونے

کے لحاظ سے بالکل ابتدائی زمانہ کی وحی ہے۔ قرآنی انقلاب کی زیریں بنیاد متعین کر کے انقلاب لانے والی جماعت کو اس بنیاد پر کامیابی کا قصر تعمیر کرنے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ اس سورۃ میں قرآنی انقلاب کی بنیاد صراطِ مستقیم بنائی گئی ہے۔ اس سورۃ کے مضامین کی توضیح میں مولانا سندھی نے قرآنی سیاست اور قرآنی حکمت کی بنیاد شاہ ولی اللہ کے فلسفہ پر رکھی ہے۔

محمود یہ عربی۔ از مولانا عبید اللہ سندھی۔

اردو ترجمہ عبید یہ۔ صفحات ۱۲۲، ناشر بیت الحکمت لاہور

یہ رسالہ عربی اور اردو میں یکجا شائع کیا گیا ہے۔ روس کے دوران قیام مولانا سندھی نے نئے انقلاب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ اور اس انقلاب کے حقیقی خطرے کو محسوس کیا اور سوچا کہ اس کا مقابلہ کس طرح جائے۔

یہ رسالہ شاہ ولی اللہ کی کتابوں کے بعض اقتباسات پر مشتمل ہے تاکہ لوگ اس کے مطالعہ کے بعد دعوتِ ولی اللہی کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔ وہ سوچیں کہ امام ولی اللہ کیا کہتے ہیں اور ان کے اولین معتقدین نے انہیں کیا سمجھا۔ اس سلسلہ میں مولانا مرحوم نے نہ صرف شاہ صاحب کے اقتباسات پیش کئے ہیں بلکہ ان کے ماموں زاد بھائی شاہ محمد عاشق پھلپتی، ان کے فرزند شاہ عبدالعزیز اور ان کے پوتے شاہ اسماعیل شہید کے خیالات بھی ان کے متعلق پیش کر دئے ہیں۔ اور آخر میں تحریکِ ولی اللہی کے دورِ سوئم کے امیر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کا بھی ذکر دیا ہے تاکہ اس دور کا رابطہ پہلے دو ادوار کے ساتھ قائم ہو کر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ سلسلۃ المذہب شاہ صاحب کے افادات کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

انہوں نے روسی اشتراکیت کے مطالعہ کے بعد اس کے دو اصول متعین کئے تھے۔

۱۔ سرمایہ داری کا استیصال

۲۔ لامذہبیت

اس کو سامنے رکھ کر انہوں نے اسلام کے مختلف حکماء کا مطالعہ کیا مگر انہیں اپنے سوالات کا شافی جواب شاہ صاحب کی تحریروں ہی میں ملا۔ مگر اس مسئلہ کی اہمیت بھی پوری شدت کے ساتھ سامنے آگئی۔ جس پر انہوں نے مکہ کے قیام کے دوران مسلسل غور کیا تھا۔ اور ہندوستان واپس آ کر پیر گوٹھ جھنڈا میں عربی میں تحریر کیا اور اپنے استاد شیخ الہند محمود حسن کے نام پر رسالہ محمودیہ نام رکھا۔ جس کا ترجمہ عبیدیہ کے نام سے مولانا کے سیکریٹری بشیر احمد لدھیانوی نے کیا ہے۔

عنوان انقلاب۔ یعنی سورۃ فتح کی حکیمانہ تفسیر

از عبید اللہ سندھی۔ مرتبہ شیخ بشیر احمد بی اے لودھیانوی

صفحات ۱۴۲۔ اشاعت اکتوبر ۱۹۶۳ء محمودی ۹۴۶ھ۔ ناشر مکتبہ بیت الحکمت لاہور۔

اس میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فلسفہ کو بنیاد بنا کر جنگ کے متعلق قرآن حکیم کا نظریہ ابتدائی شکل میں واضح کیا گیا ہے۔ اور انقلابی پارٹی کو منافقت سے پاک رکھنے پر زور دیا گیا ہے اور رجعت پسندی کے خاتمے کی ضرورت واضح کی گئی ہے۔

سورۃ فتح میں قرآن حکیم کے عظیم الشان نصب العین کا اعلان کیا گیا ہے۔ جس کا منشا یہ ہے کہ قرآن حکیم کا قانون تمام دوسرے قوانین پر غالب رہنا چاہئے۔ اور یہ نصب العین قرآن کے بین الاقوامی غلبے کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے اعلیٰ اقدار کی حامل انقلابی جماعت کی ضرورت ہے جو غالب آکر پرانے رجعت پسندانہ اقدار کو ختم کرے اور سوسائٹی میں نئی تہذیب کی بنیاد رکھے۔

تفسیر المقام محمود۔ از مولانا عبید اللہ سندھی

جامع۔ مولانا عبداللہ لغاری، مدون ڈاکٹر منیر احمد مغل

صفحات ۲۲+۴۳۳ اشاعت اول ۱۹۸۳ء مطبع مکتبہ رشیدیہ لاہور۔

سورۃ الفاتحہ اور سورۃ بقرہ کی تفسیر ہے اسے ڈاکٹر منیر احمد مغل نے مولانا لغاری کی جمع کردہ

سورۃ فاتحہ کی تفسیر کو بنیاد کر اپنے حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے۔ جس پر انہیں سندھ یونیورسٹی (حیدر آباد) سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا ہوئی۔

الہام الرحمن فی تفسیر القرآن

جلد اول سورۃ فاتحہ تا سورۃ مائدہ

جامع (عربی) علامہ موسیٰ جار اللہ مترجم اردو مولانا عبد الرزاق و مولانا قاسم

صفحات ۲۲ + ۲۶ + ۲۷ + ۳۷ + ۴۱ اشاعت اول ۱۹۷۷ء ناشر بیت الحکمت - کبیر والا ملتان

علامہ موسیٰ جار اللہ کے مقدمہ سورۃ فاتحہ کا ترجمہ مولانا محمد قاسم نے اور سورۃ بقرہ تا سورۃ مائدہ کا ترجمہ مولانا عبد الرزاق نے کیا ہے۔

جلد دوم - سورۃ انعام تا سورۃ توبہ کا ترجمہ مولانا محمد قاسم نے کیا ہے۔

القاء الرحمن فی تفسیر الہام الرحمن

جامع - علامہ موسیٰ جار اللہ مترجم مولانا ابولعلاء محمد اسماعیل گودھروی

سورۃ فاتحہ اور سورۃ البقرہ کی اصل عربی تفسیر علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی الہام الرحمن کے نام سے مرتب کر کے بیت الحکمت - کراچی سے شائع کر چکے ہیں۔ یہ تفسیر اسی کا اردو ترجمہ ہے۔ اور جنوری ۱۹۸۸ء سے ماہنامہ الوی حیدر آباد سندھ میں بالاقساط شائع ہو رہا ہے۔

افتتاحی خطبہ

مولانا عبید اللہ سندھی

صفحات ۲۲ - اشاعت (اول) جنوری ۱۹۴۰ء ہندی - ناشر جمنائز بد اسندھ ساگر پارٹی - کراچی۔

یہ خطبہ مولانا نے کانگریس کمیٹی سندھ کی ٹھٹھہ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کے موقع پر ۱۳/

جنوری ۱۹۴۰ء کو پڑھا تھا۔ اس خطبہ میں مولانا سندھی نے سندھ سے اپنی وابستگی۔ زندگی کے حالات، اپنی سیاسی جدوجہد کے حالات اور پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے۔ اپنی سیاسی زندگی کے تجربات، مطالعات و مشاہدات اور سیاسی فکر کا نچوڑ پیش کیا ہے۔

عبید اللہ سندھی کے سیاسی مکتوبات

مرتب پروفیسر محمد اسلم۔ صفحات ۹۱۔ مطبع عالیہ لاہور۔ ناشرندوة المصنفین سمن آباد لاہور۔

اس مجموعہ میں ۳۸ خطوط شامل ہیں۔ جو محمد اقبال شیدائی کو تحریر کئے تھے۔ اقبال شیدائی سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ تحریک ہجرت کے زیر اثر کابل گئے تھے اور وہیں مولانا عبید اللہ سے ملاقات ہوئی پھر ہمیشہ کے لئے مولانا سندھی سے رشتہ عقیدت و اخلاص قائم ہوا اور مولانا سندھی کی سیاسی تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ مولانا کے کابل سے روس کے سفر میں اقبال شیدائی مولانا کے ہم رکاب رہے۔

اس مجموعہ کا پہلا خط ۱۰ مارچ ۱۹۳۳ء کا ہے جو مولانا نے روس سے لکھا تھا۔ اور آخری خط ۱۹۳۸ء کا ہے جو مکہ مکرمہ سے تحریر کیا گیا تھا۔

مولانا سندھی کے یہ خطوط ماسکو، ترکی وغیرہ میں ہندوستان کی آزادی کی انقلابی تحریک، مہاجر انقلابی نوجوانوں کے حالات۔ ان کے سیاسی افکار و مشاہدات و تاثرات اور بہت سے نہایت اہم سیاسی واقعات سے لبریز ہیں۔

عبقات شاہ۔ اسمعیل شہید

اردو ترجمہ۔ مولانا عبید اللہ سندھی

عبقات کا یہ ترجمہ مولانا عبید اللہ سندھی نے قیام حجاز کے زمانے میں املا کرایا تھا۔ شاہ اسمعیل شہید کی یہ کتاب فن معرفت کے مبادیات اور مقامات کی تعلیم و تشریح میں ہے۔ اس کے مقدمہ میں شاہ صاحب نے تحریر کیا ہے ”اس کتاب کے لکھنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ معرفت کے تمام مباحث پورے لکھ دیں۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ مبتدی طالب علموں کے لئے ریاضت کا سامان بہم پہنچائیں

تاکہ فن معارف کے مبادی کو وہ سمجھ لیں اور آگے اس فن کی کتابوں کو وہ سمجھ سکیں۔

یہ کتاب ہنوز غیر مطبوعہ ہے البتہ اس کچھ حصے ماہنامہ الولی (حیدرآباد) کے ۱۹۷۵ء کے شماروں میں چھپ چکے ہیں۔

نیشنل کانگریس میں تحریک آزادی ہند کا دوسرا دور

کانگریس کمیٹی کا بل کا سروراجی نظام اور مہا بھارت سروراجیہ پارٹی کا پروگرام
از مولانا عبید اللہ سندھی

صفحات ۴۷۔ اشاعت ۱۹۲۴ء۔ مطبع محمود بک استانبول

ناشر۔ کانگریس کمیٹی کا بل۔ مقام اشاعت۔ ہندوستانی منزل، آق سرائے۔

مولانا سندھی نے یہ پروگرام ترکی کے زمانہ قیام میں تحریر فرمایا تھا۔ اور بذریعہ ڈاک ہندوستان کے مختلف رہنماؤں کو بھیجا گیا تھا۔ مگر یہ اپنی منزل مقصود تک پہنچنے سے قبل ہی ضبط کر لئے گئے تھے۔

یہ منصوبہ مولانا سندھی کی انقلاب پسندی اور سیاسی فراست کی بنیاد ہے۔ مولانا سندھی کا یہ نہایت جامع پروگرام تھا۔ جو کئی حصوں، چالیس دفعات اور بے شمار ذیلی شقوں پر مشتمل تھا۔ اس میں قومی تربیت کے ابتدائی پروگرام سے لیکر حکومت کی تمام شاخوں اور انکی کارگزاریوں تک کی تفصیل ہے۔

مکاتیب مولانا سندھی

مرتب :- ابو سلمان شاہجہاں پوری

ناشر۔ مولانا عبید اللہ سندھی اکاڈمی۔ پاکستان

اس مجموعہ میں اقبال کے شیدائی کے ان ۳۶ خطوط کے علاوہ جو پروفیسر محمد اسلم کے مرتب کردہ سیاسی مکتوبات میں شامل ہیں۔ اکتیس مزید خطوط ہیں جن میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا حبیب الرحمن عثمانی، شیخ عبد الرحیم، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، چوتھ رام صدر کانگریس کمیٹی سندھ، علامہ محمد صدیق بھاو پوری، غلام رسول مہر، مولانا احمد علی، مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی اور مولانا دین محمد

وفائی کے نام تحریر کردہ خطوط شامل ہیں۔

فاضل مرتب نے خطوط کے علاوہ اس مجموعہ میں دیگر تحریرات جن میں مولانا سندھی کی چندہ کی اپیلیں، مختلف اداروں کے معائنوں کی رپورٹیں بھی ہیں جو اس مجموعہ میں شامل کر دی گئی ہیں۔

التمہید لتعریف ائمتہ التجدید

مولانا نے قیام حجاز کے دوران اسے مرتب فرمایا تھا اس میں خانوادہ ولی الہی اور ان کے مکتبہ فکر کی تحریک تجدید اسلام کا تعارف اور علمی تاریخ پیش کی تھی۔ اس کا اہم مقصد ولی الہی مکتبہ فکر کو دنیائے اسلام اور بالخصوص عالم عرب میں متعارف کرانا تھا۔ اس کے ایک حصہ میں مولانا سندھی نے اپنے حالات بھی قلمبند کئے ہیں۔ یہ کتاب عربی میں ہے۔

پروفیسر مولانا غلام مصطفیٰ نے اس کو شائع کیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ابو العلامہ محمد اسماعیل گودھروی نے کیا تھا جس کی ابھی تک اشاعت نہیں ہو سکی ہے۔

المسوی من احادیث موطا

حضرت شاد ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۷۰ سال قبل مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی جگہ جگہ مولانا سندھی کے تشریح حواشی بھی ہیں۔

مولانا سندھی کا کہنا تھا کہ شاہ ولی اللہ نے موطا کو اپنے درس میں بہت اہمیت دی تھی تاکہ وہ اجتہادی روح پیدا ہو سکے جس نے حجاز کے ماحول میں پرورش پائی اور جسکے ذریعہ نئی فکری اصلاحیں عمل میں آسکیں اور جن سے آج بھی اجتہاد کی صحیح راہ دینی فکر کی روشنی میں تلاش کی جاسکتی ہے۔

سوطا کی فارسی شرح المصنفی پر شاہ ولی اللہ نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کتاب میں اس کے ترجمہ کے علاوہ مولانا سندھی نے شاہ ولی اللہ کے حالات زندگی بھی شامل کر دیئے ہیں

تعلیمات مولانا عبید اللہ سندھی

مرتبہ پروفیسر محمد سرور

ناشر۔ سندھ ساگر اکاڈمی۔ لاہور۔ دسمبر ۱۹۵۵ء۔ صفحات ۱۵۲۔

یہ کتاب پروفیسر محمد سرور کی کتاب ”عبید اللہ سندھی۔ حالات زندگی۔ تعلیمات اور سیاسی افکار“ کی تلخیص ہے۔ اس میں جو باتیں قلمبند کی گئی ہیں وہ مصنف کو ۱۹۳۸ء کے اواخر اور ۱۹۴۱ء کے درمیانی عرصہ میں سننے کا موقع ملا تھا۔ اس میں بعض مباحث مثلاً وحدت انسانیت، خدا پرستی، جہاد، انقلاب، شاہ ولی اللہ، ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل اور دوسرے تاریخی و معاشرتی اور مذہبی مسائل پر مولانا سندھی کے خیالات پیش کئے گئے ہیں۔

مولانا کے عمر بھر کے افکار اور نظریوں کا نچوڑ اس کتاب میں ہے جسے محمد سرور نے ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب اک دعوت اشتراک ہے شریعت اور طریقت کے درمیان اور طریقت اور دیدانت کے مابین۔ یہ ایک عالم دین کی طرف سے قوم کو بیک وقت یورپ کی مادی اور معاشی ترقی اور فلسفہ شاہ ولی اللہ کے قبول کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

شعور و آگہی

افادات مولانا عبید اللہ سندھی

مرتبہ۔ سید مطلوب علی زیدی

ناشر۔ مکی دارالکتب۔ لاہور۔ صفحات ۱۵۲۔

اس کتاب میں مولانا کے وہ مقالات جو مختلف مجلہات و رسائل میں اشاعت پذیر ہوئے جمع کر دئے گئے ہیں۔ تاکہ مختلف موضوعات پر محیط ان مضامین کا جو مولانا سندھی کے خاص افکار کے حامل ہیں بیک وقت مطالعہ ہو سکے۔ اس کتاب میں بعض ایسے مضامین بھی ہیں جو فکر ولی اللہی پر مولانا عبید اللہ سندھی کے حوالہ سے متعدد کتب سے منتخب کئے گئے ہیں۔ جو فاضل مرتب کی تصریح کے

مطابق پروفیسر محمد سرور کی کتابوں کے علاوہ، مولوی محمد میاں کی علماء ہند کا شاندار ماضی اور شاہ ولی اللہ کی تعلیم مولفہ غلام حسین جیلانی کے اقتباسات پر مبنی ہیں۔

مآخذ

- ۱۔ ابوالحسن علی ندوی۔ مولانا حمید الدین فراہی حیات و افکار۔ ص ۲۳
- ۲۔ ابوالحسن علی ندوی۔ پرانے چراغ۔ ص ۱۴۱
- ۳۔ مکتوب مولانا احمد علی بنام مولانا سلیمان ندوی۔ معارف نمبر ۱ جلد ۹۵۔ ص ۷۰
- ۴۔ ابوالحسن علی ندوی۔ پرانے چراغ۔ ص ۱۴۱
- ۵۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔ ماہنامہ برہان۔ اپریل ۱۹۴۵ء۔ ص ۱۹۶
- ۶۔ امین احسن اصلاحی۔ مولانا حمید الدین فراہی اور علم حدیث۔ معارف جلد ۴۹ شمارہ ۲ ص ۹۹
- ۷۔ حسین احمد مدنی۔ ماہنامہ برہان۔ اپریل ۱۹۴۵ء۔ ص ۱۹۷

باب سیزدہم

تحریکی رفقاء و مسترشدین

ابوسعید غلام مصطفیٰ قاسمی

عبید اللہ سندھی کے نامور شاگرد اور فیض یافتہ ہیں۔ مولانا سندھی انکو سندھ کے قیام کے دوران ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

۱۹۳۹ء میں جب مولانا سندھی وطن واپسی پر دارالعلوم دیوبند پہنچے تو یہ اس وقت وہاں طالب علم تھے۔ دیوبند سے فراغت کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں داخل ہوئے۔ انہوں نے پاکستان اور بالخصوص سندھ میں معارف و تعلیمات ولی اللہی و افکار عبید اللہی کے تعارف و اشاعت کے سلسلہ میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ محمد قاسم ولی اللہ تھیلو جیکل اسکول شہدادنگر (ضلع لاڑکانہ) مولانا قاسمی اور ان کے رفیق خاص عزیز اللہ کی ہمت اور کوششوں سے کھولا گیا۔

وہ بیت الحکمت کراچی کے سیکریٹری اور شاہ ولی اللہ اکاڈمی کے سربراہ رہ چکے ہیں۔ مولانا سندھی کے سفر کابل کے رفیق عبداللہ لغاری کی یادداشتوں کو انہوں نے ”مولانا سندھی کی سرگذشت کابل“ کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد اقبال شیدائی

ڈاکٹر محمد اقبال شیدائی ۱۸۸۸ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم

سیالکوٹ میں ہوئی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد برصغیر میں جب تحریک خلافت کا آغاز ہوا اور مولانا عبدالباری فرنگی مہلی نے ہجرت کافتوی دیا۔ تو اس وقت افغانستان ہجرت کرنے والوں میں اقبال شیدائی بھی تھے۔

شیدائی صاحب کی ملاقات مولانا سندھی سے کابل میں ہوئی۔ مولانا نے کابل کے دوران قیام ایک جلاوطن حکومت کی بنیاد رکھی تھی جسے وہ حکومت موقتہ ہند کہتے تھے۔ اس میں اقبال شیدائی محکمہ جنگ اور مواصلات کے نائب وزیر بنائے گئے تھے۔

حکومت افغانستان کے رویہ سے مایوس ہو کر اقبال شیدائی مولانا سندھی کے ہمراہ کابل سے روس پہونچے اور وہاں کے حالات سے بھی دل برداشتہ ہو کر فرانس ہوتے ہوئے اٹلی پہونچ گئے۔ اٹلی کے دوران قیام انہیں تیورن یونیورسٹی میں اردو پڑھانے کا کام مل گیا۔ اور وہ کئی سال تک تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ بعد میں تجارت شروع کر دی۔ اٹلی میں مولانا سندھی کے ترکی سے جاز پہونچنے کے انتظامات انہوں نے ہی کئے تھے۔

۱۹۶۵ء میں وہ وطن واپس آ گئے اور ۱۳ جنوری ۱۹۷۷ء کو لاہور میں بعارضہ قلب انتقال کیا۔ مولانا سندھی کے ان کے نام تحریر کردہ ۳۶ خطوط کو پروفیسر محمد اسلم نے اپنے حواشی و تعلیقات کے ساتھ ”مولانا سندھی کے سیاسی مکتوبات“ کے عنوان سے شائع کیا۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی

ہندوستان کی حکومت موقتہ کا وزیر اعظم، صحافی، انقلاب مجسم۔ شیخ الہند کی انقلابی تحریک ہو یا لالہ ہر دیال کی امریکہ میں غدر پارٹی، ریشمی رومال تحریک ہو یا حکومت موقتہ ہند ہو یا مسلہ خلافت، برکت اللہ ہر تحریک کے صف اول میں نظر آتے ہیں۔

برکت اللہ ۱۸۵۹ء کے اوائل میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم روایتی مکاتیب میں حاصل کی۔ انہوں نے ۱۸۸۲ء میں یکا یک بھوپال کو خیر یاد کہا چند روز ہوشنگ آباد پھر جیلپور میں رہ کر انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۴ سال بمبئی میں رہے اور اعلیٰ تعلیم کے ذوق میں انگلستان پہونچ گئے۔

وہاں سے ۱۹۰۶ء میں امریکہ گئے اور آہستہ آہستہ سیاست میں آ گئے۔ ۱۹۰۸ء میں جاپان گئے اور ٹوکیو اسکول آف فارن لنگویجیز میں اردو کے معلم مقرر ہوئے۔

۱۹۱۱ء میں آپ روس، مصر اور ترکی کے مطالعاتی دورہ پر گئے۔ اس کے بعد سان فرانسسکو گئے جہاں لالہ ہر دیال کے ساتھ ان کی عذر پارٹی میں ساتھ ہو گئے۔ ترک جرمن وفد کے ہمراہ افغانستان آئے۔ حکومت موقتہ ہند میں انکو وزیر اعظم بنایا گیا۔ ترک، جرمن مشن کی ناکامی پر کابل میں رک گئے۔ بعد میں روس اور جرمنی ہوتے ہوئے پیرس گئے۔ لیکن اپنی سرگرمیوں کی بنا پر فرانس بدر کئے گئے۔

آخر کیلیفورنیا گئے وہاں ۲۷ دسمبر ۱۹۲۷ء کو گناہی کی حالت میں وفات پا گئے۔

مولانا بشیر احمد لدھیانوی

قرآنی دستور انقلاب (یعنی سورہ مزمل اور سورۃ مدثر) کے پیش لفظ میں جو لحاظ طیبات کے عنوان سے اس کتاب میں شامل ہیں مولانا سندھی نے مولانا بشیر احمد صاحب کے بارے میں فرمایا۔ ”مولوی بشیر احمد بی۔ اے لدھیانوی ہم سے قرآن سمجھنے کے لئے مسلسل ملتے رہے اور ہمارے افکار بھی لکھتے رہے۔ اس طرح انہوں نے کئی صفحات تیار کر لئے۔ وہ ہمارے طرز تفکر کا انقلابی نقطہ تدریجاً سمجھنے کے قابل ہو گئے۔ اب ان کی خواہش ہے کہ اس کو لوگوں کو پڑھائیں یا پریس کے ذریعہ پھیلانیں۔ اس میں ہماری طرف سے اجازت تھی۔ ہمیں ایسے ہی استاد کی ضرورت تھی۔ ہم نے انہیں اپنے ابتدائی تجارت میں شریک کر لیا ہے۔“ وہ بیت الحکمت لاہور کے سیکریٹری تھے۔

عزیز احمد

مولانا کے عزیز قریب اور رفیق طریق عزیز احمد مولانا کے سوتیلے لڑکے تھے۔ وہ شیخ التفسیر مولانا احمد علی کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے والد بھی مولانا سندھی کی طرح نو مسلم تھے۔ اور ان کے انتقال کے بعد وہ مولانا سندھی کی کفالت میں آ گئے تھے۔ جنہوں نے ان کی والدہ سے

عقد ثانی کر لیا تھا۔

مولانا کے سفر کابل میں وہ ان کے ہمراہ رہے اور کابل کے دوران قیام وہ کئی بار خطوط اور مختلف اعلانات لیکر خاموشی سے ہندوستان آئے۔

کابل کے بعد وہ سویٹ روس، ترکی اور حجاز میں مولانا کے ہمراہ رہے کابل کے دوران قیام حبیبیہ کالج میں ان کا داخلہ ہو گیا تھا۔ مگر انگریزی دباؤ کی وجہ سے محمد علی قصوری اور محمد ابراہیم کی طرح ان کو بھی کالج سے نکال دیا گیا اور وہ اپنی تعلیم پوری نہ کر سکے۔ مولانا سندھی اکثر اس پر افسوس کرتے کہ عزیز احمد کے ہم جماعت کونسل، نائب وزیر، جنرل اور ممبر بن گئے اور یہ میرا بھتیجا عزیز احمد جو علمی، عملی لیاقت میں ان سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ اسی طرح جو تیاں چٹخا تا پھر رہا ہے۔

مولانا جب روس گئے تو ماسکو کے اسکول میں انکو روسی زبان سیکھنے کے لئے داخل کر دیا گیا۔ اور جب مولانا استنبول آ گئے اور تین سال سے زائد عرصہ رہے تو اس عرصہ میں ان کو ترکی زبان پڑھنے اور سیکھنے کا موقع مل گیا۔ پھر مکہ معظمہ میں مولانا سندھی کے ہمراہ تیرہ سال قیام کیا اور عربی زبان میں مہارت حاصل کر لی۔ اردو، سندھی، فارسی، ترکی، روسی، عربی اور پشتو پر ان کو عبور تھا۔ جاوی اور بنگالی سے بھی واقف تھے۔

آخر میں وہ کراچی کے ایک مدرسہ میں استاد مقرر ہو گئے تھے۔

ظفر حسن ایک

ظفر حسن ان پر جوش مسلم نوجوانوں میں سے تھے جو ۱۹۱۵ء میں لاہور کے مختلف کالجوں کے چند ہم خیال طلباء کے ساتھ یہ عزم لے کر کابل پہنچے تھے کہ وہ وہاں سے ترکی جائیں گے اور ترکوں کی صفوں میں شامل ہو کر انگریزوں کے خلاف جہاد کریں گے۔ مگر غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہونے کے الزام میں دوسرے مہاجرین کے ساتھ افغانی حکومت نے ان نوجوانوں کو بھی حراست میں لے لیا۔ اسی زمانے میں مولانا سندھی بھی کابل پہنچے اور ان کی وجہ سے ان نوجوانوں کو رہائی ملی۔ مولانا سندھی کے توسط سے سردار سپہ سالار نادر خاں کے صاحبزادہ محمد ظاہر کے اتالیق بن گئے۔

اور ان کے تعلقات اس خاندان سے بہت بڑھ گئے۔ ظفر حسن نے افغانستان کی ۱۹۱۹ء کی جنگ آزادی میں بہت کارنامے انجام دئے۔ انگریز افغان محاربہ میں وہ سپہ سالار نادر خان کے ہمراہ ٹھل کے محاذ پر تھے۔ ان کی خدمات کے نتیجہ میں حکومت افغانستان انہیں تنخواہ دیتی تھی جس سے ان کے کئی ہندوستانی ساتھی گزارہ کرتے تھے۔ انہوں نے وزارت دفاع میں سپہ سالار نادر خان کے پرائیوٹ سیکریٹری کی حیثیت میں بھی خدمات انجام دیں۔

جب مولانا سندھی افغانستان چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو ظفر حسن نے ان کا ساتھ دیا۔ کابل سے ترکی تک مولانا کے سفر و حضر میں ساتھ رہے۔ انہوں نے کابل میں مولانا سے علوم دینیہ پڑھے۔ وہ مولانا کے سیاسی رفیق بھی تھے، شاگرد معتمد و معاون اور سیکریٹری بھی۔ ۱۹۲۶ء میں جب مولانا نے حجاز جانے کا فیصلہ کیا تو ظفر حسن ترکی ہی میں رہ گئے۔

مولانا سندھی نے ترکی میں جو سیاسی منشور تحریر کیا تھا۔ جس میں ہندوستان کی آزادی کے متعلق اپنی تجاویز اور دستور العمل کی وضاحت کی تھی۔ جسے ”سروراجیہ نظام“ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ظفر حسن نے ہی کیا تھا اور اس پر بحیثیت سیکریٹری دستخط بھی کئے تھے۔

ظفر حسن بعد میں ترکی کے شہری بن گئے اور ترکی کی فوج میں داخل ہو کر کیپٹن آرٹلری سے سبکدوش ہوئے۔

ظفر حسن نے اپنی خودنوشت بہ عنوان ’آپ بیتی‘ دو حصوں میں مرتب کی ہے جس سے مولانا سندھی کی سرگرمیوں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ تصنیف اس دور کے تاریخ کی اہم دستاویز ہے۔

شیخ عبدالرحیم سندھی

سندھ کی اہم عامل فیملی کرپلائی سے تعلق رکھتے تھے وہ بیسویں صدی کے اوائل ہی میں دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔

حیدرآباد سندھ کے باشندے اور مولانا عبید اللہ کے مخلص و فادار دوست تھے۔ انہوں نے مولانا عبید اللہ کی افغانستان سرحد تک پہنچانے میں بہت مدد کی۔ مولانا سندھی کا بیان ہے کہ سفر

افغانستان کے لئے زادراہ مہیا کرنے کے لئے شیخ عبدالرحیم کے اہل خانہ نے اپنے زیورات فروخت کر دئے تھے۔

انکی تبلیغ اور کوششوں کے ذریعہ کتنے ہی اعلیٰ خاندان کے عامل نوجوان دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

کابل پہونچنے کے بعد مولانا سندھی کی خط و کتابت ان سے ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ”ریشمی خطوط“ کے سلسلہ میں انکے نام مولانا عبید اللہ سندھی کا خط جسے شیخ عبدالرحیم کو شیخ الہند تک پہونچانا تھا گورنمنٹ کے ہاتھ لگ گیا تب یہ روپوش ہو گئے۔ اور آخر تک پولیس کے ہاتھ نہ آئے۔ اور اسی حالت روپوشی میں سرہند میں بیمار ہو کر ۱۹۱۶ء میں انتقال ہو گیا۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے سابق صدر اور ممتاز سیاستداں اچاریہ جے بی کرپلائی کے بڑے بھائی تھے۔

شیخ محمد ابراہیم

مولانا سندھی کے تحریکی رفیق مولانا محمد صادق کرانچوی کے بھتیجے تھے۔ پونہ میں تعلیم پائی اور بمبئی یونیورسٹی سے اکانومکس میں ایم۔ اے کیا۔ کابل روانہ ہونے سے قبل مولانا سندھی نے پیش بندی کے طور پر انہیں افغانستان بھیج دیا تھا تا کہ محمد علی قسوری کے ساتھ مل کر وہ جہاد کی راہ ہموار کر سکیں۔

فروری ۱۹۱۵ء میں انہیں حبیبہ کالج میں معلم کی ملازمت مل گئی۔ مگر جون ۱۹۱۶ء میں انہیں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا اور وہ محمد علی قسوری کے ہمراہ آزاد علاقے میں چلے گئے۔ جہاں کسی نے ان کا قتل کر دیا۔ مولانا سندھی کا خیال ہے کہ وہ کسی برطانوی خفیہ پولیس کے کارندے کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ جنود ربانیہ میں ان کا عہدہ میجر جنرل کا تھا۔

پروفیسر محمد سرور

پروفیسر محمد سرور ۱۹۰۴ء کو موضع لیکریال ضلع گجرات (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ ہائی

اسکول گجرات سے ہائی اسکول پاس کیا۔ اس زمانے میں برصغیر میں سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ سرور صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا۔ عربی ادب اور تاریخ ان کے خاص مضامین تھے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اولین گریجویٹس میں سے تھے۔ انہوں نے سید محمد سورتی جسے عالم سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۹ء میں جامعہ ازہر میں داخلہ لیا اور فراغت کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں استاد مقرر ہو گئے۔ ۱۹۳۸ء میں جب مولانا عبید اللہ سندھی نے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین سے جامعہ کے کسی استاد کو بھیجنے کے لئے درخواست کی تو قرعہ سرور صاحب کے نام نکلا۔ وہ تقریباً ایک ماہ مولانا کے پاس رہے جہاں مولانا سندھی نے انہیں اپنی فکر سے روشناس کرایا۔ سرور صاحب کا بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے مولانا مرحوم کے حالات زندگی تعلیمات اور سیاسی افکار کو عام فہم سلیس اور دلچسپ انداز میں مرتب کر دیا۔ انہوں نے اپنا فرض بہ حسن و خوبی سرانجام دیا۔ مولانا سندھی پر ان کی کتاب ”عبید اللہ سندھی۔ حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار“۔ مولانا کی زندگی ہی میں شائع ہو گئی تھی۔ کیونکہ مولانا نے اس کی مخالفت میں کچھ نہیں کہا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا اس کتاب سے متفق تھے۔ انہوں نے مولانا سندھی کے افکار و تصورات اور فلسفہ و حکمت کے فروغ کے لئے سندھ ساگر اکاڈمی کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ بھی قائم کیا۔

سرور صاحب نے مولانا سندھی کے افکار و خیالات کو اس قدر اپنا بنا کر پیش کیا ہے کہ بعض وقت قاری کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ خیالات واقعی مولانا کے ہیں یا ان کے شاگرد محمد سرور کے اپنے ذاتی خیالات ہیں جو انہوں نے مولانا سے منسوب کر دئے ہیں۔

جب بیت الحکمت جامعہ میں قائم ہوئی تو وہ اس کے ناظم مقرر ہوئے۔ انہوں نے مولانا کی کئی کتابیں۔ کابل میں سات سال۔ تعلیمات مولانا عبید اللہ سندھی، خطبات عبید اللہ سندھی وغیرہ مرتب کیں ان کے علاوہ ان کی دوسری تصنیفات کی ایک طویل فہرست ہے۔

وہ ایک کہنہ مشق صحافی تھے۔ روزنامہ زمیندار سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ روزنامہ احسان کے ایڈیٹر ہے۔ پاکستان کی وزارت اطلاعات و نشریات و مطبوعات میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہے۔ جب محکمہ اوقاف (سندھ) کی طرف سے شاہ ولی اللہ اکادمی کا قیام عمل میں آیا تو اس کے ترجمان

الرحیم کے مدیر مقرر ہوئے۔ مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی (اسلام آباد) کے رسالہ فکر و نظر کے مدیر رہے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے رسالہ ثقافت کے مدیر رہے۔

ان کا انتقال ۲۲ ستمبر ۱۹۸۳ء کو ابوظہبی میں ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔

محمد صادق کراچی

کراچی کے رہنے والے تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے ۱۳۱۲ھ میں حدیث کی تکمیل کی۔ کتب عالیہ درسیہ خصوصاً دورہ حدیث مولانا محمود الحسن سے پڑھیں۔ حضرت شیخ الہند کی تحریک کے سرگرم کارکن تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی سے ان کے گہرے روابط تھے۔

حضرت شیخ الہند کی ہدایت پر مولانا محمد صادق نے کراچی کے محلہ کھڈھ میں مدرسہ مظہر العلوم کی بنیاد ڈالی۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران جب انگریزوں نے عراق پر حملہ کیا تو انہوں نے سندھ کے قریب لسبلا کے بلوچی قبائل میں بغاوت کرا دی جس کی وجہ سے انگریز عراق میں اپنی فوجوں کو کمک نہ پہونچا سکے اور انگریزی فوجوں کو ترکوں کے سامنے ہتھیار دلانے پڑے۔ انہیں بغاوت کے جرم میں گرفتار کر کے کاروار (صوبہ کرناٹک) میں نظر بند کر دیا گیا۔

۲۴ سالہ جلا وطنی کے بعد جب مولانا سندھی کراچی واپس لوٹے تو انہی کے پاس قیام پذیر ہوئے۔ مولانا سندھی کی قائم کردہ خدام الحکمت اور بیت الحکمت کے مراکز بھی مدرسہ مظہر العلوم میں قائم ہوئے۔

مولانا محمد صادق کا ایک اہم کام لواری جج کے خلاف عوامی رائے کو بیدار کرنا تھا۔ جس کی بشیر احمد زماں خاں نے اپنے دادا کے عرس پر جو نو اور دس ذالحجہ کو ہوتا تھا بنیاد ڈالی تھی۔ ان کے مریدین اس کوچ کا نعم البدل سمجھتے تھے اور ان کے مزار کو مرکز مان کر حج کے فرائض ادا کرتے تھے۔ انہوں نے جمعۃ العلماء سندھ کے پلیٹ فارم سے اگست ۱۹۳۷ء کو کراچی میں سندھ کے ہر مکتب خیال کے تقریباً ایک ہزار علماء کی کانفرنس کی جس میں متفقہ طور پر لواری جج کے خلاف مہم چلانے کا

فیصلہ کیا گیا۔ لواری جج پر قیام پاکستان کے بعد پابندگی۔

محمد عبداللہ لغاری

محمد عبداللہ ۱۸۷۱ء میں بمقام دادلغاری تحصیل میرپور ماتھیلا (سندھ) میں پیدا ہوئے۔ گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کر کے سندھ اور پنجاب کے مختلف مدارس میں علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ امرٹ میں مولانا عبید اللہ سندھی سے ملاقات ہوئی۔ وہ عبید اللہ کی انقلابی سیاست میں رفیق کار بن گئے۔ جب پیر جھنڈو میں مدرسہ دارالرشاد قائم ہوا تو اس کے مہتمم رہے۔ اس طرح تقریباً سات سال انہیں عبید اللہ سندھی کے ہمراہ طلباء میں ذہنی بیداری پیدا کرنے کا موقع ملا۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے جمعیتہ الانصار کے ناظم کی حیثیت سے دیوبند چلے جانے کے بعد ۱۹۱۴ء تک مدرسہ کا کام سنبھالتے رہے اور اسی سال مولانا سندھی نے انہیں اپنے ہمراہ کابل چلنے کے لئے کہا تو ۱۹۱۵ء میں ان کے رفیق کار اور معتقد بن کر کابل چلے گئے۔

کابل میں قیام کے تقریباً ۲ سال بعد مولانا عبید اللہ نے ان کے ذریعہ ہندوستان میں مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں کو حکومت موقتہ ہند کے تعلق سے اپنے اور راجہ مہندر پرتاپ کے خطوط بھیجے۔ نیز یہ کہ وہ امرٹ، دین پور اور پیر جھنڈا کے بزرگوں سے جہاد کا حکم لے کر افغانستان روانہ کر دیں۔ عبداللہ لغاری نے یہ دونوں کام بہت رازداری سے انجام دئے۔

ریشی خطوط کے سلسلہ میں وہ اپنے چند رفقاء کے ساتھ گرفتار بھی ہوئے۔ ان کے ساتھی تو رہا کر دئے گئے مگر وہ دو سال سے زائد پنجاب کی مختلف جیلوں میں نظر بند رہے اور پہلی جنگ عظیم کے بعد رہا کر دئے گئے۔

۱۹۲۶ء میں جب مولانا سندھی حجاز پہونچے تو عبداللہ لغاری بھی ان کی خدمت میں پہونچ گئے۔ اور اس عرصہ میں تفسیر قرآن اور فلسفہ شاہ ولی اللہ پر مولانا سندھی کے امالی کو مرتب کیا۔

۱۹۳۹ء میں مولانا سندھی کے وطن آنے سے کچھ عرصہ قبل سندھ واپس آ گئے اور آخر دم تک ان کے ساتھ رہے۔

زندگی کے آخری ایام میں وہ سندھ یونیورسٹی میں ایم اے کے طلباء کو تفسیر پڑھانے کے لئے

مقرر ہو گئے تھے۔ اور وہیں حیدر آباد میں ۱۸ ستمبر ۱۹۵۸ء کو انتقال ہوا۔

مولانا محمد مدنی

بلند پایہ مفسر قرآن، محدث، فقیہ اور عالم تھے۔ وہ مولانا سندھی کے فیض یافتہ اور ان کے رفقاء خاص میں تھے۔ تقریباً آٹھ برس حرمین میں قیام پذیر رہے۔ انہی ایام میں مولانا سندھی سے انہوں نے قرآن پڑھا اور درس قرآن کے امالی کو مرتب کیا۔ سندھی میں قرآن کا مکمل ترجمہ شائع کیا۔

مولانا سندھی کے حکم پر حجاز سے سندھ واپس آ کر سندھ مدرسہ الاسلام کراچی میں عربی و اسلامیات کے استاد رہے۔

مولانا دین محمد وفائی

مولانا دین محمد وفائی سندھی کے ممتاز عالم، ادب، تاریخ، اور صحافت کی ایک منفرد شخصیت تھے۔ وہ ایک نامور استعمار دشمن اور جنگ آزادی کے مجاہد تھے۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث تھے۔ سیاست سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور نیشنلزم کے حامی تھے۔

وہ ۳ مارچ ۱۹۹۲ء کو ضلع سکھر کے تعلقہ گڑھی کے گاؤں کتھی عرف بنی آباد میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی مکتبی تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل کی اس کے بعد متداول کتب درسیہ کی مختلف مدارس میں تکمیل کی۔ ۱۹۱۹ء میں جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد جب سندھ میں تحریک خلافت شروع ہوئی وہ اس میں شریک ہو گئے۔ اور ۱۹۲۰ء میں جمیعتہ العلماء سندھ کے ناظم مقرر ہوئے۔ حضرت سندھی کے بڑے معتقد اور ان کے افکار کے بڑے شیدائی تھے۔ کچھ عرصہ تک انہوں نے قرآن حکیم کے علوم و افکار میں دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا میں مولانا سندھی کے آگے زانو ادب تہہ کیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں جب رسالہ الوحید جاری کیا گیا وہ اس کے معاون مدیر مقرر ہوئے اس کے بعد ۱۹۲۲ء میں توحید کے مدیر مقرر ہوئے۔ انہوں نے آریہ سماجیوں کی طرف سے سندھ میں سینوگی شیئوں کی شدھی کرنے کی تحریک کی شدت سے مزاحمت کی۔

جب مولانا سندھی جلا وطنی کے بعد وطن لوٹے تو ان کی رفاقت میں مولانا وفائی کی سیاسی و فکری زندگی کا ایک خاص دور شروع ہوا۔

مولانا سندھی کی صحبت میں مولانا وفائی کا میلان تصنیف و تالیف کی طرف بڑھ گیا۔

۱۹۴۹ء میں کراچی میں ادارہ بیت الحکمت قائم کیا گیا کہ دوسرے علمی کاموں کے ساتھ اس کے تحت خاص طور پر مولانا سندھی کے امالی شائع کئے جائیں۔ شیخ محمد دین وفائی ۱۸ اپریل ۱۹۵۰ء سے اپنی وفات تک اس ادارہ کے تمام مصارف برداشت کرتے رہے۔

مولانا سندھی کے متعلق ان کے تحریر کردہ تمام سندھی مضامین کا ترجمہ ”مولانا عبید اللہ سندھی افکار و خدمات“ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ انہیں ۱۹۳۳ء میں سفر حج کے موقع پر کافی عرصہ مولانا سندھی کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا تھا۔

محمد موسیٰ جار اللہ

موسیٰ جار اللہ روس کے مشہور مسلمان رہنماؤں میں سے تھے۔ وہ علاقہ کازان جسے اب تاتارستان کہا جاتا ہے کے قصبے رستورے میں ۶ جنوری ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق نورغائی ترکوں کے اوغول قبیلہ سے تھا۔

گھر پر تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے جامعہ ازہر سے تکمیل کی۔ مصر کے دوران قیام وہ مفتی محمد عبدہ سے ملے۔ وطن واپس آکر وہ سینٹ پیٹرس برگ کے مدرسہ قانون میں داخل ہو گئے۔ انقلاب روس کے دوران وہ سینٹ پیٹرس برگ میں ہی مقیم رہے۔ جب عبید اللہ سندھی قیام روس کے دوران سینٹ پیٹرس برگ پہونچے تو موسیٰ جار اللہ نے ہی ان کی میزبانی کی۔ وہ ۱۹۳۶ء میں مکہ مکرمہ میں منعقدہ موتمر اسلامی کے روسی وفد کے بھی ایک رکن تھے۔ بعد میں وہ اپنی سرگرمیوں اور تحریروں کی بنا پر متعدد بار جیل گئے۔ روس سے جلد وطنی کے بعد انہوں نے ترکی، مصر، ہندوستان اور حجاز میں کافی عرصہ قیام کیا۔ موسیٰ جار اللہ منفی المذہب تھے۔ ان میں وہ جمود نہیں تھا جو اکثر عالموں میں پایا جاتا ہے۔

ترکی و عربی میں انہوں نے متعدد کتب تصنیف کیں۔ مکہ کے دوران قیام انہوں نے مولانا سندھی کے تفسیر کے امالی مرتب کئے۔ جن کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

۱۲۵ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو قاہرہ میں انتقال ہوا۔

محمد امین کھوسو

محمد امین کھوسو ۱۱ دسمبر ۱۹۱۰ء کو جیکب آباد کے قصبہ عزیز آباد میں پیدا ہوئے وہ ایک بلوچ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

ان کے والد حاجی عبدالعزیز خان کھوسو اپنے علاقہ کے بڑے زمیندار تھے اور اپنی انسانی اور اخلاقی خوبیوں کی بنا پر پورے علاقہ میں نہایت عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ محمد امین نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں اور جیکب آباد میں حاصل کی۔ ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ چلے گئے۔ علی گڑھ میں میٹرک سے ایل ایل بی تک تعلیم پائی۔ علی گڑھ سے واپسی پر سندھ کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۹۳۷ء میں ہاری کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے۔ کراچی میں ٹرانسپورٹ کے ملازمین اور مزدوروں کی رہنمائی کی۔ ۱۹۳۸ء میں سندھ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔

۱۹۴۱ء میں برٹش حکومت نے ان پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا۔ ایک سال کے بعد مقدمہ سے چھٹکارا ملا۔ ۱۹۴۳ء میں وہ پھر گرفتار کر لئے گئے۔

۱۹۳۹ء انکی زندگی کا اہم سال تھا جب مولانا سندھی کی وطن واپسی کے بعد انکی مولانا سندھی سے ملاقات ہوئی۔ جس کے بعد ان میں تبدیلی ہونے لگی۔ پہلے وہ روسی انقلاب کی باتیں کرتے تھے اب ان کی زبان سے دینی اور اسلامی انقلاب کے عزائم کا اظہار ہونے لگا۔ مولانا سندھی کے فیض صحبت نے انہیں کچھ کا کچھ بنادیا۔ مولانا سندھی سے ان کا معاملہ ارادت و عقیدت سے بڑھ کر عشق کی حد میں داخل ہو گیا تھا۔

سندھ میں ”سندھ ساگر“ پارٹی کے پروگرام کو چلانے کے لئے مولانا نے انہی کا انتخاب کیا تھا۔ وہ سندھی کے اچھے ادیب تھے۔ مولانا ابوسلمان السندھی نے مولانا سندھی پر انکے مختلف مضامین

کو ”ایک آدمی سونے جیسا“ کے عنوان سے اور ”مولانا سندھی کی سیاسی تحریک“ کے تحت دو کتابوں میں مدون کر کے شائع کر دیا ہے۔

راجہ مہندر پرتاپ

راجہ مہندر پرتاپ متھرا ضلع کی تحصیل مرساں کے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم محمدن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں پائی۔ ۱۹۱۴ء میں غیر ملکی دورہ پر گئے۔ جنیوا میں لالہ ہر دیال نے ان کو جرمن کونسلر سے متعارف کرایا۔ وہاں سے برلن گئے۔ اور ایک خصوصی مشن پر ۱۹۱۵ء میں امیر کابل اور ہندوستانی والیان ریاست کے نام قیصر ولیم اور سلطان ترکی کے خطوط اور جہاد کا فتویٰ لیکر جرمن ترک مشن کے ہمراہ افغانستان گئے۔ افغانستان میں جب حکومت موقتہ ہند کا قیام عمل میں آیا تو راجہ صاحب حکومت موقتہ ہند کے صدر بن گئے۔ جس میں مولانا عبید اللہ سندھی کو وزیر داخلہ مقرر کیا گیا تھا۔

ہندوستان واپس آ کر راجہ صاحب نے مہاراجا ریان تحریک چلائی جس میں آریہ نسل پر مشتمل تمام ممالک کی ایک فیڈریشن بنائی جانی تھی۔ وہ لوک سبھا کے ممبر بھی رہے۔ بندر ابن میں انہوں نے پریم مہاودیالہ بھی قائم کی۔

ڈاکٹر نور محمد

سندھ کے عامل فیملی کے بہت سے دیگر افراد کی طرح شیخ عبدالرحیم کی کوششوں سے جن نوجوانوں نے اسلام قبول کیا ان میں نور محمد بھی تھے۔ انہوں نے اپنی والدہ کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا۔ بعد میں ان کی والدہ نے شیخ عبدالرحیم سے شادی کر لی تھی۔ نور محمد نے بمبئی یونیورسٹی سے M.B.B.S کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اور اپنی طبی خدمات کی وجہ سے بہت جلد شہرت حاصل کر لی تھی۔ وہ حیدرآباد میونسپلٹی کے چیرمین اور سندھ کانگریس کمیٹی کے سکریٹری رہ چکے تھے۔

جب کابل میں حکومت موقتہ ہند کا کام امیر افغانستان کے حکم سے روک دیا گیا تو مولانا سندھی نے

کابل کانگریس کمیٹی بنائی جس کے روح رواں ڈاکٹر نور محمد تھے۔ اس کمیٹی کا الحاق انڈین نیشنل کانگریس سے ہو گیا۔ یہ پہلی کانگریس کمیٹی تھی جو برٹش ایمپائر سے باہر تشکیل دی گئی۔ مولانا سندھی اس کمیٹی کے صدر اور نور محمد سیکریٹری تھے۔ وہ مولانا کے ہمراہ روس بھی گئے تھے۔ مگر روس میں کچھ عرصہ قیام کے بعد افغانستان لوٹ آئے اور اپنا مطب کرتے رہے۔

منصور احمد محمد میاں انصاری

مسلم یونیورسٹی کے پہلے ناظم دینیات عبداللہ انصاری کے بڑے صاحبزادے اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حقیقی نواسے تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں تکمیل کے بعد مختلف مدارس میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد حضرت شیخ الہند کے ساتھ ترجمہ قرآن میں بطور معاون کے کام کیا۔ جمعیتہ الانصار میں مولانا سندھی کے ساتھ نائب نکر عرصہ تک کام کیا اور مولانا سندھی کے ساتھ ان کو بھی جمعیتہ الانصار کو چھوڑنا پڑا۔ ہمیشہ شیخ الہند سے وابستہ رہے۔ شیخ الہند کے ہمراہ سفر حجاز میں رفاقت کی خدمت انجام دیتے رہے۔ مکہ کے گورنر غالب پاشا کا مکتوب اور مختلف ہدایات کے ساتھ شیخ الہند نے انہیں ہندوستان روانہ کیا تا کہ وہ ان ہدایات کی روشنی میں کام انجام دیں۔ یہ خطوط غالب نامہ کے نام سے مشہور ہیں جنہیں شیخ الہند نے ہندوستان اور آزاد قبائل کے عوام کے لئے بھیجا تھا۔ انہوں نے کمال ہوشیاری سے یاغستان کے آزاد علاقے میں پہنچا دیا۔

آپ کا اصل نام محمد میاں تھا مگر جب غالب نامہ لیکر ہندوستان واپس آئے تو برطانوی پولیس سے خود کو بچانے کیلئے اپنا نام منصور انصاری رکھ لیا اور پھر اسی نام سے مشہور ہوئے۔

مولانا سندھی نے کابل میں اپنی سرگرمیوں کے بارے میں ایک خط شیخ الہند کو تحریر کیا تھا جو سیاسی تاریخ میں ”ریشمی خطوط“ کے نام سے مشہور ہے اس کے ہمراہ منصور انصاری کا خط بھی تھا۔ یہ خطوط برطانوی حکومت کے ہاتھ پڑ گئے انہی کی بنیاد پر شیخ الہند اور ان کے رفقاء کی حجاز میں گرفتاری عمل میں آئی۔

جنود ربانیہ میں منصور انصاری کا عہدہ لیفٹیننٹ جنرل کا تھا۔ آپ افغانستان ہی میں قیام

پذیر ہو گئے تھے اور جلال آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں ۱۱ جنوری ۱۹۴۵ء کو وفات پائی۔

مولانا احمد علی

وہ مولانا کے سوتیلے بیٹے بھی تھے۔ ان کے والد حبیب اللہ کے انتقال کے بعد جو مولانا سندھی کی طرح خود بھی سکھ دھرم کو چھوڑ کر مسلمان ہوئے تھے مولانا سندھی نے ان کی بیوہ سے عقد ثانی کر لیا تھا۔ احمد علی کی تعلیم و تربیت مولانا سندھی کی زیر تربیت ہوئی تھی وہ دس برس کی عمر سے ہی مولانا سندھی کے زیر تربیت آ گئے تھے۔ مولانا سندھی نے انہیں دارالارشاد، جمیعۃ الانصار (دیوبند) اور نظارۃ المعارف دہلی میں اپنے ہمراہ رکھا۔ اپنی بیٹی کو ان کے حوالہ عقد میں دیا۔ نظارۃ المعارف میں انہیں مدرس بنایا اور جب مولانا سندھی شیخ الہند کی ہدایت پر افغانستان روانہ ہوئے تو نظارۃ المعارف کا ناظم انہی کو مقرر کیا گیا سرکاری دباؤ کی وجہ سے نظارۃ المعارف کے بند ہونے کے بعد۔ انہیں دہلی سے جھکڑی ڈال کر لاہور لایا گیا۔ مگر بعد کو رہا کر دیا گیا۔ جس کے بعد تقریباً ۴۷ سال لاہور ان کی علمی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ انہیں شیخ التفسیر کے معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

وہ مولانا سندھی کے مایہ ناز شاگرد تھے۔ ان کے طرز تعلیم اور مسلک تفسیر کے حامل و امین۔ انہوں نے لاہور میں بیٹھ کر تقریباً نصف صدی اس کی اشاعت کی، مدارس عربیہ کے فضلاء کے لئے انہوں نے ڈھائی تین مہینے کا نصاب بنایا تھا۔ جو ان مدارس کی تعطیل کے زمانے میں ان سے استفادہ کرنے آتے تھے۔

وہ اگرچہ اپنے استاد مولانا عبید اللہ سندھی کو اپنا سب سے بڑا محسن و مربی سمجھتے تھے اور خود کو ان کا ساختہ و پرداختہ سمجھتے تھے۔ مگر جب مولانا سندھی طویل مدت کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور اپنے بعض خیالات و افکار کا اظہار فرمایا جو مولانا احمد علی کے نزدیک صحیح الخیال علماء اور راسخ العقیدہ جماعت کے عقائد و افکار و مسلک سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ مولانا احمد علی کا خیال تھا کہ مولانا سندھی نے حضرت شیخ الہند کے اتباع سے روگردانی کرتے ہوئے اپنی تحقیق کی راہ الگ نکالی ہے۔ مولانا احمد علی کے نزدیک مولانا سندھی کا یہ ناقابل معافی گناہ تھا۔ انہوں نے واضح طور پر مولانا سندھی سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ بیرون ملک جانے کے بعد وہ رجعت پسندوں

میں گھر کر قرآن حکیم کی روح سے دور ہو گئے تھے۔ ان کے اس طرح الگ ہو جانے سے مولانا سندھی کو رنج بھی ہوا اور شکایت بھی پیدا ہوئی اس لئے کہ وہ مولانا احمد علی سے اس کی توقع بالکل نہیں رکھتے تھے۔

خواجہ عبدالحی فاروقی

پنجاب میں ضلع گورداسپور کے رہنے والے تھے۔ دارالعلوم سے حدیث کی تکمیل حاصل کی۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور سید انور شاہ کے دورہ حدیث میں شاگرد تھے۔ ۱۳۳۱ھ میں جب مولانا سندھی نے ادارہ نظارۃ المعارف قائم کیا تو اس کے اولین طالب علموں میں مولانا احمد علی کے ساتھ وہ بھی تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے درمیان سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر نظر بند بھی ہوئے۔ انہوں نے مولانا سندھی سے ان کی ہجرت سے قبل تفسیر القرآن پڑھی۔

جب جامعہ ملیہ دہلی میں قائم ہوئی تو آپ اس میں تفسیر قرآن کے استاد مقرر ہوئے۔ آخر میں اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامیات کے پروفیسر ہو گئے تھے۔

لاہور میں درس قرآن کا سلسلہ جاری کیا۔ ان کے درس قرآن کا انداز یہ تھا کہ نوجوان طبقہ کو قرآن حکیم کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ وہ صحیح اسلامی روح سے روشناس ہو جائیں۔

مولانا سندھی کے جامعہ ملیہ میں درمیان قیام انہوں نے مولانا سندھی کے افادات کو مرتب فرمایا۔ انہوں نے اپنی کوششوں کا مرکز جامعہ ملیہ کو بنایا۔ ان کے درس سے کم لیکن ان کی تفسیری تصانیف سے علمی حلقوں میں ان کا زیادہ تعارف ہوا۔ ان کی تفسیری کتابوں میں الخلافۃ الکبریٰ، صراط مستقیم، عبرت، برہان، سبیل الرشاد، بصائر اور ذکرئی قابل ذکر ہیں۔

انہوں نے قرآن مجید کی مختلف سورتوں کی علیحدہ علیحدہ تفسیر لکھی ہے۔ یہ تفسیر زبان و بیان کے لحاظ سے بہت سہل ہیں۔

جنور ربانیہ میں ان کا عہدہ کرنل کا تھا۔ جنوری ۱۹۶۵ء کو انتقال فرمایا۔

الف: مقصد:- اتحاددول اسلامی

۹۔ صدباشی (کپتان) ۱۰۰ ۲ یونڈ ۲ یونڈ

۱۰۔ پنجاہ ہاشی (لیفٹیننٹ) ۵۰ ۲ پونڈ ۱ پونڈ

(۲) منصب داران جنود دربانہ

الف: مربی سالار المعظم خلیفۃ المسلمین (ترکی) ۲۔ سلطان احمد شاہ قاچار (ایران) ۳۔ امیر حبیب اللہ خاں (کابل)

ب: مرد میدان:-

۱۔ انور پاشا، ۲۔ ولی عہد دولت عثمانیہ، ۳۔ وزیر اعظم دولت عثمانیہ، ۴۔ عباس حلمی پاشا، ۵۔ شریف مکہ معظمہ، ۶۔ نائب السلطنت کابل سردار نصر اللہ خاں، ۷۔ معین السلطنت کابل سردار عنایت اللہ خاں، ۸۔ نظام حیدر آباد، ۹۔ والی بھوپال، ۱۰۔ نواب رام پور، ۱۱۔ نواب بہاول پور، ۱۲۔ رئیس المجاہدین۔

ج: جنرل یا سالار:

۱۔ حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندی، ۲۔ قائم مقام سالار مولانا عبید اللہ صاحب

د: نائب سالار یا لیفٹیننٹ جنرل:

۱۔ مولانا محی الدین خاں صاحب، ۲۔ مولانا عبدالرحیم صاحب، ۳۔ مولانا غلام محمد صاحب بہاول پور، ۴۔ مولانا تاج محمود صاحب امری، ۵۔ مولوی حسین احمد صاحب مدنی، ۶۔ مولوی حمد اللہ صاحب عرف صاحب ترنگ زئی، ۷۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ۸۔ حکیم عبدالرزاق صاحب، ۹۔ ملا صاحب بابڑا، ۱۰۔ کوہستانی، ۱۱۔ جانصاحب باجوڑ، ۱۲۔ مولوی ابراہیم صاحب کالوی، ۱۳۔ مولوی محمد میاں، ۱۴۔ حاجی سعید احمد انبٹھوی، ۱۵۔ شیخ عبدالعزیز شادیش، ۱۶۔ مولوی عبدالکریم صاحب نائب رئیس المجاہدین، ۱۷۔ مولوی عبد العزیز رحیم آبادی، ۱۸۔ مولوی عبدالرحیم عظیم آبادی، ۱۹۔ مولوی عبداللہ غازی پوری، ۲۰۔ نواب ضمیر الدین احمد، ۲۱۔ مولوی عبدالباری صاحب، ۲۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ۲۳۔ مولانا محمد علی، ۲۴۔ مولانا شوکت علی، ۲۵۔ مولانا ظفر علی، ۲۶۔ مولانا حسرت موہانی،

۲۷۔ مولوی عبدالقادر قصوری، ۲۸۔ مولوی برکت اللہ بھوپالی، ۲۹۔ پیر اسد اللہ شاہ سندھی۔

۳۔ معین سالار (میجر جنرل)

۱۔ مولوی سیف الرحمن، ۲۔ مولوی محمد حسن مراد آبادی، ۳۔ مولوی عبداللہ انصاری، ۴۔ میر سراج الدین بہاول پوری، ۵۔ باچا ملا عبدالخالق، ۶۔ مولوی بشیر رئیس المجاہدین، ۷۔ شیخ ابراہیم سندھی، ۸۔ مولوی محمد علی قصوری، ۹۔ سید سلیمان ندوی، ۱۰۔ عبداللہ عمادی، ۱۱۔ غلام حسین آزاد سجانی، ۱۲۔ کاظم بے، ۱۳۔ خوشی محمد، ۱۴۔ مولوی ثناء اللہ، ۱۵۔ مولوی عبدالباری مہاجر وکیل حکومت موقتہ ہند

۴۔ ضابطہ (کرنل):

۱۔ شیخ عبدالقادر مہاجر، ۲۔ شجاع اللہ مہاجر نائب وکیل دولت موقتہ ہند، ۳۔ مولوی عبدالعزیز وکیل وفد حزب اللہ یاغستان، ۴۔ مولوی فضل ربی، ۵۔ مولوی عبدالحق لاہوری، ۶۔ میاں فضل اللہ، ۷۔ صدر الدین، ۸۔ مولوی عبداللہ لغاری، ۹۔ مولوی ابو محمد احمد لاہوری، ۱۰۔ مولوی احمد علی نائب ناظم نظارۃ المعارف، ۱۱۔ شیخ عبدالرحیم سندھی، ۱۲۔ مولوی محمد صادق کراچی، ۱۳۔ مولوی ولی محمد، ۱۴۔ مولوی عزیز گل، ۱۵۔ خواجہ عبدالحی، ۱۶۔ قاضی ضیاء الدین ایم اے، ۱۷۔ مولوی ابراہیم سیالکوٹی، ۱۸۔ عبدالرشید بی اے، ۱۹۔ مولوی ظہور محمد، ۲۰۔ مولوی محمد مبین، ۲۱۔ مولوی محمد یوسف گنگوہی، ۲۲۔ مولوی رشید احمد انصاری، ۲۳۔ مولوی عبدالسلام فاروقی، ۲۴۔ حاجی احمد جان سہارن پوری۔

۵۔ نائب ضابطہ (لیفٹیننٹ کرنل):

۱۔ ظفر حسن بی اے مہاجر، ۲۔ اللہ نواز خاں بی اے مہاجر، ۳۔ رحمت علی بی اے مہاجر، ۴۔ عبدالمجید بی اے مہاجر، ۵۔ حاجی شاہ بخش سندھی، ۶۔ مولوی عبدالقادر دین پوری، ۷۔ مولوی غلام نبی، ۸۔ محمد علی سندھی، ۹۔ حبیب اللہ۔

س:- میجر:-

۱- شاہ نواز- ۲- عبدالرحمن- ۳- عبدالحق-

ص:- کپتان- ۱- محمد سلیم، ۲- کرم بخش

ط:- لیفٹیننٹ- ۱- قادر شاہ-

نوٹ:- ایک اور فہرست میں محمد علی سندھی اور حبیب اللہ کا نام میجر کی فہرست میں درج ہے۔

مہابھارت سروراجیہ پارٹی کا پروگرام

”کانگریس کمیٹی ہائیل“ نیشنل کانگریس میں ایک مستقل پارٹی لی اہار ملتی ہے۔ جو ملک میں سروراجیہ حکومت پیدا کرے گی ”سروراجیہ اصول“ پر حکومت کے لیے ضروری ہے کہ :

(الف) ملک کے بڑے ”بقول یعنی کاشتکار، مزدور اور دماغی محنت کش“ پارٹی سے اس لیے زمیندار سرمایہ دار کی طرح جمہوری گورنمنٹ کے ہر ایک شعبہ میں نمائندگی کا حق ان کی تعداد کے مطابق دیکر اسے محفوظ کر دیا جائے

(ب) اقتصادی نظام مستقل طور پر ایسا قائم کیا جائے جو محنت کش طبقہ یعنی کاشتکار، مزدور اور دماغی محنت کش کو قرض و افلاس سے بچانے کا نامن ہو اور ملک کو ایسے خارجی قرضہ کا محتاج نہ بنائے جس سے سیاسی آزادی سلب ہونے کا خطرہ پیدا ہو سکے۔ اس پارٹی کا نام ”مہابھارت سروراجیہ پارٹی“ ہوگا۔

اصول و مقاصد: مہابھارت سروراجیہ پارٹی اپنے سروراجی اصول کی اساس پر مقاصد ذیل کے لیے جدوجہد جاری رکھے گی:

- (الف) ہندستان کی مکمل آزادی حاصل کرنا، ملک میں جمہوری نظام قائم کرنا، ہندستان کے مختلف ممالک کو ایک ملک فرض کر کے نئی ہندستانی واحد قومیت پیدا کرنے کی کوشش کو اساس آزادی نہ بنانا۔
- (ب) آزاد ہند کو ملکیت اور سرمایہ داری سے ہمیشہ کے لیے پاک کرنا اور اسے انسانی سوسائٹی کے لیے ایک نمونہ بنانا۔
- (ج) تمام ہندستانی اقوام کو نظام توافقی (فیڈرل نظام) میں جمع کرنا۔
- (د) ایشیائی اقوام میں ایمراطوری اور سرمایہ داری کے خلاف ایک توافقی اور راجیہ ایشیائی فیڈریشن پیدا کرنا۔
- (ه) اقوام عالم میں مشرق کو اس کا حق دلوانا۔

۳۔ ہندستان کا رقبہ یورپ بہ استثنائے روس کے برابر ہے اس کے مختلف صوبوں کی آبادی میں زبان و معاشرت اور تمدن کے گہرے اساسی اختلاف موجود ہیں سروراجیہ پارٹی ”یقین رکھتی ہے“ کہ یہی اس قسم کے اختلافات ضرور موجود رہیں گے جیسے آج کل یورپین اقوام میں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے ”راجیہ پارٹی“ ہندستان میں کسی غیر

طبی اتحاد کو اساس آزادی قرار دینے سے قطعاً انکار کرتی ہے۔

(الف) مہا بھارت سروراجیہ پارٹی ہر ایک ہندوستانی ملک کے محنت کش طبقہ کی جدوجہد پر اس ملک کی آزادی کو منحصر سمجھتی ہے۔

(ب) نظام توانق (نیشنل سسٹم) کے سوا اور کسی نظام کو ہندوستانی وحدت قائم رکھنے والا نہیں مانتی۔

۴۔ پارٹی نیشنل کانگریس کو اپنے اصول و مقاصد منوانے کی جدوجہد برابر جاری رکھے گی۔

(الف) مہا بھارت سروراجیہ پارٹی نیشنل کانگریس کرپڈ کی پابندی نہایت سختی سے اپنے اوپر عاید کرتی ہے۔ تاکہ پارٹی نظام بے قاعدہ اشت و غوغا سے محفوظ رہے، لیکن نیشنل کانگریس کی مجلس عاملہ میں اس وقت تک شریک نہ ہوگی جب تک پارٹی کسی چھوٹی یا بڑی کانگریس کمیٹی میں اکثریت حاصل نہیں کر لیتی۔

(ب) مہا بھارت سروراجیہ پارٹی آزادی کی جدوجہد کو برطانوی مقبوضات تک محدود نہیں رکھے گی بلکہ ہندوستانی ریاستوں کو بھی اپنے دائرہ عمل میں شامل کرتی ہے۔

(ج) مہا بھارت سروراجیہ پارٹی اپنی سیاسی جدوجہد میں تمام ایسی ہندوستانی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ اشتراک عمل کرے گی جو ہندوستان کی کامل آزادی کو اپنا مقصد قرار دیتی ہیں اور نظام سرمایہ داری کی کسی طرح بھی تائید نہیں کرتیں۔

مرکز و میدان عمل: "مہا بھارت سروراجیہ پارٹی" کا مستقل مرکز "دہلی" ہوگا اور ثانوی مراکز "لاہور" اور "آگرہ" رہیں گے۔

۵۔ م، س، پارٹی ہندوستان کے تین تدرقی حصوں یعنی شمال مغربی، شمال مشرقی اور دکن میں سے اس حصہ کو جس میں دہلی واقع ہے، بطور نمونہ اپنا مرکزی میدان عمل قرار دیتی ہے اور اسے "سروراجیہ ہند" کے نام سے موسوم کرے گی۔ م، س، پارٹی فی الحال سروراجیہ ہند کے حدود اس طرح مقرر کرتی ہے۔ اس کے شمال میں بھیل مانسور، کوہ ہمالیہ، قرہ کوٹا اور ہندو کش۔ اس کے مشرق میں نیپال، بنارس اور دریائے چنبیل۔ اس کے جنوب میں دریائے نرپدا اور بحیرہ عرب۔ اس کے مغرب میں افغانستان و ایران۔

۷۔ "سروراجیہ ہند" کو "م، س، پارٹی" ایسے ملکوں میں تقسیم کرے گی جہاں ایک قوم آباد ہے جو ایک زبان بولتی ہے جس کی معاشرت میں عوامیکسانی پائی جاتی ہے ان ممالک میں ہر ایک ملک "سروراجی" ملک کہلائے گا۔

(الف) ایک ابتدائی تجویز کے طور پر م، س، پارٹی سروراجی ہند (یعنی شمال مغربی حصے) کو دس سروراجی ملکوں میں تقسیم کرتی ہے۔

- (۱) "بھارت" جس کی زبان ہندستانی (اردو) ہے اس میں دو آبہ گنگا، جمنہ، اور لکھنؤ شامل ہیں اس کے مرکزی شہر 'دہلی' اور 'آگرہ' ہیں۔
- (۲) جنوب مشرقی پنجاب، جس کا مرکزی شہر 'امرتسر' ہے اور زبان پنجابی ہے۔
- (۳) شمال مغربی پنجاب، جس کی زبان پوٹھوہاری پنجابی ہے۔ مرکزی شہر 'لاہور' ہے۔
- (۴) 'جنوب مغربی پنجاب' جس میں ریاست بہار و پور و اخل ہے اس کا مرکزی شہر 'مٹان' اور زبان 'مٹانی' پنجابی ہے۔ لاہور تینوں جمہوریتوں کے نظام سے خارج رہے گا۔
- (۵) 'کشمیر' جس کی زبان کشمیری ہے اور مرکزی شہر 'سری نگر' ہے۔
- (۶) 'پشتانہ' (یعنی صوبہ سرحدی شمالی مغربی) جس کی زبان پشتو اور مرکزی شہر 'پشاور' ہے۔
- (۷) 'بلوچستان' جس کی زبان بلوچی اور مرکزی شہر 'کوئٹہ' و 'قلات' ہیں۔
- (۸) 'سندھ' جس کی زبان سندھی اور مرکزی شہر 'کراچی' ہے۔
- (۹) 'گجرات' جس کی زبان گجراتی اور مرکزی شہر 'احمد آباد' ہے۔
- (۱۰) 'راجپوتانہ' اس کی زبان ہندستانی (ہندی) اور مرکزی شہر 'اجیر' ہے۔

(ب) ہر ایک سروراجی ملک مستقبل میں ایک 'سروراجی جمہوریہ' ہوگا۔ اپنی اقتصادی، تمدنی اور سیاسی آزادی محفوظ رکھتے ہوئے 'متوافق جمہوریات ہند' (= انڈین فیڈرل ری پبلکس) کے لیے اکائی بنے گا۔

ممبر اور رضا کار : ۸۔ ہر ایک سروراجی ملک کا باشندہ مرد و عورت بلا تفریق نسل و مذہب اپنے ملک کی 'سروراجیہ پارٹی' کا ممبر بن سکتا ہے اگر وہ :

(الف) نیشنل کانگریس کرڈ مانتا ہو۔

(ب) سروراجیہ پارٹی کے اصول و مقاصد اور پروگرام کو وفاداری سے مانتا ہو۔

(ج) پارٹی کے انضباطی احکام کی پابندی کا یقین دلائے۔

(د) اپنی ضروریات زندگی اپنے ملک کے متوسط الحال زراعت پیشہ اشخاص سے نہ بڑھائے۔

(ه) اپنی ضروریات زندگی سے زائد جائداد اگر رکھتا ہو تو پارٹی کے نام منتقل کر دے۔

تشریح : جب تک پارٹی ممبروں کی جائداد کو اپنی تحویل میں لینے کا فیصلہ کرے اس وقت تک وہ جائداد ان ہی ممبروں کے پاس امانت رہے گی۔

۹۔ ہر ایک سروراجی ملک کا باشندہ مرد و عورت بلا تفریق نسل و مذہب اپنے ملک کی 'سروراجیہ پارٹی' کا

رضا کار بن سکتا ہے اگر وہ ممبری کی پہلی تین شرطیں پوری کرتا ہو۔

(الف) ہر ایک رضا کار کا فرض ہوگا کہ اگر وہ ایک ہندوستانی عورت یا ایک ہندوستانی مذہبی مقدس مقام کو خطہ میں دیکھے تو اس کی مدافعت میں جان تک لڑا دینے سے دریغ نہ کرے۔

(ب) ہر ایک ہندو رضا کار نہ صرف پرانے اچھوتوں سے برابری کا سلوک کرے گا بلکہ اس کا فرض ہوگا کہ تمام ایسے لوگوں کے ساتھ جنہوں نے ہندوستان کو مستقل طور پر اپنا وطن بنالیا ہے بلا تفریق نسل و مذہب مساوات اور محبت کا سلوک کرے۔

(ج) ہر ایک مسلمان رضا کار کا فرض ہوگا کہ وہ گاؤں کو کشی بند کرنے میں کانگریس کمیٹی کا بل کے حسب ذیل فیصلہ کا پابند رہے:

فیصلہ: 'کانگریس کمیٹی کا بل' کو معلوم ہے کہ اسلامی دنیا کے تمام اہل الرائے اپنی محبت کا واحد سبب ہندوستانی غلامی کو قرار دیتے ہیں اور جب انہیں بتلایا جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا گاؤں کو کشی پر اصرار کرنا بھی ہندوستان کی آزادی میں ایک رکاوٹ ہے تو وہ ہندوستانی مسلمانوں کے اس طرز عمل کو سخت نفرت سے دیکھتے ہیں اس لیے کانگریس کمیٹی کا بل، کا فیصلہ ہے کہ کم از کم مغلوط آبادی میں گاؤں کو کشی قطعاً بند کر دی جائے۔

۱۰۔ ایک مکمل جیش رضا کاران میں (۳۰۰) رضا کار ہوں گے جس کے دس دسے رضا کار افسروں کے ماتحت کام کریں گے۔ لیکن اس کی قیادت تین پارٹی ممبروں یعنی ایک 'قائد' اور دو 'نائب قائد' کے ہاتھ میں ہوگی۔

بجلاس آمرہ و عالمہ: ۱۱۔ جس وقت ایک سروراجی ملک میں کم از کم (۱۰۰) پارٹی ممبر پیدا ہو جائیں گے اور ایک جیش رضا کاراں مرتب ہو جائے گا، تو ممبروں اور رضا کاروں کی مشورہ کانفرنس منعقد ہوگی جسے اس ملک کی 'سروراجیہ کانفرنس' کہا جائے گا۔ اس کانفرنس میں ان تمام پارٹیوں کے ممبر بطور مشیر شامل ہو سکتے ہیں جن کے ساتھ 'سروراجی پارٹی' اشتراک عمل کا فیصلہ کر چکی ہے۔ لیکن رائے دینے کا حق پارٹی ممبروں اور رضا کاروں تک محدود رہے گا۔

(الف) سروراجیہ کانفرنس اپنے ملک کی سروراجیہ پارٹی کے تمام قانونی، مالی اور انتظامی اختیارات کی مالک ہے۔ کانفرنس اس قانون اساسی کی تشریح و تکمیل کرے گی۔ بیس پارٹی ممبروں پر مشتمل اپنی 'سروراجیہ عالمہ کمیٹی' منتخب کرے گی۔ جسے انتظامی اور مالی اختیارات حاصل ہوں گے۔ کانفرنس اس کی تمام کارروائی کی نگرانی و تصدیق کرتی ہے۔

(ب) ہر 'سروراجیہ کانفرنس' کا - ب سے پہلا کام دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے:

اول : یہ کہ اپنے ملک کے حاجت مند محنت کش طبقہ کا پرانا حق ادا کرے انہیں دوبارہ قرض میں مبتلا ہونے سے پہلے اور جہاں مسلمانوں کا افلاس کاؤکشی بند کرنے میں مانع ہو ان کی امداد کرے ۔

دویم : یہ کہ برطانوی قرض ہند جو سیاسی آزادی کو سلب کر رہا ہے اس کا جس قدر حصہ اس ملک پر عائد ہوتا ہے اس کو ایسے قرض میں تبدیل کرے جس میں سیاسی آزادی سلب ہونے کا خطرہ نہ ہو ۔

(ج) اس کام کی تکمیل کے لیے 'کانفرنس' مختلف صورتوں میں پارٹی فنڈ جمع کرے گی ۔

(۱) پارٹی ممبروں کی منتقلہ جائداد اپنے قبضہ میں لے گی ۔

(۲) مستطیع رضا کاروں سے چندہ لیا کرے گی ۔

(۳) سوشل ریفارمرز اور حامیان انسانیت سے صدقات وصول کرے گی ۔

(۴) ملک کے ہر ایک متنفذ سے اقتصادی آزادی حاصل کرنے کے لیے ٹیکس آزادی وصول کرے گی ۔

(د) اولاً اپنے ملک میں ثانیاً دوسرے سروراجیہ ملکوں میں اور ہندوستان کے دوسرے حصوں سے قرض حاصل کریگی ۔

(۵) ہر 'سروراجیہ کانفرنس' کا اصلی اور اہم کام اپنے ملک کی 'سروراجیہ تہذیب' پیدا کرنا ہے اس لیے وہ محنت کش طبقہ کو سیاسیات کی تعلیم دے گی ۔ ان کی تنظیمات اس طرح درست کہے گی کہ وہ اپنے ملک کی حکومت کے ہر ایک شعبہ میں اپنے تعداد نفوس کے مطابق نمائندگی حاصل کر سکیں ۔

(۶) 'سروراجیہ عالم کمیٹی' ایک سال کے لیے منتخب ہوا کرے گی اور کانفرنس سال میں دو دفعہ ماہ حمل (اپریل) اور ماہ میزان (اکتوبر) میں منعقد ہوگی ۔

(ز) بوقت ضرورت سروراجیہ عالم کمیٹی کے فیصلہ پر یا تیس ممبروں کی متفقہ درخواست پر کانفرنس بلائی جاسکتی ہے ۔

۱۲- 'سروراجیہ عالم کمیٹی' اپنے خاص کاموں کے لیے چھ ماتحت انجمنیں بنائے گی جن میں کمیٹی پارٹی ممبروں کے ساتھ رضا کار بھی اپنے انتخاب میں شامل کرے گی ۔ بوقت ضرورت ان انجمنوں میں پارٹی پروگرام سے ہمدردی رکھنے والے تنخواہ دار اصحاب بھی شامل کیے جاسکتے ہیں ۔

(الف) 'انجمن تنظیم' جو ایک پرگنہ، تحصیل اور ضلع میں اپنا دفتر کھولے گی جو :

(۱) کسان سبھائیں ، انجمن مزدوریں ، دماغی محنت کش کی محفل اور طالب علموں کی مسامرہ قائم کریں گی ۔ یا ایسی

مجامع کو اپنی تنظیم میں شامل کریں گی ۔

(۲) پارٹی فنڈ جمع کریں گی جس میں ممبروں کی منتقل شدہ جائدادیں پارٹی کا قرض ٹیکس آزادی اور وہ تمام مالی امداد

داخل ہے جو انسانیت کے ہمدرد اور سوراخ کے ہمدرد لوگوں سے ملے۔

(۳) محنت کش طبقہ کے حاجت مند افراد کی فہرستیں تیار کریں گی کہ ان پر کس قدر قرض ہے اور مستقبل میں ان کو کس قدر روپیہ بطور امداد اور کس قدر بطور قرض بلا سود ملنا چاہیے۔

(ب) ”انجمن نشر تشویقات“ جو اپنے ملک کی عام زبان میں ایک ”سروراجیہ اخبار“ جاری کریں گے۔ پارٹی پروگرام کے متعلق لٹریچر ایک لائبریری میں جمع کریں گے جس کی شاخیں ہر دفتر تنظیم کے ساتھ قائم ہوں گی۔ ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں پارٹی پروگرام بطور نصاب داخل کرانے کی کوشش کریں گے۔ ایسے مکاتب بنائے جائیں گے جن میں پارٹی پروگرام پڑھانے کے لیے اعلیٰ معلم تیار ہوں۔

(ج) ”انجمن انضباط“ جس میں پارٹی ممبروں اور رضا کاروں کے سوا اور کوئی شامل نہیں ہو سکتا، پارٹی ممبر اور رضا کار بھرتی کریں گے۔ انضباط کیلئے ہدایات نافذ کیا کریں گے۔ ان کی خدمات کا حساب لیا کریں گے۔ اس انجمن کے احکام ممبروں اور رضا کاروں کے لیے قطعی ہوں گے۔

(د) ”انجمن کوآپریٹو بنک“ (جس میں مالیات کے تنخواہ دار ماہر بھی شامل کیے جائیں گے) پارٹی فنڈت ایک ”سروراجیہ کوآپریٹو بنک“ کی بنیاد ڈالی جائے گی اس میں:

(۱) حامیان انسانیت، سوشل ریفارمرز، ہمدردان سوراخ کے صدقات جمع کیے جائیں گے جو محنت کش طبقہ سے حاجت مندوں کو بطور امداد یا بطور قرض بلا سود دینے جائیں گے اسی سے اس طبقہ کے پرانے قرض ادا کیے جائیں گے۔

(۲) کاروباری لوگوں کے ٹوٹا اور محنت کش طبقہ کی امانتیں خصوصاً اس میں نجی کی جائیں گی اور سوسائٹیوں میں بہ طور سرمایہ لگائی جائیں گی اور باب الاموال بجائے سود لینے کے نفع و نقصان میں شریک رہیں گے۔

(۳) ”سروراجیہ بنک“، یہ دینی ہانک سے سودی لین دین کرنے پر مجبور ہے اسے سستی قرار دے کر یہ بنک سروراجیہ ہند میں کسی طرح کا سودی لین دین نہیں کرے گا۔

(۴) ”انجمن مجالس امداد باہمی“ سروراجیہ بنک سے سرمایہ لے کر سروراجیہ تسلیت ہائے تعاون کمولی جائیگی جو ذراعت پیداوار اور ضروریات محنت کش طبقہ کی تجارت کریں گی۔ محنت کش طبقہ میں امداد اور قرض بلا سود ان ہی شکلوں کے توسط سے تقسیم ہوگا۔

(۵) ”انجمن محاسبہ دیون“ جو:

(۱) مقروض محنت کش طبقہ کے پرانے قرض کی ادائیگی اپنے ذمہ لے کر بنچایتی فیصلے سے قوم واجب الادا معین

کرے گی جس کو سروراجیہ بینک اپنے صیغہ جمع صدقات سے ادا کرے گا۔

(۲) ”برطانوی قرضہ ہند“ کا جس قدر حصہ اس ملک پر عائد ہوتا ہے اس کی ایکسٹریکٹ کے لیے سوسائٹی کی مختلف طبقات کے مناسب شرح ”ٹیکس آزادی“ معین کرے گی اپنے ملک سے قرض آزادی کے ”سروراجیہ ہند“ اور ہندستان کے دوسرے حصوں میں قرض آزادی کا انتظام کرے گی۔

۱۳۔ ”سروراجیہ کانفرنس“ منعقد ہونے سے پہلے جس وقت ایک ’سروراجی ملک‘ میں پارٹی ممبروں کی تعداد بیس تک پہنچ جائے تو وہ اپنے ملک کے لیے ’انجمن نشر تشویقات‘ بنائیں گی۔ جو عارضی طور پر اس ملک کی ’سروراجیہ عالمہ کمیٹی‘ کے تمام فرائض انجام دے گی۔

۱۴۔ کم از کم تین سروراجی ملکوں کے تین سو (۳۰۰) پارٹی ممبروں اور نو سو (۹۰۰) رضا کاروں کی مشترکہ کانگریس ”سروراجیہ ہند“ کی تمام پارٹیوں کے باہمی معاملات اور خارجہ تعلقات میں اعلیٰ اختیارات کی مالک ہے اسے ”مہابھارت سروراجیہ کانگریس“ کہا جائے گا۔

اس کانگریس میں ان تمام پارٹیوں کے ممبر یہ طور مشترکہ ہو سکیں گے۔ جن کے ساتھ پارٹی اشتراک عمل کا فیصلہ کر چکی ہے لیکن ان کو رائے دینے کا حق حاصل نہ ہوگا۔

(الف) یہ کانگریس اس اساسی قانون کی ایسی دفعات کی تشریح و تکمیل کرے گی جو ان مطالب سے تعلق رکھتے ہیں نیز اپنے انتظامی مالی اور عدالتی اختیارات اپنی نمائندہ مجلس ’مہابھارت سروراجیہ کمیٹی‘ کو تفویض کرے اس کی کارروائیوں کی نگرانی و تصدیق کرتی رہے گی۔

(ب) یہ کانگریس سال میں ایک دفعہ انعقاد پذیر ہوگی۔ اس کے اجلاس دوسروں میں تقسیم ہوں گے۔

اول : سروراجیہ ہند کے داخلی معاملات کے متعلق۔

دویم : سروراجیہ توافقی ایشیائی کے خارجہ معاملات کے متعلق اس کانگریس کے لیے ایک مستقل قانون بنایا جائیگا۔

(ج) اس کانگریس کا پہلا کام دو حصوں میں منقسم ہے :

اول : یہ کہ طبقہ محنت کش کی ضروریات پورا کرنے میں جس سروراجی ملک کو قرض کی ضرورت ہو اس کے لیے دوسرے

سروراجی ملکوں اور ہندستان کے دوسرے حصوں سے قرض حاصل کرنے کا انتظام کرے۔

دویم : یہ کہ ”سروراجیہ ہند“ پر جس قدر ”برطانوی قرضہ“ عائد ہوتا ہے اسے ایسے قرض میں تبدیل کرنے کے لیے جس

سے سیاسی آزادی کو نقصان نہ پہنچتا ہو، بیرونی ملکوں سے قرض لینے کا انتظام کرے اس کے لیے یہ کانگریس

ایک "مرکزی سروراجیہ کوآپریٹو بینک دہلی" قائم کرے گی جس سے تمام سروراجی کوآپریٹو بینک وابستہ ہوں گے اور جسکی شاخیں ایشیائی ممالک میں اور انجینیاں یورپ و امریکہ میں کھولی جائیں گی۔

(د) اس کانگریس کا دوسرا کام یہ ہے کہ "سروراجیہ متوافق یعنی وفاقی جمہوریات ہند" پیدا کرے اس کے ذریعے کانگریس سروراجی ملکوں کی مدد میں و مشغف کرے گی قومی اور مذہبی اختلافات کا تصفیہ کرنے والی عدالتیں اور پنچائتیں بنائے گی۔

اس کانگریس کا خارجہ معاملات میں "سروراجیہ متوافق ایشیائی" پیدا کرنا اہم کام ہے اس کے لیے اس کانگریس کے اجلاسوں میں ایشیائی اقوام شامل ہوں گی۔

(و) یہ کانگریس ایشیائی ممالک میں "سروراجیہ متوافق ایشیائی" کے مراکز اور یورپ امریکہ میں سروراجیہ دفاتر استخبارات (انفارمیشن بیورڈ) کھولے گی۔

۱۵۔ مہابھارت سروراجیہ یعنی مرکزی میں ایک سو (۱۰۰) پارٹی ممبر ہوں گے اس کی مختلف انجمنوں میں پارٹی ممبروں کے سوا اور کوئی شریک نہ ہو سکے گا۔

اس مرکزی کمیٹی میں ہر ایک سروراجی ملک کے ممبر اس ملک کی تعداد نفوس کے لحاظ سے منتخب ہوں گے۔
۱۶۔ جس وقت تک "مہابھارت سروراجیہ مرکزی کمیٹی" منتخب نہیں ہوتی عارضی طور پر کانگریس (سروراجیہ) کمیٹی کا بل اس کے تمام فرائض انجام دے گی۔

(الف) کانگریس سروراجیہ کمیٹی کا بل جب تک "مہابھارت سروراجیہ مرکزی کمیٹی" کی باقاعدہ نمائندگی نہیں حاصل کرتی، اس وقت تک کسی خارجی اقتصادی معاملہ کی تکمیل نہیں کر سکتی۔

(ب) کانگریس سروراجیہ کمیٹی کا بل اپنی ضرورت کے موافق ایشیائی ممالک میں اپنا مرکز تبدیل کر سکتی ہے۔
۱۷۔ ہر ایک سروراجیہ جمہوریہ میں تمام ایسے لڑکے اور لڑکیوں کے لیے جو مدر سے جانے کی عمر رکھتے ہیں ابتدائی مفت اور لازمی تعلیم کا اور ثانوی مفت تعلیم کا انتظام کرنا حکومت کا فرض ہوگا۔

(الف) یہ بھی ضروری ہے کہ مکتب نہ جانے والے مرد و عورت کے لیے تعلیم کا خاص انتظام کیا جائے۔

(ب) م، س، پارٹی اردو رسم الخط کو ایسے لوگوں کی آسانی کے لیے مقطوع حروف میں لکھنے کی تائید کرتی ہے۔

۱۸۔ ہر ایک سروراجیہ جمہوریہ میں:

(الف) کسانوں اور ان سے تعلق رکھنے والے پیشہ وروں کی "کسان سبھائیں"

(ب) فیکٹری اور کارخانہ میں کام کرنے والے مزدوروں کی "انجمن ہائے مزدوران"

(ج) دفاتر اور تعلیم گاہوں میں کام کرنے والوں کی "محافل محنت کشاں دماغی" بنانے کا ناقابل تنسیخ حق محنت کش طبقہ کو حاصل ہوگا جن مجالس کے توسط سے وہ لوگ اپنے مطالبات پیش کریں گے اور انتخابات میں حصہ لیں گے۔ محنت کش طبقہ کو حکومت سے ناراض ہونے کی صورت میں بھی ان مجالس کے فیصلے پراسٹراک کا حق حاصل ہوگا۔

۱۹۔ سروراجیہ جمہوریہ کی بنیاد (پارلیمنٹ) کو تمام قانونی مالی اور عدالتی اختیارات حاصل ہوں گے۔ اسکے انتخابات مندرجہ ذیل طریقہ پر عمل میں آئیں گے۔

(الف) ہر عاقل بالغ مرد و عورت کو جو کسی اخلاقی جرم میں سزا لیب نہ ہو چکا ہو اس بنیاد کے انتخابات میں رائے دینے کا حق حاصل ہوگا۔

(ب) کسانوں، مزدوروں اور دماغی محنت کشوں کو اپنی سبھاؤں، انجمنوں اور مفلوں کے توسط سے اپنی تناسب آبادی کے مطابق نمائندے بھیجنے کا حق حاصل ہوگا۔

(ج) سوسائٹی کی دوسری جماعتوں یعنی زمیندار، ساہوکار سرمایہ دار اور تاجر کو ان کی تعداد نفوس کے مطابق حق نمائندگی ملے گا۔ کسی صورت میں بھی انکی اہمیت کی بنا پر ان کو تعداد نفوس سے زیادہ حق نمائندگی نہیں دیا جائے گا۔

(د) ان مالدار جماعتوں میں سے اگر کوئی صنف (جماعت) سروراجیہ جمہوریہ کے اقتصادی و سیاسی اصول ساسیہ کی مخالفت کرے گی تو ایک محدود وقت تک اس کا حق نمائندگی سلب کیا جاسکتا ہے۔ جس کے لیے علیحدہ قانون بنایا جائیگا۔

۲۰۔ فوائد عامہ کے تمام ذرائع قومی ملکیت قرار دیئے جائیں گے۔

۲۱۔ انفرادی ملکیت (منقولہ و غیر منقولہ) محدود کر دی جائیں گی۔ معین حد سے زیادہ جائیداد قومی ملکیت قرار دی جائیگی۔

(الف) ادنیٰ درجہ ملکیت کی تشخیص "سروراجیہ کانفرنس" کا کام ہے۔

(ب) مالداروں پر متنازع ٹیکس لگایا جائے گا جس کی آخری حد (۵۰) فیصد تک ہوگی۔

۲۲۔ ملک کی اراضی قومی ملکیت قرار دی جائے گی۔ اور نظام زمینداری منسوخ کر دیا جائے گا۔ کسان اور گورنمنٹ کے سوا کسی کو اراضی سے تعلق نہ ہوگا۔

(الف) سروراجیہ ہند کی ان جمہوریتوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ م، س، پارٹی فاروق اعظم کے فیصلہ کے مطابق زمینداروں کو ملکیت اراضی چھوڑنے اور امام ابوحنیفہ کے فیصلہ کے مطابق متہ چھوڑنے پر مجبور کرے گی۔ زمینداروں کو فقط گورنمنٹ ایجنٹ کے طور پر کام کرنے کا موقع دیا جائے گا۔

(ب) ایسا ہی طرز عمل "سروراجیہ ہند" کی ان تمام جمہوریتوں میں اختیار کیا جائے گا۔ جہاں اکثریت آبادی کا مذہب اس اصول کی تائید کرتا ہے یا سیاسی بیداری عام ہو چکی ہے۔

(ج) جن جمہوریتوں میں اکثریت آبادی کا مذہب اس کی تائید نہیں کرتا اور وہاں سیاسی بیداری بھی عام نہیں ہے تو ان جمہوریتوں میں اولاً ملکیت زمین محدود کرنے پر اکتفا کیا جائے گا اور سیاسی بیداری عام ہونے پر اراضی کی انفرادی ملکیت منسوخ کر دی جائے گی۔

(د) ہر کاشتکار نہانڈان کو اس قدر اراضی ضروری دی جائے گی جس قدر وہ خود کاشت کر سکے اس زمین پر اس خاندان کا دوا می حق کاشت ایسے قانون کے ماتحت محفوظ کر دیا جائے گا جو کسان سبھاؤں کی کونسل کے مشورے سے بنایا جائے گا۔

(۵) کاشتکار سے گورنمنٹ کل پیداوار کا $\frac{1}{5}$ حصہ کسان سبھاؤں کے توسط سے بطور خراج وصول کرے گی۔

(و) قومی ملکیت میں دی ہوئی اراضی کا انتظام گورنمنٹ کسان سبھاؤں کی کونسلوں کے زیر اہتمام رکھے گی۔

(ز) کسان سبھاؤں کو سرکاری امداد بہ صورت قرض بلا سود دی جائے گی۔ اور ان کے لیے زراعتی مشینری نرم شرائط ادائیگی پر مہیا کی جائے گی۔

(ح) کسان آبادی کے لیے حکومت مفت طبی امداد کا انتظام کرے گی۔

۲۳۔ سودی لین دین قلمبند کر دیا جائے گا۔ محنت کش طبقہ کے پرانے قرض بے باق کر دیے جائیں گے۔ چٹانڈوں کو امداد یا قرض بلا سود دینے کا مستقل انتظام ہوگا۔

۲۴۔ داخلی تجارت سروراجیہ کو آپریٹو بک سوسائٹیوں کے ذریعہ اور خارجی تجارت "حکومت متوافقہ جمہوریا ہند" کے توسط سے عمل میں آئیں گی۔ تجارت پیشہ افراد کو ان سوسائٹیوں میں شرکت کا موقع دیا جائے گا۔

۲۵۔ قومی ملکیت میں دیے ہوئے کارخانے اور فیکٹریاں انجمن مزدوران کی کونسلوں کے زیر اہتمام چلائی جائیں گی اور مزدوروں کو نفع میں حصہ دیا جائے گا۔

(الف) مزدوروں کے کام کا ایک دن ۶ گھنٹے سمجھا جائے گا۔ ہندوستانی مزدور کو سرملکوں کے مزدوروں کی طرح ۶ گھنٹے سے زیادہ کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ م، س، پارٹی دماغی محنت کشوں اور جسمانی محنت کشوں میں تفریق سوسائٹی کے لیے بھی مضر سمجھتی ہے۔

(ب) مزدوروں کی ادنیٰ شرح مزدوری حکومت کے قانون سے مقرر ہوگی اور اسی طرح بچوں اور عورتوں کے اوقات محنت اور بڑھاپے، بیماری، حادثہ، حمل اور بیماری کے لیے الاؤنس خاص قانون میں تعین کیے جائیں گے ان قوانین پر انجمن

مزدوران کے مطالبہ پر نظر ثانی ہوتی رہے گی۔

(ج) مزدوروں کے خاندان کے لیے حکومت مفت طبی امداد مہیا کرے گی اور ان کے لیے ستھرے گھروں کا انتظام کرے گی۔

۲۶۔ غیر مستقیم محصولات مثلاً ریل کا کرایہ، ڈاک کا محصول، نمک کا محصول وغیرہ مستقل طور پر محدود کر دیئے جائیں گے۔ ضروریات زندگی اور اعلیٰ تعلیم سستا رکھنا حکومت کا اہم فرض ہوگا۔

۲۷۔ برطانوی قرضہ ہند سے اپنی اقتصادی آزادی حاصل کرنے کے لیے "ٹیکس آزادی" ہر ایک متنفس کو لانا ہوگا۔

۲۸۔ اگر کسی سروراجیہ جمہوریہ میں ایک اہم اقلیت آباد ہے جو اپنی علیحدہ قومیت قائم رکھنا ضروری سمجھتی ہے تو "مہابھارت سروراجیہ مرکزی کمیٹی" اس اقلیت کو اپنی علیحدہ جمہوریت کے بنانے کا اختیار دے سکتی ہے۔

اس صورت میں اس جمہوریت کو اس قوم کی اصل آبادی سے زیادہ اس قدر علاقہ ضرور دیا جائے گا جس سے وہ اپنی اقتصادی اور تمدنی ضرورتوں کی حفاظت کر سکے۔ اس قسم کی اقلیت کی مثال پنجاب میں سکھ قوم ہے جس کے لیے "کانگریس کمیٹی کابل" نے امرتسر کی جمہوریہ علیحدہ کر دی ہے۔

۲۹۔ ہر ایک سروراجیہ جمہوریہ اپنی اکثریت والی آبادی کے مذہب کو اپنا اسٹیٹ مذہب بنا سکتی ہے۔ اگر اس مذہب کے رہنما اپنے مذہب کا ایسا مجموعہ احکام پیش کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو "مہابھارت سروراجیہ کمیٹی" کے فیصلہ میں "سروراجیہ جمہوریہ کے سیاسی و اقتصادی اصول اساسیہ کے خلاف ارتجاعی مواد" سے پاک ہو۔ اس صورت میں لازمی طور پر اس جمہوریت کا پریزیڈنٹ اس مذہب کے پیروکاروں سے منتخب ہوگا۔

(الف) جس صورت میں اکثریت والی آبادی کا مذہب سرکاری مذہب بن گیا، اس صورت میں اگر کسی اقلیت کا مذہب بھی "مہابھارت سروراجیہ مرکزی کمیٹی" کے فیصلہ میں اس شرط کو پورا کرتا ہے تو اسے بھی اپنے پیروؤں کی تناسب آبادی کے لحاظ سے مذہبی معاملات میں سرکاری امداد حاصل کرنے کا حق ہوگا۔

(ب) ایسے مذاہب کو جو پارٹی پروگرام کا سروراجیہ جمہوریہ کی سیاسی و اقتصادی اصول اساسیہ میں ساتھ نہیں دے سکتے فقط اسی صورت میں مذہبی تعلیم کی آزادی دی جائے گی جب کہ اس کے پیروکار مہابھارت سروراجیہ مرکزی کمیٹی کو اطمینان دلا دیں کہ وہ سیاسی معاملات میں حصہ نہیں لیں گے۔

(ج) بلا استثناء تمام مذاہب کے مقدس مقامات قانوناً متبرک سمجھے جائیں گے۔ ان محدود رتبوں کے لیے مہابھارت سروراجیہ مرکزی کمیٹی خاص قانون بنائے گی۔ اس طرح اگر کسی قوم کی مرکزی تعلیم گاہ دوسری قوم کے احاطے میں واقع ہے تو

وہ بھی خاص قانون کے ذریعہ محترم قرار دی جائے گی۔

- ۳۰۔ ایک سروراجیہ جمہوریہ اگر کسی مذہب کو سرکاری مذہب بناتی ہے یا اگر کسی مذہب کو تسلیم کر لیتی ہے تو وہ۔
- (الف) ان مذاہب کی تعلیم گاہوں اور مذہبی مقدس مقامات کو ان کی تعداد نفوس کے تناسب سے سرکاری امداد دیگی۔
- (ب) ان مذاہب کے تہواروں پر سرکاری تعطیل منائی جائے گی۔
- (ج) اگر ان میں سے کسی مذہب کے پیروکار اپنی مرضی سے کسی خاص ضرورت کے لیے اپنے اوپر کوئی خاص ٹیکس عاید کریں تو حکومت اس ٹیکس کے جمع کرنے میں مرد دے گی۔
- (د) اشاعت مذہب کے لیے کسی مذہب کو سرکاری امداد نہ دی جائے گی۔

۳۱۔ ہندوستانی مذاہب کے باہمی تنازعات فیصلہ کرنے کے لیے م، س مرکزی کمیٹی "ہر ایک سروراجیہ جمہوریہ میں عدالتی قانون کے موافق ایک "ثالثی پنچایت" بنائے گی۔

- (الف) اگر ایک خاندان میں سے ایک عورت باپ یا خاوند یا بیٹی کی رفاقت کے بغیر اپنا مذہب تبدیل کرتی ہے تو اس عورت کا اس پنچایت کے سامنے امتحان ہوگا اور وہ اس پنچایت کی اجازت کے سوا اپنے خاندان سے جدا نہ ہو سکے گی۔
- (ب) اگر اس پنچایت کے سامنے کسی مذہب کے پیروکاروں پر مذہب کے نام سے عورتوں کے اغوا کا الزام کئی بار ثابت ہو چکا ہو تو اس مذہب کی سرکاری امداد (اگر اس کو امداد ملتی ہے) بند کر دی جائے گی۔ جب تک اس مذہب کے پیروکار مرکزی کمیٹی کو مطمئن نہ کر دیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ
(اقبال)

جمنا، نربدا، سندھ سا گرپاڑی

کا

اساسی پروگرام

اِنَّ وَّلِيَّ اللّٰهِ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَهُوَ یَتَوَلّٰی الصّٰلِحِیْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله رب العالمین وصلى الله على سيدنا محمد سيد المرسلين و
خاتم النبيين وعلى آله واصحابه واتباعه من ائمة الدين وعباد الله الصالحين و
بارك وسلم - اما بعد -

آج ہم نے خدا کا نام لے کر اور اسی کی مدد پر اعتماد کر کے شمال مغربی ہند کی نئی سیاسی جماعت ”جنا، نربا، سندھ ساگر پارٹی“ کے پہلے حصہ کا کام سندھ میں شروع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

پارٹی کے چند اساسی قواعد ہم نے ضبط کر لیے ہیں تاکہ خواص کو دعوت دینے میں آسانی ہو۔ ان میں سے اکثر وہی باتیں ہیں جو سیاسی مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک علوم متعارفہ کا حکم رکھتی ہیں۔ اس لیے ان کی مزید تشریح کی اس مقدمہ میں ضرورت نہیں۔ البتہ پارٹی کے میدان عمل کو محدود کرنے کا مسئلہ قابل ایضاح ہے۔

جس مقصد کو گذشتہ تیس برس کی تاریخ پیش نظر ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ ہندستان کا سیاسی تقدیم اتنا مشکل نہیں جیسا کہ اس سے پہلے سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ امر بھی ساتھ ہی منکشف ہو جاتا ہے کہ یہ کھیل جب کبھی بن کر بگڑتا ہے تو اسکی تہ میں ہندو مسلم اختلاف ہی باعث نقصان نظر آتا ہے۔

اس اختلاف کو حل کرنے کے لیے متفرق طور پر سیاسی نظریات بنائے گئے مگر عللاً مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ”کا منظر سامنے نظر آتا ہے۔

ہم نے عملی اشتراک کے ساتھ فکری اتحاد کا ضمیمہ بھی لگا دیا ہے۔ اس طرحت ایک نیا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے ایک ایسا قلعہ انتخاب کیا ہے جو دونوں تہذیبوں کا مرکز ہے۔

جس طرح گز کا جتنا کا دوا بہ ہندو تہذیب کا منبع ہے۔ اسی طرح سندھ ساگر مسلم تہذیب کا معدن ہے۔ اگر ہم ان دو عظیم اشان قطعات کا اپنے نظریہ پر سمجھوتہ کر اسکے۔ ان کی تالیف قلوب پر قادر ہو سکے تو اس لاینحل مشکل کی کلید مل جائے گی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اسکندریہ میں حکمار کا ایک طائفہ نیو فلاطونی پیدا ہوا تھا۔ اسی منہاج پر مسلمانوں میں کئی حکیم پیدا ہوئے جن میں سے الشیخ الاکبر محی الدین ابن عربی اور شیخ الاشراق شیخ شہاب الدین السہروردی مشہور عالم ہیں۔ ہندستان میں سلطان محمود غزنوی کے زمانہ سے صوفیہ کرام کی آمد شروع ہوئی۔ سلطان شہاب الدین غوری کے بعد اس خاک سے تصوف کے چاروں طریقوں میں کثرت سے معرفت الہی میں کامل تمام انسانیت پیدا ہوئے۔ وہ سب اسی حکمت اشراقی کے امام تھے مگر ایسا عالم جو اپنے انکشافات اور نظریات کی تدوین و تنظیم پر قادر ہو، امام ولی اللہ دہلوی جیسا پیدا نہیں ہوا۔

ان تمام ائمہ تصوف کا مرکز فکر وحدت الوجود ہے جو ویدانت فلاسفی کا اصل اصول ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اسی کی تہذیب و تکمیل سے انسانیت کی تشریح کی اور اُسے کتاب و سنت کا بطن بنایا۔ جیسا کہ ان کی مکتبہ الارار کتاب

حجۃ اللہ البالغہ اور ان کی فلسفی تصانیف البدور البازغہ اور التفہیمات الالہیہ وغیرہ سے واضح ہوتا ہے۔

ہمارے خیال میں اگر دونوں مذاہب کے خدام انسانیت اسی فلاسفی کو امام بنا کر تقدم کی جدوجہد میں مصروف ہو جائیں تو ہند ایک دفعہ پھر مجمع البحرین بن کر دنیا کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

ہمارے پُرانے رفقا رہیں سے اگر کوئی بزرگ ہمارا نیا انداز دیکھ کر چین چین ہوں تو انکی خدمت میں مختصر عرض ہے

سہ کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

فقط ہمارا اصلی مخاطب ہندوستانی نوجوان ہے سہ

نصیحت گوش کن جانان کرازاں دوست تر دارند جو انان سعادت مند پدید آید وانا را

جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی کا پروگرام :

(۱) دارالرشاد، السواد الاعظم، قاسم المعارف کے پُرانے کارکن اور اُن کے نقاب جو وطنی خدمت کو اپنا نہ ہی

فرض سمجھتے ہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کے اندر ایک مستقل پارٹی تشکیل کرتے ہیں۔ جسے شمالی مغربی

ہند کے محدود رقبہ جات سے تعلق ہوگا۔

(الف) پارٹی کا نام جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی ہوگا۔

(ب) اس پارٹی کا میدان عمل چار حصوں میں منقسم ہوگا۔

(۱) آج کا صوبہ سندھ جس کا مرکز کراچی ہے۔

(۲) دریائے سندھ اور اس کے معاونین کی زمین جس کا مرکز لاہور ہے۔

(۳) دو آبہ گنگا جمنا اور اس کا زیر اثر اجمیری بنارس علاقہ جس کا مرکز دہلی ہے۔

(۴) ہند کا ایسا حصہ جو اپنے فیصلہ سے پارٹی میں شامل ہو۔

(۲) اس پارٹی کے نظری اساسی اصول یہ ہیں :

(الف) عدم تشدد کی پابندی سے کامل آزادی حاصل کرنا۔

اس تاہی حقیقت کو یاد رکھنا چاہیے کہ مسیحیت نے عدم تشدد کی پابندی سے تین سو برس میں استقلال

حاصل کیا تھا۔

(ب) کاشت کار اور درخت کا محنت کش کی معاشی حالت درست کرنا اور اسے ترقی دیکر یورپ کے محنت کش کے برابر بنانا۔

جب تک ملک کی عام آبادی کی معاشی حالت ترقی نہ کرے سیاسی ترقی ناممکن ہے۔

(ج) ہند کو ایک ملک نہیں بلکہ یورپ کی طرح مجموعہ ممالک ماننا۔ زبان اور معاشرت کو ملکی تقسیم کی اساس بنانا۔
 (د) ہر ایک ہندوستانی ایک یعنی جس میں ایک زبان بولی جاتی ہے اور اس کی معاشرت میں تقریباً یکسانی ہے اس میں مستقل رہائش رکھنے والے ہر مرد اور عورت کا مساوی حق ماننا اور جمہوری نظام پر قومیت کو ترقی دینا۔ نسل، مذہب اور قدامت کو تفوق کا ذریعہ نہ بنانا۔

(ایک ہندوستانی ملک کی عام آبادی کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دے کر وٹ کی قیمت سمجھانا۔
تشریح: جو ہندوستانی زبانیں عربی حروف میں لکھی جاتی ہیں ان کی تعلیم کو جوہ رسم الخط کے ذریعہ سے نہایت دشوار ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ یا تو حروف علیحدہ علیحدہ لکھنے کا رواج دیا جائے یا رومن حروف میں لکھنا شروع کریں۔
 دوسری صورت میں ٹائپ رائٹر سے آسانی استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہم چونکہ جبری قوت استعمال نہیں کر سکتے۔ اس لیے سمجھا بچھا کر بالترتیب کامیابی حاصل کریں گے۔

(و) ترقی یافتہ یورپ کی صنائع کو اپنے ملک میں پیدا کرنے کے لیے اور وطن کی خدمت اور حفاظت میں مرد و عورت کو جواں مردی سکھلانے کے لیے یورپین معاشرت اختیار کرنا۔

تشریح: یورپین قوموں کی سیاسی برادری میں شامل ہونے بغیر نہ تو ایشیا کی سیاسی ترقی آسان ہے نہ ہندوستان کی۔ اس لیے معاشرتی انقلاب خوشی سے برداشت کر لینا چاہیے۔ ورنہ اجتماعی قوتیں ملک کو خاک سیاہ بنا دیں گی۔

(ز) فکر اور اخلاق اور سیاست میں یکسانی پیدا کرنے کے لیے امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت اور فلسفہ کو پارٹی کی عقلی اساس ماننا۔ اور اس راستہ سے انسانیت کی خدمت کے لیے تیار کرنا۔

تشریح: دوسری ہزار ہجری کی ابتداء سے یعنی جلال الدین اکبر کے زمانہ سے مسلمان ہند کے مفکرین کا ایک طبقہ ابن عربی کے فلسفہ یا ویدانت فلاسفی کی اصلاح اور تکمیل میں اس لیے مصروف رہا کہ اسے ہندوستانی زندگی کے لیے سیاسی اساس بنائے۔ امام ولی اللہ دہلوی کا فلسفہ ان تمام مساعی کا پتھر ہے اس سے تمام ادیان میں تطبیق دی جاسکتی ہے۔ اور انسانیت کی ارتقاء تاریخ کی تشریح ہو سکتی ہے۔

(ح) ہندوستان کی وحدت کو فیڈریشن میں منحصر سمجھنا۔

ہندوستان کو ایک ملک سمجھنا اسی قدر غلط ہے جیسے کوئی روس کو نکال کر باقی یورپ کو ایک ملک کہا کرے۔

(ط) فیڈریشن کی تکمیل کے لیے ایک کافی لمبی مدت تک برٹش کامن ویلتھ میں رہنے کا فیصلہ کرنا۔

(ی) فیڈریشن کی زبان ترقی یافتہ ہندوستانی (اردو) اور انگریزی کو ماننا۔

تشریح : اردو کو رومن حروف میں لکھ کر یورپین قوموں میں رواج دینا اور مقطع حروف میں لکھ کر ایشیائی قوموں میں پہنچانا اس مقصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔

(۳) پارٹی کے عملی سیاسی اصول یہ ہیں :

(الف) پارٹی اپنے نظریات کو پھیلانے کے لیے خاص تعلیم گاہوں میں خدام خلق تیار کرے گی۔ فہم و ادب لوگ پارٹی کے ممبر بن سکیں گے جو انسانیت کی خدمت کو اپنا فرض قرار دیں گے اور عدم تشدد کی پابندی سے اس فرض کی تکمیل میں ہر قسم کی مشقت برداشت کرنے کا عہد کریں گے کہ وہ تکلیف دینے والوں پر کسی صورت میں ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔

(ب) پارٹی کے جس قدر ممبر حکومت میں شریک ہوں گے، وہ اپنی کرسی پر ملک کے ہر فرد کے ساتھ یکساں معاملہ کریں گے۔ اور رشوت لینا بند کرائیں گے۔

(ج) پارٹی کے تجارت پیشہ ممبر ماپ اور تول میں کمی بیشی نہیں کریں گے۔ حساب لکھنے میں خیانت نہیں کریں گے۔ ربا بند کرائیں گے۔

(د) پارٹی کے زمیندار ممبر کاشتکار سے جو معاہدہ کریں گے۔ اس کے پابند رہیں گے۔ کاشتکار کے خاندان کی بڑھتی ہوئی ضروریات زندگی ہم پہنچانے میں پوری مدد دیں گے۔

(ه) پارٹی کے کاشتکار ممبر حکومت کا مقررہ خراج اور زمیندار کا حصہ معاہدہ کی پابندی سے پورا کریں گے۔

(و) پارٹی کے کاشتکار ممبر جس سے معاملہ کریں گے، امانت کو اپنا شعار بنائیں گے۔

(ز) پارٹی کے جس قدر ممبر علمی یا اخلاقی خدمت کرنے کے لیے مخصوص ہیں وہ اپنے ملک سے جہالت دور کرنے میں انتہائی جدوجہد کریں گے۔ وہ ادنیٰ ضروریات زندگی پر اکتفا کریں گے۔

(ح) پارٹی کے ہر علمی ممبر کا فرض ہوگا کہ ہر مرد و عورت کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔

۱۔ اپنی ملکی زبان میں

۲۔ اپنی بین الاقوامی زبان میں

۳۔ ہر پابند مذہب کو اس کی ملکی زبان میں۔

(ط) پارٹی کے ہر اس ممبر کا جو اخلاقی استاد یا مرشد مانا جاتا ہے، فرض ہوگا کہ وہ اپنے ملکی بھائیوں کو حقوق کا احترام

سکھلائیں۔ یہاں تک کہ ان کے ملک کا ہر شخص کسی انسان کے جان و مال، عزت کو نقصان پہنچانا

اخلاقاً حرام سمجھے۔

(ی) پارٹی کا ہر ممبر اپنی ضروریات زندگی خود کما کر حاصل کرے گا۔ اس کا فرض ہوگا کہ ملک سے بے کاری کی زندگی کو ختم کر دے۔ ہر امیر و غریب کو کسی نہ کسی طریقے سے محنت کش بنایا جائے۔ وَالْخِرَدُ عَلٰی نَا انْ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

دارالرشاد سندھ ساگر

۱۰ دسمبر ۱۹۷۹ ہندی

••

کتابیات

- ابوسلمان شاہ جہاں پوری۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد۔ مکتبہ شاہد علی گڑھ کالونی۔ کراچی
- ابوسلمان شاہ جہاں پوری: تحریک نظم جماعت۔ نذیر اینڈ سنز پبلشرز، لاہور۔ ۱۹۷۸ء
- ابوسلمان شاہ جہاں پوری۔ غازی عبدالرحمن پشوری:۔ کراچی ۱۹۷۹ء
- ڈاکٹر اقبال حسن خان۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ
- مولانا عبید اللہ سندھی کا انقلابی منصوبہ۔ خدابخش اور نیشنل لائبریری۔ پٹنہ
- مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے چند معاصر۔ عبید اللہ سندھی اکاڈمی۔ کراچی۔ ۲۰۰۰ء
- مکاتیب مولانا عبید اللہ سندھی۔ عبید اللہ سندھی اکاڈمی۔ پاکستان۔ ۱۹۹۷ء
- اشتقاق اظہر فخر العلماء:۔ منیران ادب، گلہاء کالونی۔ کراچی۔ ۱۹۹۷ء
- اشتقاق حسین قریشی:۔ برصغیر ہند و پاک کی ملت اسلامیہ۔ کراچی یونیورسٹی۔
- اغلب موہانی۔ نریک افغانستان۔ ۱۹۰۴ء
- اقبال حسن خاں:۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن حیات و علمی کارنامے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
- اکبر شاہ خاں:۔ آزادی کی کہانی۔ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و سیاست، اسلام آباد
- انوار الحسن شیرکوٹی:۔ خطبات شبیر احمد عثمانی
- بختیار حسین صدیقی:۔ برصغیر پاک و ہند کے قدیم عربی مدارس۔ اداءہ ثقافت

اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۶ء

ڈاکٹر تارا چند۔ تاریخ تحریک آزادی ہند۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ نئی دہلی

تقی عثمانی۔ اکابر دیوبند:۔ زم زم بکڈپو۔ دیوبند

جی ایم سید:۔ میری کہانی میری زبانی۔ فرنٹیر پوسٹ پبلیکیشنز، لاہور۔ ۱۹۹۳ء

حمید الدین فراہی، حیات و خدمات۔

خلیق الزماں:۔ شاہراہ پاکستان۔

رشید احمد جالندھری:۔ برطانوی ہند میں مسلمانوں کا نظامی تعلیم۔ دیوبند۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن

اسلام آباد۔ ۱۹۸۹ء

رشید الوحیدی۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی۔ حیات و کارنامے۔ الجمعۃ بکڈپو۔ دہلی

سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ شخصیات۔ مکتبہ ذکری راپور ۱۹۷۹ء

سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مسئلہ قومیت۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی۔ دہلی ۱۹۷۷ء

سید ابوالحسن علی ندوی:۔ دو ہفتہ ترکی میں

ایضاً :- پرانے چراغ

سید حسین احمد مدنی:۔ نقش حیات۔ حصہ اول۔ الجمعۃ بکڈپو۔ دہلی

سید حسین احمد مدنی:۔ حصہ دوم۔ ایضاً

سید عابد علی الحسینی وجدی:۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی۔ مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی۔ بھوپال۔ ۱۹۸۷ء

سید محبوب رضوی:۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ ادارہ اہتمام دیوبند، جلد اول ۱۹۷۹ء

ایضاً ایضاً جلد دوم ۱۹۸۰ء

سید محمد حسین اغلب موہانی:۔ نیرنگ افغانستان۔ ۱۹۰۴ء

سید محمد میاں:- تحریک شیخ الہند۔ الجمعۃ پریس۔ دہلی

ایضاً:- علماء حق

سید مناظر احسن گیلانی۔ سوانح قاسمی جلد دوم۔ دفتر دارالعلوم دیوبند۔

شاہ محمد اسماعیل شہید۔ تقویۃ الایمان۔ سلطان برادر۔ صدر بازار۔ دہلی

شاہ محمد عثمانی:- ٹوٹے ہوئے تارے۔ عثمانی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔ ۱۹۸۵ء

شاہ ولی اللہ۔ حجۃ اللہ البالغہ جلد اول۔ ترجمہ عبدالحق حقانی۔ نور محمد تاجر کتب کراچی

شمس الرحمن محسنی:- مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ ۱۹۸۶ء

شوکت عثمانی:- میری روس یا ترا۔ نرائن دت سہگل تاجر کتب۔ لاہور۔

شیخ محمد اکرام:- موج کوثر۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۷۹ء

ضیاء الدین برنی:- عظمت رفتہ۔ تعلیمی مرکز، کراچی۔ ۱۹۸۱ء

ضیاء الحسن فاروقی:- شہید جستجو۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔

ظفر حسن ایبک:- آپ بیتی، ہر دو حصہ یکجا۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور

عبد اللہ لغاری:- مولانا سندھی کی سرگزشت کابل۔ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و سیاست

اسلام آباد۔ ۱۹۸۰ء

عبد الرحمن:- معماران پاکستان

عبد الغفار مدھونی۔ جامعہ کی کہانی۔ مکتبہ جامعہ دہلی

عبید اللہ سندھی:- تعلیمات قرآنی۔ مرتبہ عبد الرحمن۔ ناشرین لاہور۔ ۱۹۵۹ء

ایضاً:- الہام الرحمن فی تفسیر القرآن۔ جامع موسیٰ جار اللہ۔ بیت الحکمت۔ ملتان

ایضاً:- ذاتی ڈائری۔ مرتبہ عبد القدوس قاسمی۔ مکی دارالکتب۔ اردو بازار۔ لاہور

ایضاً :- کابل میں ۷ سال - مرتبہ محمد سرور - سندھ ساگر اکاڈمی - لاہور

ایضاً :- امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف - سندھ ساگر اکاڈمی لاہور - ۱۹۴۴ء

ایضاً :- شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک - مرتبہ محمد شرور - سندھ ساگر اکاڈمی - لاہور -

ایضاً :- شعور آگہی - مرتبہ سید مطلوب علی زیدی - ملّی دارالکتب، لاہور - ۱۹۹۴ء

ایضاً :- اردو شرح حجۃ اللہ البالغہ - مرتبہ شیخ بشیر احمد لدھیانوی - مکتبہ بیت الحکمت، لاہور

ایضاً :- جنگ انقلاب - مرتبہ بشیر احمد لدھیانوی - بیت الحکمت - لاہور

ایضاً :- قرآنی اصول انقلاب - مرتبہ بشیر احمد لدھیانوی - المحمود اکاڈمی - لاہور

ایضاً :- قرآنی اساس انقلاب - مرتبہ نامعلوم - المحمود اکاڈمی، لاہور

ایضاً :- محمودیہ عربی اردو ترجمہ عبیدہ - بیت الحکمت، لاہور

ایضاً :- تفسیر المقام محمود - جامع عبد اللہ لغاری - مکتبہ رشیدیہ، لاہور

ایضاً :- عنوان انقلاب - بشیر احمد لدھیانوی - مکتبہ بیت الحکمت، لاہور

ایضاً :- افتتاحی خطبہ - جمنا، نرمد اسندھ ساگر پارٹی - کراچی

عزیز الرحمن جامعی :- مسلم مجاہدین آزادی - حصہ سوئم

عزیز الرحمن - تذکرہ مشائخ دیوبند - ادارہ مدنی - دارالتصانیف دیوبند - ۱۹۶۷ء

عزیز الرحمن بجنوری - تذکرہ شیخ الہند - الجمیۃ پریس - دہلی

فیروز احمد :- احسان اللہ عباسی، حیات و کارنامے

قاضی عبدالغفار :- حیات اجل - انجمن ترقی اردو - علی گڑھ

ایضاً :- آثار جمال الدین افغانی - انجمن ترقی اردو -

قاضی جاوید :- سرسید سے اقبال تک - بک ٹریڈرس - لاہور - ۱۹۷۹ء

- قمر الدین سہو۔ الہی الامین وقرآن المبین
- قاضی زاہد الحسنی:۔ بھوپال تحریک آزادی کے آئینہ میں
- مالک رام:۔ تذکرہ ماہ و سال۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی
- محمد اسلم:۔ مولانا سندھی کے سیاسی مکتوبات۔ ندوۃ المصنفین۔ لاہور
- محمد اسحق بھٹی:۔ نقوش عظمت رفتہ۔ مکتبہ قدوسیہ۔ لاہور۔ ۱۹۹۹ء
- محمد ایوب قادری:۔ مولانا حسن نانوتوی۔ روہیلکھنڈ لیٹریٹری سوسائٹی۔ کراچی۔ ۱۹۶۶ء
- ایضاً:۔ کاروان رفتہ۔ مکتبہ اسلوب، ناظم آباد۔ کراچی۔ ۱۹۸۳ء
- محمد امین کھوسو:۔ ایک آدمی سونے جیسا۔ مولانا عبید اللہ سندھی اکیڈمی۔ کراچی۔ ۱۹۶۶ء
- محمد سرور:۔ عبید اللہ سندھی۔ حیات تعلیمات اور سیاسی افکار۔ سندھ ساگر اکاڈمی۔ لاہور۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء
- ایضاً:۔ خطرات مولانا عبید اللہ سندھی۔ سندھ ساگر اکاڈمی۔ لاہور۔ پہلا ایڈیشن
- ایضاً:۔ تعلیمات مولانا عبید اللہ سندھی۔ سندھ ساگر اکاڈمی۔ لاہور۔ ۱۹۵۵ء
- محمد سعود عالم قاسمی:۔ انوار سیرت النبی اور مسلم یونیورسٹی۔ یونیورسل بکڈ پو علی گڑھ۔ ۱۹۹۸ء
- محمد یحییٰ انجم:۔ دارالعلوم کابانی کون۔ دارالسنیہ۔ ۱۶۔ ڈمنکر روڈ، ناگپارا۔ ممبئی۔ ۱۹۹۹ء
- محمود احمد برکاتی:۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ ۱۹۹۲ء
- مسعود عالم ندوی:۔ مولانا سندھی کے افکار و خیالات پر ایک نظر۔ مکتبہ دانش پٹنہ۔
- ایضاً:۔ مکاتیب مولانا سلیمان ندوی۔ مکتبہ چراغ راہ۔ لاہور۔ ۱۹۵۴ء
- مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ تاریخ
- میم کمال او کے:۔ تحریک خلافت۔ قائد اعظم اکاڈمی، کراچی
- وی، بی، کارنگ۔ ایم این رائے۔ نیشنل بک ٹرسٹ۔ ۱۹۹۱ء

رسائل

ماہنامہ الرحیم:- ستمبر ۱۹۶۳ء، جنوری ۱۹۶۴ء، اگست ۱۹۶۴ء، ستمبر ۱۹۶۴ء، مارچ ۱۹۶۵ء،
جولائی ۱۹۶۵ء، اگست ۱۹۶۷ء

ماہنامہ المعارف:- مارچ ۱۹۸۴ء۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور

ماہنامہ الولی:- عید اللہ سندھی نمبر۔ اگست، ستمبر ۱۹۹۴ء

ہفتہ روزہ الوحید۔ جنوری ۱۹۳۰ء

ماہنامہ برہان۔ اپریل ۱۹۴۵ء۔ نومبر ۱۹۴۲ء۔ ندوۃ المصنفین دہلی

سہ ماہی تاریخ و سیاست:- اپریل ۱۹۵۱ء، جولائی ۱۹۵۱ء، فروری ۱۹۵۱ء، فروری ۱۹۵۳ء،
فروری ۱۹۵۴ء۔ انجمن ترقی اردو، پاکستان

ماہنامہ تہذیب:- فروری ۱۹۸۲ء۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن۔ پاکستان

رسالہ جامعہ:- جوہلی نمبر ۱۹۴۵ء، جنوری ۱۹۶۹ء۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ماہنامہ دارالعلوم۔ جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ۔ دارالعلوم دیوبند

روزنامہ جسارت کراچی:- اگست ۱۹۸۱ء، اگست ۱۹۸۲ء، جون ۱۹۸۴ء

ہفت روزہ خدام دین:- امام انقلاب نمبر۔ مجلس خدام دین۔ لاہور

سہ ماہی فکر و تحقیق۔ جولائی تا ستمبر ۱۹۸۹ء۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ دہلی

فکر و نظر اسلام آباد

ماہنامہ طلوع اسلام۔ دسمبر ۱۹۴۱ء۔ گلی ڈوری والان۔ دہلی

ماہنامہ معارف:- مئی ۱۹۳۱ء۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ

رسالہ نقوش۔ آپ بیتی نمبر۔ ادارہ فروغ اردو، لاہور

انگریزی

A.G.Allana-our Freedom fighters-Qaid-e-Azam academy . Karachi.

Balbara dolly Matcalf - Deoband.

M.A.Persits-Revolutionariesof IndiainRussia- Progress Publishers.
Moscow 1980.

Jawahar lal Nehru.-My autobiography- Oxford.

J.Pedorson- Shorter encyclopedia of India

Dr.Moin-ul-Haque- History of freedom movement- Pakistan Historical
Society- karachi.

Mohammad.Hajjan.Shaikh- Maulana-Ubaid-Ullah-Sindhi,a revolutionary
Scholar-national Institute of Historical and cultural research-Islamabad.

Zia-ul-Hasan-Farooqui- Deoband school and Demand of Pakistan- Asia
publisher House 1963.